یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مُرتّب
جمیل مہدی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اوّل۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اوّل۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سرایہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اوّل۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اوّل"

۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اوّل (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمن عثمانی

شمارہ ۱	جمادی الاول ۱۴۰۸ھ مطابق جنوری ۱۹۸۸ء	جلد ۱۰۱

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے خواجہ پریس جھتہ شیخ منگلو میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

ایک ایسے ہجوم کا تصور کیجئے جس میں شامل ہر فرد کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہو اور ان میں سے ایک بھی دوسرے کی سننے پر تیار نہ ہو تو آپ کو مسلم قوم کی مضحکہ خیز حیثیت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، اس کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی حالت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ قوم ہندوستان میں تاریخ کی سب سے بڑی آزمائش کا شکار ہے، بلکہ اگر اور گہرائی سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ جو کچھ اس پر پڑ رہا ہے، اس نے معمولات زندگی سمجھ کر اس کو قبول کر لیا ہے اور اس کے رہنماؤں کو بھی بالآخر یہ خیال ہو گیا ہے کہ موجودہ صورت حال سے باہر نکلنے کی تو کوئی امید نہیں اس لئے فضول محنت اور جد و جہد میں کون جان ہلکان کرے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ سید شہاب الدین دہلی کے مسلمانوں کو مظاہرہ کا حکم جاری کرتے ہیں لیکن خود اس مظاہرہ میں شریک نہیں ہوتے، اور جب اس مظاہرہ کی نیت ادا کرنے والے مسلمان، ان کی عدم شرکت کی شکایت کرتے ہیں تو ان کا کھرا جواب ہوتا ہے کہ میں نے مظاہرہ کی اپیل ضرور کی تھی، شرکت کا وعدہ ہرگز نہیں کیا تھا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ جب بھی فساد ہوتا ہے، تو مسلم جماعتیں اور مسلم اخبارات ایک زبان ہوکر جوڈیشل انکوائری کا مطالبہ کرتے ہیں، لیکن جب اس مطالبہ پر کمیشن مقرر ہو جاتا ہے تو اس سارے قصے کو ہی ذہن سے نکال کر بے فکر بیٹھ جاتے ہیں، نہ کوئی پیروی کا خرخشہ نہ ثبوت کی فکر، نہ گواہوں کی فراہمی، نہ دستاویزوں کی تلاش، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فساد زدہ مسلمان جہاں اور معاملات میں پریشانیوں اور تباہ کاریوں سے دوچار ہوتے ہیں، وہاں ناکافی پیروکاری اور رہنماؤں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے وہ فسادات کے مجرم بھی کمیشن کے تحت بن جاتے ہیں، مسلم جماعتوں کو ان فیصلوں کی زہر آگینی اور نقصان کی طرف دھیان تک دینے کی فرصت اس لئے نہیں مل پاتی کہ وہ اس عرصے میں کسی دوسرے فساد کی جوڈیشل انکوائری کے مطالبہ اور مسلمانوں کی دردمندی میں طرح طرح کے بیان دینے میں مشغول ہو جاتے ہیں، ابھی آپ نے دیکھا کہ مراد آباد میں جہاں عین عید کے دن، عیدگاہ کے اندر سیکڑوں مسلمان مظلومی اور بے بسی کی حالت میں شہید ہو گئے تھے، انکوائری کمیشن نے ان ہی کو فسادات شروع کرنے کا مجرم قرار دیا تو کسی مسلم جماعت نے اس پر احتجاج کرنے، اس کے خلاف آواز اٹھانے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی، اور اس کے فوراً بعد علی گڈھ فساد کے تمام مجرم عدالت سے بری کر دیئے گئے تو صاف طور کہا گیا کہ ناکافی پیروی، اور مسلمانوں کی عدم دلچسپی، اس مقدمہ کے خراب کرنے کا سبب بنی، لیکن کسی مسلم جماعت نے نہ تو اس پر شرم محسوس کی، نہ ہی اس کمی کو دور کرنے کے لئے کوئی تجویز منظور کی، نہ ہی کسی مسلم جماعت نے کسی ایسے شعبہ کو کھولنے کا اعلان کیا جو آئندہ اس طرح کے معاملات کو سنبھالنے اور ان کی باقاعدہ نگرانی کا فرض سنبھالے۔

---

۲۹ دسمبر کو ماہنامہ برہان کے مفکر ملت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ نمبر کی رسم اجراء گہری سنجیدگی، صدمہ اور وقار سے بھرپور فضا کے درمیان منائی گئی۔

پہلے ایوان غالب اور پھر دفتر برہان میں اس سلسلے میں دو فنکشن منعقد ہوئے جن میں حضرت مفتی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ملک کے مشاہیر نے شرکت فرمائی۔ جناب حکیم عبدالحمید سے لے کر خواجہ حسن ثانی نظامی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے لے کر جناب حکیم محمد زماں حسینی، سابق مرکزی وزیر جناب محمد یونس سلیم صاحب، مولانا عبدالکریم پاریکھ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر جناب شفیع اگوانی، مشہور کمیونسٹ لیڈر جناب مقیم الدین فاروقی، میئر دلی جناب میر مشتاق احمد صاحب، جناب عبدالوہاب خلجی تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ علم، صحافت، تصوف، سیاست، دین، مذہب کی چمکیلی کہکشاں مفتی صاحبؒ کی یادوں کے آسمان پر کھل گئی۔ برہان کے سرپرست جناب حکیم محمد زماں حسینی صاحب کا مفتی صاحبؒ پر تاثرات کا حامل مقالہ اس یادگاری اجتماع کی جان تھا۔ راقم السطور اس پر رونق محفل اور باوقار اجتماع میں اگرچہ جسمانی طور پر شرکت نہ کرسکا لیکن اس کا دل اسی اجتماع میں پڑا ہوا تھا۔ اس اجتماع میں پانچ سو اسّی (۵۸۰) صفحات کے ضخیم مفکر ملت حضرت مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ نمبر کا افتتاح جناب حکیم عبدالحمید صاحب کے مبارک ہاتھوں انجام پایا اور عالی جناب مسٹر محمد یونس سلیم صاحب نے اجتماع کی کارروائی کو خوش اسلوبی سے چلاکر اجتماع کو کامیاب بنانے میں جتنی محنت کی، حضرت مفتی صاحبؒ کے ساتھ اپنے گہرے تعلقات کا جیسا ثبوت دیا ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس ہنگامے کی بدولت اور ہماری مسلسل علالت کی وجہ سے برہان کی اشاعت میں بے ترتیبی پیدا ہوگئی ہے ہم کوشش کریں گے جلد سے جلد اس پر قابو پالیا جائے۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور ان کی زندگی کے چند گوشے

از مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب

یہ مضمون جشن "مفکر ملت نمبر" کے افتتاح کے موقع پر پڑھا گیا تھا۔ اب اس ماہ کے شمارے میں مولانا حکیم محمد زماں حسینی صاحب کلکتہ کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ — ادارہ

قبل از مسیح کی قدیم آبادی قصبہ دیوبند ضلع سہارنپور، قدیم الایام سرچشمۂ روحانیت، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے خلیفہ مولانا احمد دیبینی کا مولد و مسکن — حضرت مجدد کا ممر و رہ گذر، حضرت سید احمد شہیدؒ کی دعاؤں کا مظہر خیر و برکت۔ حضرت مفتی صاحب کی جائے پیدائش و سکونت تھی۔

خاندان و نسب کا رشتہ، خلیفۂ ثالث، حضرت عثمان ذو النورین کے صلب پاک سے جا ملتا ہے، دادا، بانیانِ دار العلوم کے ارکان اربعہ کے ایک خاص رکن، حضرت مولانا فضل الرحمٰن

عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ——— باپ، حضرت قطب عالم مفتی عزیز الرحمن عثمانی، مفتی اعظم ہند ——— چچا، علامۂ روزگار، اردو، عربی، فارسی کے ادیب نامدار، حضرت مولانا حبیب الرحمن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند، جن کی جلالت علمی پر ان کی عظیم کتاب اشاعت اسلام (اردو) اور قصیدہ لامیہ (عربی) شواہد کا درجہ رکھتی ہیں ——— اور، دوسرے چچا، شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ محدث و مصنف "فتح الملہم" شارح مسلم شریف اور مفسر قرآن و مصنف فوائد تفسیریہ عثمانی، ——— تیسرے چچا، حضرت مولانا مطلوب الرحمن عثمانی، مرشد طریقت و سلوک، صوفی صافی، جن کی صفت امتیازی تھی کہ ان کے دست گرفتہ مریدوں کو "حبِ رسول" میں ایسی سرمستی حاصل ہو جاتی تھی کہ رؤیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت منامی میسر ہونے لگتی تھی، ——— اور، چچا بابر فضل، اور بابو سعید یہ دونوں دیندار و متشرع گریجویٹ تھے، اور مناصب عالیہ پر فائز ——— چھوٹے بھائی الحاج "الحافظ المقری"، المجود، جلیل الرحمن، استاذ القراء دارالعلوم دیوبند زاہد شب بیدار و زندہ دار بزرگ ہیں۔

چچا زاد بھائیوں اور بھتیجوں کا بھی وسیع حلقہ علوم قدیم اور جدید سے آراستہ ہند و پاک میں پھیلا ہوا ہے۔

این خانہ ہمہ آفتاب است

ازہر ہند، دارالعلوم دیوبند آپ کی مادر علمی ہے۔ جملہ علوم شرعیہ، قرآن و حدیث، فقہ و تفسیر، علم کتابت و خطابت، حفظ قرآن اور تجوید و قرأت کے لئے، یہی معدن و مخزن ہے اسی سے سند فراغ حاصل کی۔

سبحان اللہ! اساتذہ کرام میں سرِ فہرست، حجۃ اللہ فی الارض حضرت علامہ انور شاہ کشمیری علیہ الرحمہ کا جلوہ دکھائی پڑتا ہے، پھر امام المتکلمین حضرت علامہ محمد ابراہیمؒ بلیاوی، شیخ الادب والفقہ حضرت علامہ اعزاز علی امروہوی، امام الصوفیاء، محدث عصر حضرت علامہ

سید اصغر حسین دیوبندی اور دیگر اکابر دارالعلوم کی سرپرستیاں نظر آتی ہیں۔ رحمہم اللہ رحمۃً واسعۃ
رفقاء درس اور خواجہ تاشوں اور ہم عصروں میں، فخر الاماثل حضرت مولانا قاری محمد طیب
صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مہتمم دار العلوم دیوبند ـــــ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب
سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الحرم النبوی محدث عصر حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی،
صاحب "ترجمان السنۃ"۔ اور ـــــ مفتی اعظم پاکستان، سابق مفتی دار العلوم دیوبند
حضرت علامہ مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔ شارح ترمذی حضرت علامہ محدث دوراں
مولانا محمد یوسف بنوری، مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی و
مولانا قاضی سجاد حسین وغیرہم باہم شیر و شکر نظر آرہے ہیں۔

تلامذہ کی فہرست طویل ہے، ـــــ میں نے ایک مرتبہ حضرت مفتی صاحب
رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلے میں دریافت کیا تو مسکرائے اور ہنس کر فرمایا کہ حکیم صاحب!
... اس بارے میں کیا سناؤں، میرا طریقہ یہ ہوگیا ہے کہ جس نے اپنا رشتہ تلمذ
جوڑ کر... خوشی و مسرت کا اظہار کیا تو میں نے بھی سن لیا، ورنہ اس دور وفا ناشناس
میں کہاں کی استادی اور شاگردی؟ ـــــ مگر میں اپنے علم و مشاہدہ کی بنا پر
تین احسان شناس شاگردوں کا تذکرہ کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں، جنھوں نے
نہایت سعادت مندی اور شکر گذاری کے ساتھ اپنے رشتہ تلمذ کا بار بار ذکر کیا اور
علماء کے بھرے مجمع میں کیا۔ واقعہ یوں ہے کہ ـــــ تقسیم ہند کے بعد جب مدرسہ عالیہ
کلکتہ کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم اس کے پہلے پرنسپل قرار
پائے اور اساتذۂ کرام اور دیگر اسٹاف مدرسہ کی تقرریوں کے بعد تعلیمی سلسلہ شروع ہوگیا
تو اسی زمانہ میں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم کا سفر کلکتہ پیش آیا جو ہر سال،
ندوۃ المصنفین کے سلسلہ میں پیش آتا ہی تھا، اسی موقع پر حضرت مولانا اکبر آبادی مرحوم
نے حضرت مفتی صاحب مرحوم کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا انتظام مدرسہ عالیہ

میں کیا، جس میں مدرسہ کے علماء کرام اور اساتذہ اور دیگر کارکنان مدرسہ موجود تھے، راقم الحروف بھی گورننگ باڈی کے ایک ممبر کی حیثیت سے اس میں شریک تھا۔ اس مبارک موقع پر مولانا اکبرآبادی مرحوم نے حضرت مفتی صاحب کی عظمت وجلالِ شان کا ذکر کرتے ہوئے اس کا انکشاف کیا کہ میں نے "بیضاوی شریف" جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حضرت مفتی صاحب سے سبقاً سبقاً بقدر درس پڑھی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری پوری طالب علمی انہی کے زیر تربیت ونگرانی دارالعلوم دیوبند میں گذری ہے۔ اس موقع پر مُدرس حدیث، حضرت مولانا سید حمیدالدین صاحب مرحوم نے بھی فرمایا کہ میں نے "کنزالدقائق" حضرت مفتی صاحب سے پڑھی اور میں ان کا ادنیٰ تلمیذ ہوں ـــــ ایک تیسرے طالب علم، مُدرس مدرسہ عالیہ مولانا عبدالشکور صاحب نے جو بنگال کے باشندہ ہیں یہ اعلان کیا کہ میں نے ڈابھیل میں حضرت مفتی صاحب سے "بیضاوی" پڑھی ہے۔

میرا خیال ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ تدریس میں جن طلبہ نے حضرت مفتی صاحب سے درس لیا ہے اور اسی طرح جامعہ ڈابھیل میں جن حضرات نے حضرت مرحوم سے سبق لیا ہے بلاشبہ ان میں بڑے بڑے علماء نامدار ہوئے ہوں گے جو ساؤتھ افریقہ اور ہندوپاک اور ملک کے دوسرے خطوں میں پھیلے ہوں گے، ان بزرگوں کی تعداد بھی خاصی ہوگی۔

مزاجی کیفیت کے اعتبار سے نہایت حلیم وبردبار تھے، مُدبّر وعاقبت اندیش تھے، خواہ مخواہ گلہ شکوہ کا مزاج نہیں تھا، طبیعت میں استقامت بہت تھی، جب کسی معاملے میں فیصلہ فرما لیتے تھے اِسے عملی شکل دینے اور رکاوٹوں کو دور کرنے کی تدبیریں نہایت ہی خوبی سے کر گذرتے تھے۔

لحاظ ومروّت اور اس کی نگہداشت میں بے مثال آدمی تھے، حضرت مرحوم جب، جب دیوبند تشریف لے جاتے تھے، خواہ کسی خانگی ضرورت یا خاندانی تقریب کا موقع ہو یا

دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کا وقت ہو، اپنے کل عزیزوں کے گھروں پر ضرور جانا، دریافت حال کرنا، چھوٹوں کو روپے دے کر سروں پر دست شفقت و محبت پھیر کر کوئی کلمہ محبت ارشاد فرمانا، بیواؤں، یتیموں کی خبر گیری اور بے معاش عزیزوں اور غیر عزیزوں کی فکر مندی کے ساتھ مدد کرنا حضرت مفتی صاحب کی خاص صفتِ امتیاز تھی۔ شہر دہلی میں بھی واردین، صادرین کی حسب حیثیت و ضرورت خیال رکھنا اور خوبی کے ساتھ اس مشکل کو سر کرنا انھیں کے ناخن تدبیر کا کمال تھا۔

اپنے اساتذہ کا بڑا خیال فرماتے اور نہایت اکرام سے ان کا ذکر فرماتے اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ استادزادوں تک کی خبر گیری میں دلچسپی لیتے تھے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں، حضرت شیخ الادب مولانا اعزاز علی رحمۃ اللہ علیہ کے تین صاحبزادے دار العلوم دیوبند میں مدرس تھے ان میں سے دو چھوٹوں کی بعض ملازمانہ ضرورتیں مجلس شوریٰ کی توجہ کی محتاج تھیں، بڑی دلسوزی سے مجھ سے فرمانے لگے کہ "حکیم صاحب! غریب و کمزور لوگ ہیں اور استادزادے ہیں، ان کا خیال کرنا چاہئے"۔ حقیقت میں حضرت مرحوم بہت غم خوار اور غم گسار آدمی تھے۔ گھریلو خدمت گزار بھنگن تک سے دریافت کرتے کہ "خیریت ہے؟ اچھی ہو؟" پھر وہ خوش ہو کر نیاز مندی سے جواب دیتی!۔ ایک صاحب جو اس گھریلو معاملہ کے برابر کے شاہد ہیں، ایک مرتبہ ہنس کر مجھے یہ روداد سنانے لگے۔ مگر اس واقعہ سے میں بہت متاثر ہوا ——— اس وقت حضرت مفتی صاحب مرحوم کی ایک بات میرے کانوں میں گونجنے لگی، "حکیم صاحب! اباجی مرحوم کی طرف سے مجھ پر نقشبندیت کا سایہ پڑا ہوا ہے"۔

حافظہ غضب کا تھا، احادیث و تفسیر کے علمی مباحث پر اچھی گہری نظر تھی۔ علم فقہ پر ایسا عبور تھا کہ حیرت ہوتی تھی، ایک مرتبہ میرے ہاں طلاق غضبان کے سلسلہ کا ایک پیچیدہ استفتاء آگیا، اس موقع پر فقہاء نے مدہش وغیرہ کی جو بحث کی ہے اس کی بنا پر

جواب استفتاء مرتب کرنے میں مجھے پریشانی لاحق ہوگئی، اس زمانہ میں حضرت مفتی صاحب
کلکتہ میں موجود تھے، میں نے ان کی طرف رجوع کیا تو حضرت مرحوم نے نہایت محتاط روش
کی راہنمائی کی بلکہ میرے اصرار پر جواب بھی چند سطروں میں تحریر فرما دیا۔ اردو، فارسی، عر
کے نہایت منتخب اور چیدہ اشعار ازبر تھے۔ حضرت مرحوم موقع بموقع نہایت دلچسپ انداز
میں جب پڑھتے اور چسپاں کرتے تو لطف آجاتا تھا اور مخاطب پھڑک جاتا تھا۔

اپنی فتویٰ نویسی کی دلچسپ داستان حضرت مرحوم نے ایک مرتبہ سنائی وہ بے سبق آ
اس لئے عرض کر رہا ہوں ——— فرمایا " دارالافتاء دیوبند سے جب میں وابستہ کیا گ
تو عہد شباب تھا، شوق میں کتب فقہ کا بڑا ذخیرہ اپنے ذاتی کتب خانہ میں جمع کر لیا اور
محنت کر کے کسی ایک مسئلہ پر ساری کتابیں پڑھتا پھر تھک جاتا۔ اس میں بڑا وقت لگ
والد صاحب یہ سب کچھ نہایت خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ بہت دنوں کے بعد ا
روز کہنے لگے کہ عتیق! تمہاری ساری محنت کا ثمرہ "شامی" میں موجود ہے، علامہ
نے سب سمیٹ لیا ہے اور ساری کتابوں کا عطر نکال لیا ہے۔

دیوبند کے فتویٰ نویسی کے زمانے کی یہ کہانی کہ جب کبھی بعض استفتاء کا جواب نہ
لکھ سکتا تو نہایت خاموشی سے والد صاحب کو مطلع کئے بغیر ان کے قالین کے نیچے دبا دیا
اور والد صاحب حسب عادت قالین کے نیچے سے جب اپنے فتوے نکالتے تو ہمار
فتووٴں کا بھی جواب لکھ کر ارسال فرما دیتے اور مجھے کچھ بھی نہ فرماتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ
حکیم صاحب! کیسے ان کے بزرگانہ طریقے تھے اور کس ڈھنگ سے تربیت دیا کر
تھے؟"۔

اسی سلسلے میں یہ واقعہ بھی سنانے لگے کہ شروع، شروع بچپنے میں تراویح، نفل میں
قرآن سنانے لگا تو بھولتا بہت تھا مگر والد صاحب کی عادت تھی کہ میرے ساتھ
قرآن کا ایک، ایک صفحہ پورا، کا پورا پڑھتے جاتے اور میں ان کی تابعداری کرتا جاتا

ھی ایسا نہیں ہوا کہ آزردہ ہو کر مجھے جھڑکا ہو۔

مفتی صاحب لوگوں کو جوڑنے کی برابر سعی کیا کرتے تھے اور دہلی کے اولیاء میں سے ی کا نام لے کر کہا کرتے کہ ان کا یہ کلام ہے کہ "بھائی مجھے سوئی ڈورا چاہیے تاکہ چاک و کروں میرا کام جوڑنے کا ہے، مجھے قینچی نہیں چاہیئے۔" میں نے کلکتہ میں کئی واقعات شاہدہ کئے ہیں، خود میرا ذاتی معاملہ یہ ہوا کہ ملا جان مرحوم خلافت والوں سے سیاسی ختلافات کی بنا پر طرفین میں ناخوشی سی بنی رہتی تھی مگر نہایت خوبصورتی سے اسے رفع کرادیا ——— آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا وجود حضرت مفتی صاحب مرحوم کی اسی قسم کی دوجہد کی زندہ مثال ہے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے حضرت مفتی صاحب مرحوم کو بڑا قلبی لگاؤ تھا، ن کا تذکرہ نہایت ہی شیریں انداز میں بیان کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا آزاد کی تفسیر "ترجمان القرآن" کا ذکر فرمانے لگے کہ، حکیم صاحب! آیات قرآنی کے معانی کی تعبیر جن لفظوں میں مولانا آزاد نے کی ہے، بس کمال کر دیا ہے! مخالفین میں گر کسی میں یہ صلاحیت ہے تو یہ کام کر دکھاوے حکیم صاحب خردہ گیری بہت آسان ور گھٹیا کام ہے، تعمیری کام کوئی کر کے تو دکھائے۔

ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ ہندستانی مدارس اور علماء میں شروح بخاری دیر میں پھیلی ہیں۔ "فتح الباری" اور "عینی" وغیرہ کے رواج کے پہلے فتح القدیر شرح ہدایہ آگئی تھی، درسی کتب حدیث کے اشکالاتِ علمی ایک زمانے تک اسی کی مدد سے حل کرنے کا رواج تھا، عینی کے مقابلے میں فتح الباری کو ترجیح دیتے تھے۔

زبان پر گالی کے کلمات میں نے کبھی نہیں سُنے۔ سب وشتم اور نامناسب کلمات کے استعمال سے ان کی زبان پاک تھی۔ نہایت ناگواری میں بھی سخت مخالف و دشمن کے لئے حضرت مرحوم اس علِ بد کے روادار نہیں تھے۔

حضرت مفتی صاحب کے قلم کے فتاویٰ دار العلوم دیوبند کے رجسٹر فتاویٰ میں محفوظ ہیں۔ فرمایا کرتے تھے "ان پر نشان لگے ہوئے ہیں وہ سب کے سب میرے قلم کے ہیں"، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بھی ان کے فتاویٰ کی نقلیں رجسٹر میں موجود ہیں۔ معرکہ آرا بعض فتوے میں نے "کفایت المفتی" میں بھی دیکھے ہیں، اس سے فتویٰ نویسی میں ان کی ادراکی کیفیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خطوط نویسی میں حضرت مفتی صاحب یگانہ اور منفرد تھے، جملوں کی بندش، طرز ادا کی ندرت، انداز بیان میں حلاوت و لینت اور اس طرح کی دوسری دل آویز خصوصیات حضرت مرحوم کے خطوط میں ہوتی تھیں۔

حضرت مرحوم حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ اور دیگر اولیاء ربِ حق کا بڑے والہانہ انداز میں تذکرے کیا کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی خواہ مذہبی ہو یا سیاسی، تدریسی ہو یا تصنیفی، اخلاقی ہو یا معاشی اور معاشرتی ہر ایک میں ان کے دردِ دل کا پرتو دکھائی پڑتا ہے۔ حضرت مفتی صاحب مرحوم نے "ندوۃ المصنفین" جیسے عظیم ادارے کی بنیاد اسی بنا پر رکھی اور ساری زندگی اس کے لئے جس طریقے سے وقف کر دی، یہ اسی درونِ قلب کی تڑپ کا نتیجہ ہے ــــ سچ ہے

وَمَا فَقْدُهٗ وَاللّٰہِ فَقْدٌ لِوَاحِدٍ
وَمَا بِیْ جَنَاحُ الْعِلْمِ مِنْہُ تَکَسَّرَا

مجھے خوشی ہے کہ حضرت مرحوم کی دارین میں کامیاب زندگی کی شہادت کے لئے رسولِ رحمت کا یہ فرمان شاہد عدل ہے "اذا مات الانسان انقطع عنہ عملہٗ الا من ثلثۃ الا من صدقۃ جاریۃ او ولد صالح یدعولہ او علم ینتفع بہٖ" ــــ بالخصوص اس حدیث کا آخری جملہ پوری طرح ندوۃ المصنفین کی کارگذاریوں اور اس کے افادات کو حاوی ہے ــــ اللھم ارحمہ رحمۃ واسعۃ۔

••

مفکرِ ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

جمیل مہدی

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ان معتنم روزگار شخصیتوں میں سے تھے جن کے بارے میں میرا خیال ہے کہ انھیں نہ دیکھتے تو دنیا کی دوسری مشہور اور تاریخی شخصیتوں کا وجود تخیلی افسانوی محسوس ہوا کرتا، وہ دیوبند کے ایسے علمی خاندان اور خانوادے کے فرد تھے جو مسلمانوں کی دینی اور علمی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے دادا مولانا فضل الرحمٰن ان لوگوں میں تھے، جنھوں نے حاجی عابد حسینؒ کی رہنمائی میں دیوبند کے عربی مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی جو آگے چل کر دارالعلوم دیوبند کے نام سے ہندوستان کا سب سے بڑا علمی اور دینی مرکز بن گیا اور جس نے آگے چل کر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا عبیداللہ سندھی، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ ابراہیم بلیاوی اور مولانا منصور انصاری جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں پیدا کیں۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے والد ماجد مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مشہور صاحب نسبت بزرگ ہونے کے علاوہ فتاویٰ اور مذہبی احکام پر اتنا عبور رکھتے تھے کہ ان کے لکھے ہوئے ہزاروں فتووں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب فتاویٰ عزیزیہ کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہو چکی ہے اور ابھی تک بھی بڑی تعداد غیر مطبوعہ فتووں کی موجود

ہے ۔ ان کے والد ماجد کے بھائی مولانا حبیب الرحمن عثمانی ایک صاحب تصنیف عالم تھے
ان کی ذکاوت ، دانش اور تدبر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ سلاطین جیسے دماغ اور
مشہور حکمار عالم جیسی عقل کے مالک تھے ، ان ہی کے حسن انتظام اور ناخن تدبیر نے
دیوبند کے مدرسہ عربی کو دارالعلوم کے عظیم الشان ادارے میں تبدیل کیا اور وہ اپنی زندگی
کے یوم آخر تک دارالعلوم دیوبند کے منتظم اور نگراں کار بنے رہے

مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ کے ایک چچا علامہ شبیر احمد عثمانیؒ جو تحریر و تقریر کے بادشاہ
کہے جاتے تھے ، وہ عالموں کے مجمع میں بے مثال عالم اور خطیبوں کے مجمع میں بے نظیر اور
سحر طراز خطیب نظر آتے ، مدتوں خلافت کمیٹی کے ممتاز رہنماؤں اور جمعیۃ العلمائے ہند
کے معزز اور قابل احترام لیڈروں میں ان شمار ہوتا رہا ، خلافت تحریک کے زمانے اور
اس کے بعد کے اہم ترین سیاسی دور میں کتنی ہی کانفرنسیں اور اہم اجتماعات ان کی صدارت
میں منعقد ہوئے ، آخر میں وہ تحریک پاکستان کے ہم نوا ہو گئے اور پاکستان کے پہلے اور شاید
آخری شیخ الاسلام کے بھی عظیم الشان درجہ کے عالم اور دینی پیشوا کی حیثیت سے ان کا
انتقال ہوا ۔

مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ علامہ انور شاہ کشمیری کے مایۂ ناز شاگردوں میں شمار
ہوتے تھے اور ان ذہین اور باصلاحیت طلبار کی صف کے ایک ممتاز رکن تھے جو
آگے چل کر علمی ، تصنیفی ، سیاسی اور دینی خدمات کے لحاظ سے ایک کہکشاں کی صورت
اختیار کر گئی ، اس صف میں مولانا محمد یوسف بنوری ، قاری محمد طیب قاسمی مہتمم دارالعلوم
دیوبند ، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ، مولانا احمد علی لاہوری ، مولانا حامد الانصاری
غازی ، میر واعظ مولانا یوسف شاہ کشمیری ، مولانا عبدالوحید غازی پوری ، مولانا
منظور نعمانی ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی ، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اور درجنوں
ایسے ممتاز لوگ شامل تھے جو آگے چل کر دین علم ، سیاست اور صحافت کے آسمان پر

چاند سورج بن کر چمکے اور جن کی روشنی سے ایک عالم نے فیض حاصل کیا۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی ذہانت، ذکاوت اور صلاحیت طالب علمی کے زمانے سے ہی نمایاں طور پر ظاہر ہونے لگی تھی اس لئے دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد انھیں دار العلوم میں ہی معین المدرسین کے عہدہ پر فائز کر دیا گیا، یہ عہدہ اس زمانے میں ایسے ذہین طالب علموں کی تدریسی تربیت کے لئے قائم کیا گیا تھا جو غیر معمولی قابلیت اور صلاحیت کے مالک ثابت ہوتے تھے لیکن اس عہدہ پر کام کرتے ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ دار العلوم دیوبند میں اختلافات کا وہ پہلا دور شروع ہوا جس کے نتیجہ میں صدر مدرس علامہ انور شاہ کشمیری کے ساتھ علامہ شبیر احمد عثمانی، علامہ ابراہیم بلیاوی اور مفتی عزیز الرحمٰن جیسے بے نظیر عالموں اور ماہرین تعلیم و مذہب کو دار العلوم چھوڑ کر باہر نکلنا پڑا۔ دار العلوم دیوبند سے سبکدوشی کے بعد علامہ انور شاہ کشمیری گجرات کے ایک قصبہ ڈابھیل میں منتقل ہو گئے جہاں ان کے لائق شاگردوں اور معتقدوں نے ایک مدرسہ کھول کر ان کے فیضان علمی کو جاری رکھنے کا انتظام کیا تھا، علامہ انور شاہ کشمیری کے ساتھ جہاں علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ جیسے بڑے اور مشہور عالم ڈابھیل گئے وہاں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ بھی اپنے شفیق استاد علامہ کشمیری کی گہری عقیدت اور محبت کی وجہ سے ڈابھیل منتقل ہو گئے اور دراصل یہیں سے ان کی علمی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی الوطنی باغیانہ خیالات اور قوم پرستانہ جذبات کا اظہار تو دیوبند کے ان اجتماعات اور جلسوں میں ہونے لگا تھا جو تحریک خلافت اور جمعیۃ العلمائے ہند کے زیر اہتمام آئے دن ہوتے رہتے تھے لیکن ان کے قوم پرستانہ اور سامراج دشمن نظریات میں نکھار ڈابھیل کے قیام کے زمانے میں گاندھی جی

سے ان کی ملاقات کے بعد آیا جن سے انھوں نے ڈابھیل سے کچھ میل دور ڈانڈی کو جانے والی سڑک پر جاکر اس وقت گفتگو کی جبکہ وہ مشہور عالم ڈانڈی مارچ کے قافلے کے ساتھ سڑک سے گذر رہے تھے۔ اس ملاقات کے دوران جب انھوں نے گاندھی جی سے یہ کہا کہ اسلام میں ہوا اور پانی کے ساتھ نمک بھی ایک ایسی چیز ہے جس پر روک یا ٹیکس لگانا مذہب کی رو سے ناجائز ہے تو گاندھی جی حیران رہ گئے اور انھوں نے فرمائش کی کہ اس حکم کی اصل عبارت کو اس کے حوالے کے ساتھ نقل کر کے انھیں دیدیا جائے۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اس ملاقات کے بعد ڈابھیل واپس آئے اور انھوں نے اس حکم کو نقل کر کے گاندھی جی کے پاس بھیج دیا۔ اور گاندھی جی نے نمک تحریک سے متعلق اپنی کئی تحریروں میں اس کا حوالہ بھی دیا۔

اسی دوران مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے والد ماجد مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ آب وہوا کی ناسازی کے سبب ڈابھیل چھوڑ کر دیوبند چلے گئے تو مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ ڈابھیل مدرسہ کے شعبۂ افتاء کے انچارج مقرر کئے گئے جہاں انھوں نے فتویٰ نویسی کی خدمات بڑی تن دہی، انہماک اور محنت کے ساتھ انجام دینی شروع کیں۔ اسی فتویٰ نویسی کی خدمات کے دوران انھوں نے ایسی جائیدادوں کو نیلام میں خریدنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کو حرام قرار دینے کا فتویٰ جاری کیا جو حریت پسندی اور جنگ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں ضبط کرلی گئی ہوں، اور جنھیں بعد میں نیلام پر اٹھایا گیا ہو۔ بات یہ تھی کہ اس زمانے میں ڈانڈی مارچ تحریک کے سلسلے میں حکومت نے کانگریس کو خلافت کا خون قرار دے کر تحریک میں شامل لوگوں کی جائیدادوں کو ضبط کرنے اور نیلام کر دینے کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا، اس لیے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کے اس فتوے کی بڑی دھوم مچی اور ہندوستان کی سبھی زبانوں میں اس کا ترجمہ لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کیا گیا۔ اس فتوے کی پاداش میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ سے باز پرس اور پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری

تھا کہ گاندھی اردن پیکٹ کا اعلان ہو گیا اور یوں وہ ایک لمبی مدت کے لئے جیل خانے جاتے جاتے رہ گئے۔

اس فتوے کے بعد ڈابھیل مدرسہ کی انتظامیہ نے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح کے فتوؤں پر کچھ پابندیاں لگانا چاہیں تو انھوں نے اپنے عہدے اور ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور کلکتہ چلے گئے۔ جہاں مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے قومی رہنماؤں کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات ہو گئے۔ ان کی کلکتہ کی سرگرمیوں میں درس قرآن بڑا مقبول ہوا جس میں شہر کے ہر طبقہ کے لوگ جوق درجوق شریک ہونے لگے۔ اس درس قرآن سے متاثر ہو کچھ متمول تاجروں کی مالی امداد سے مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح نے دہلی آکر ادارہ ندوۃ المصنفین کی بنیاد رکھی اور قرول باغ میں اس کا دفتر قائم کر کے اس زمانے کے مشہور علماء و مصنفین پر مشتمل سچ مچ ایک علمی اکادمی قائم کر دی جس کا ترجمان رسالہ برہان بھی جاری کیا گیا۔ دینی، تاریخی اور علمی موضوعات پر ایسی وقیع تصنیفات اور اہم کتابیں اس ادارے کی طرف سے شائع ہوئیں کہ اس کا شمار ملک کے بہت زیادہ باوقار ادارے میں کیا جانے لگا۔

۱۹۴۷ء کے ان فسادات میں جو تقسیم ملک کے وقت شروع ہوئے اور جنھوں نے دہلی سمیت پورے شمالی ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ندوۃ المصنفین کا قرول باغ کا دفتر بھی برباد ہو گیا اور اس کی کتابوں کا ذخیرہ بھی جو کئی لاکھ کی مالیت تک پہونچ چکا تھا، جل کر خاک ہو گیا لیکن مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے ہمت نہیں ہاری اور انھوں نے اس صورت میں اس ادارے کو دوبارہ اس کی راکھ سے پیدا کیا کہ ان کے دوستوں اور رفیقوں میں سے ایک آدمی کو بھی اس کی احیاء جدید کا یقین نہیں تھا۔

آزادی کے بعد مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح دہلی کی علمی، دینی، تعلیمی اور سیاسی زندگی کا مرکز بن گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کی دینی، تعلیمی اور تمدنی سرگرمیوں کی

رہنمائی کا فرض ایسی شان اور دل آویزی کے ساتھ انجام دیا کہ وہ ایک دوسرے کی مخالف جماعتوں اور متصادم لیڈروں کے درمیان ثالث بالخیر کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ دہلی کے علاوہ پورے ملک کے تقریباً ہر بڑے اور اہم مسلم ادارے کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے اور ہندوستان بھر میں ان درجنوں اداروں کی میٹنگوں میں شرکت کا وقت نہ جانے کہاں سے نکال لیتے تھے۔ ان کے علوئے اخلاق، صلح کن طبیعت، دردمندانہ مزاج، ہر اجنبی اور شناسا شخص کی تالیف قلب کے رویے نے ان کی شخصیت کو ایسی عظمت اور مقبولیت، محبوبیت اور ہر دلعزیزی کی بلندیوں تک پہونچا دیا تھا کہ بڑے بڑے قد آور لوگوں کے مجمع میں وہ سربلند نظر آتے، جو ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ان کے طرز فکر میں پرانے صوفیوں کی صلح جوئی، ان کے طرز عمل میں جلیل القدر عالموں کی شان اور ان کے ذہن دماغ میں پرانے دانش وروں اور مدبروں کی جو خصوصیت پائی جاتی تھی اس نے انھیں اپنے عہد کی بے نظیر شخصیت بنا دیا تھا۔ ان کی وفات بلاشبہ پورے ہندوستان کا ایک ایسا علمی اور تہذیبی نقصان ہے جس کی تلافی کی کوئی شکل ممکن نہیں۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

دعا کی درخواست

جناب جمیل مہدی صاحب ایڈیٹر رسالہ برہان کی شدید و سخت علالت سے میں بہت پریشان ہوں۔ غالباً ایسا قلم لکھنے والا شاید اب دنیا میں دوبارہ جنم نہ لے سکے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ خصوصی اوقات میں صحت کاملہ کے لئے دعا فرمائیں۔

عمید الرحمٰن عثمانی

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی مرحوم کی یاد میں

از محمد ثناء اللہ عمری ایم اے عثمانیہ

۱۹۵۸ء کا واقعہ ہے، راقم جامعہ دارالسلام عمرآباد کا طالب علم تھا، مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے کا شوق تھا، دو چار چیزیں اِدھر اُدھر چھپی بھی تھیں، کسی رسالہ میں علامہ جمال الدین افغانی مرحوم پر عربی میں ایک مضمون نظر پڑا، جو شام کے مشہور فاضل محمد علی کرد مرحوم کے قلم سے تھا، میں نے اردو میں اس کا ترجمہ کردیا اور "برہان" میں اس کی طباعت کی خاطر صاحب برہان مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ایم۔اے کے نام دہلی کے پتہ پر مراسلت شروع کردی، جواب مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کا لکھا ہوا جلد ہی وصول ہوگیا، یہ مولانا مرحوم کی ہستی سے میری غالباً پہلی شناسائی تھی، کچھ مدت تک یہ مراسلت جاری رہی اور میرے دل و دماغ پر مولانا کی شفقت کی چھاپ بیٹھ گئی ۔۔۔ اب مولانا کا پہلا مکتوب گرامی ملاحظہ کیجئے:

(۱)

۳۰ر دسمبر ۱۹۵۸ء

محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کرم نامہ مولانا سعید احمد کے نام پہنچا، مولانا موصوف کا قیام کلکتہ میں ہے اور پتہ یہ ہے:

"مولانا سعید احمد اکبر آبادی، پرنسپل کلکتہ مدرسہ، ۲۱ ڈیلزلی اسکوائر، کلکتہ ۱۶" مولانا وہیں سے "برہان" کے لئے "نظرات" تحریر فرماتے ہیں ـــــــ آپ کا مقالہ کتنے صفحوں پر مشتمل ہے؟ اس کا ترجمہ کسی دوسری جگہ تو نہیں شائع ہوا؟ مجھے یاد آتا ہے کہ کلکتہ کے کسی پرچہ میں "جمال الدین افغانی" پر دسمبر ہی میں کوئی مضمون نکلا ہے وہ یہی مضمون تو نہیں؟ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا "برہان" میں طبع شدہ مضمون شائع نہیں ہوتا، اگر آپ یہ مضمون "برہان" کے معیار وطریق کار کے مطابق خیال فرماتے ہیں تو بھیج دیجئے، امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ فقط والسلام۔

عتیق الرحمٰن عثمانی۔ ندوۃ المصنفین دہلی

جواب میں عرض کر دیا گیا کہ مضمون کہیں چھپا نہیں ہے، مضمون ملاحظہ کیجئے، بشرط پسند شائع کیجئے، مولانا مرحوم نے مضمون کی رسید ان الفاظ میں بھیجی:

(۲)

مکرمی، السلام علیکم

مضمون گرامی تھوڑی سی نظرِ ثانی کا طالب ہے، موقع ملے تو دیکھوں، علامہ جمال الدین پر مضامین چھوڑ مستقل کتابیں ہیں، جیسے "آثار جمال الدین افغانی" (قاضی عبد الغفار مرحوم) مضامین تو کتنے ہی نکلے ہیں، اب بھی ہند وپاک کے اخباروں میں آ رہے ہیں، بہرحال نظرِ ثانی کے بعد اشاعت کا فیصلہ کیا جائے گا، اغلب ہے کہ شائع ہوگا، امید کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ فقط

۵ فروری ۵۹ء

والسلام

عتیق الرحمٰن عثمانی

ندوۃ المصنفین، دہلی

مولانا نے ازراہ کرم علامہ افغانی سے متعلق میرا مذکورہ بالا مضمون "برہان" میں شائع فرمادیا، غالباً ۱۹۶۰ء کے ابتدائی پرچوں میں، اس سے میری بڑی ہمت افزائی ہوئی، میں نے لکھا کہ عربی سے ترجمہ کرنے کا شوق ہے، دفتر "برہان" میں ایسے کتابچے یا رسالے موجود ہوں جن کے مضامین کی اردو میں تلخیص مقصود ہو تو ناچیز اس خدمت کے لئے حاضر ہے۔ مولانا نے میرے اس خط کو بھی درخور التفات سمجھا اور جواب سے سرفراز فرمایا:

(۳)

مخلصم مولوی ثناء اللہ صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ بہت دن ہوئے ملا تھا، میں ان دنوں باہر تھا، واپس آیا تو دوسری مصروفیتوں میں لگ گیا اور آپ کا خط ڈاک کے انبار میں رہ گیا، تاخیر جواب کے لئے معذرت خواہ ہوں، آپ کا ذوق علم لائق داد ہے، یہ بڑا قیمتی جوہر ہے، ایک زمانے میں دفتر میں مصر کے بعض معیاری ماہنامے "الہلال"، "المقتطف" وغیرہ آیا کرتے تھے اور "برہان" میں ان کے بعض مضامین کی تلخیص شائع ہوا کرتی تھی، مگر اب عرصہ سے یہ سلسلہ بند ہے، کیونکہ روپیہ بھیجنے کی کوئی باقاعدہ صورت نہیں ہے، کوشش میں ہوں کہ یہ ٹوٹا ہوا رشتہ پھر جڑ جائے، ان دنوں صرف ایک پرچہ "صوت الشرق" آتا ہے جس میں غالباً "برہان" کے مطلب و معیار کی کوئی خاص چیز نہیں ہوتی، کوئی چھوٹی موٹی کتاب سامنے آگئی تو خیال رکھوں گا، آپ اپنی مشق جاری رکھیں، مشق کی حد تک وہاں (عمرآباد میں) کتب خانہ میں بہت سی کتابیں ہوں گی، زبان کو زیادہ سے زیادہ صاف، دل پذیر اور سہل بنانے کی کوشش کیجئے، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے، فقط والسلام۔

عتیق الرحمن عثمانی　۹ اپریل ۱۹۶۰ء
ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی

اس اثنار میں ڈاکٹر طہٰ حسین مرحوم کی ایک چھوٹی سی کتاب "قادۃ الفکر" نظر پڑی، فاضل مؤلف نے اس میں یہ بتایا تھا کہ فکر و نظر کی رہنمائی عہد بعہد مختلف گروہوں کے ہاتھ آتی رہی ہے۔ فلاسفہ، شعرار، علمار اور سیاست داں یکے بعد دیگرے اس منصب پر ہوتے رہے ہیں، اس ضمن میں مؤلف نے مختلف ملکوں کی تاریخ سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا تھا، مجھے یہ کتاب پسند آئی، استاذ محترم مولانا سید عبدالکبیر صاحب مدظلہ کی نگرانی میں "رہنمایانِ فکر" کے نام سے اس کا ترجمہ پورا کرلیا۔ پھر خیال ہوا کہ ماہنامہ "برہان" میں وہ قسط وار چھپ جائے تو اچھا رہے گا، مگر اندیشہ ہوا کہ مضمون بہت طویل ہے، برہان کے صفحات اس کے متحمل نہ ہوسکیں گے، پھر ڈھارس بندھی کہ طہٰ حسین مرحوم ہی کے طویل مضمون حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ پر مولانا عبدالحمید نعمانی کے قلم سے اردو میں منتقل ہوکر اسی برہان میں قسط وار شائع ہوچکے تھے۔ بہر حال برہان کی اسی نظیر کا حوالہ دے کر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب سے خط کے ذریعہ درخواست کی کہ میرے ترجمہ کے لئے بھی "برہان" میں گنجائش نکالیں، مولانا نے جواب مرحمت فرمایا جو درج ذیل ہے:

(۴)

برادرم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! جواب قدرے تاخیر سے لکھ رہا ہوں، آپ منتظر ہوں گے، یہ معلوم ہوکر کہ آپ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں، مسرت ہوئی، کام کئے جائیے، یہی وقت بننے کا ہے، "برہان" کے صفحات جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، محدود تر ہیں، یہی وجہ ہے کہ نعمانی صاحب کے مضامین کی طوالت پر بھی بعض اصحاب انگشت نما ہوئے تھے، چالیس پچاس صفحات ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں بھیج دیجئے، مضمون قسطوں میں حسب سہولت شائع کردیا جائے گا، "برہان" بہرحال اسی کام کے لئے ہے، دو ہی رسالے ہیں، "معارف" اور "برہان" جو اس طرح کے مقالات شائع کرسکتے ہیں، مقالہ

بھیجنے سے پہلے نظرثانی اور نظرثالث ضرور ہونی چاہیے، ترجمہ زیادہ سے زیادہ صاف، سلیس اور روشن ہونا چاہیے، اسلوب کا خیال رہے، بعض اسالیب عربی میں مستعمل ہیں، اردو میں نہیں، ترجمہ کی خوبی یہ ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جائے اسی زبان کا اسلوب اور قالب اختیار کیا جائے، امید ہے آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔ میں آپ کے مقاصد کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں، فقط والسلام۔

عتیق الرحمن عثمانی

ندوۃ المصنفین، دہلی

ترجمہ کی برہان میں اشاعت کی نوبت ہی نہیں آنے پائی تھی کہ میں نے اس کی کتابی شکل میں اشاعت کی بابت استفسار کیا، مولانا نے ازراہ ذرہ نوازی جواب سے نوازا:

(۵)

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، میرا مشورہ یہ ہے کہ پہلے آپ ترجمہ پر نظرثانی، ثالث، رابع کرلیں اور جب اس کی صحت، اسلوب اور شگفتگی پر قلب مطمئن ہوجائے تو مسودہ یہاں بھیج دیں، مضمون کا ایک حصہ "برہان" میں ضرور آنا چاہیے، کون سا حصہ آئے، یہ آپ ہی متعین کریں، اس کے بعد ان شاء اللہ کتاب ندوۃ المصنفین یا مکتبہ برہان سے شائع ہوجائے گی، یاد رکھئے کہ پہلی چیز بہتر سے بہتر لانے کی سعی کیجئے، عجلت کی ضرورت نہیں، پہلی چھاپ کا اثر ہی کچھ اور ہوتا ہے، اس بات کی پھر یاد دہانی کرتا ہوں کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جائے اس کا اسلوب پیش نظر رہے، نہ کہ اصل کا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ترجمہ کی حد تک ایک جملے کا ترجمہ درست ہی ہوتا ہے، اس کو غلط نہیں کہا جاسکتا، مگر جس زبان میں کیا گیا ہے اس میں وہ جملہ اس طرح

مستقل نہیں ہے، اس لئے مترجم کے لئے دونوں زبانوں پر، دونوں زبانوں کے محاوروں پر، دونوں زبانوں کے طرز ادا پر عبور ضروری ہے، نعمانی صاحب جدید عربی کے بہت اچھے جاننے والے ہیں، مگر ان کو اردو کے محاوروں اور جملوں کے نظم ونسق پر اتنا عبور نہیں، اسی لئے ان کا ترجمہ اول درجہ کا ترجمہ نہیں رہا۔

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے، فقط والسلام

عتیق الرحمن عثمانی

۳۱ر اگست ۱۹۶۰ء

اس کے بعد میں نے مولانا سے درخواست کی کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا پتہ دریافت کر کے لکھ بھیجیں تاکہ ترجمہ و طباعت کی اجازت حاصل کرلی جائے، مولانا نے حسب ذیل جواب تحریر فرمایا:

(۶)

برادرم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے گھر کا پتہ مجھے معلوم نہیں ہے اور غالباً اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، آپ خط اس پتے پر بھیج دیں، پہنچ جائے گا کچھ بعید نہیں یہ مصنف ہی کا مکتبہ ہو۔

دار المعارف، قاہرہ، مصر

مضمون پر خوب خوب نظر ڈالئے، ہر نظر میں طرز تعبیر جاندار ہو جائے گا، اور یہ چیز آپ کے مستقبل کے لئے مفید رہے گی، جواب میں تاخیر ہوگئی، فقط والسلام

عتیق الرحمن عثمانی، ندوۃ المصنفین دہلی

۱۲ر ستمبر ۱۹۶۰ء

مگر عرفت نفسی بفسخ العزائم والی بات پیش آگئی، انجمن ترقی اردو علی گڈھ کے
ذمہ داروں نے لکھا کہ کسی صاحب نے طٰہٰ حسین کی کتاب "قادۃ الفکر" کا ترجمہ کر دیا ہے اور
وہ انجمن کی طرف سے طباعت کے لئے منظور ہو چکا ہے ـــــ اب کیا ہو سکتا تھا؟
اس خبر سے طبیعت بجھ سی گئی، خیر، بات آئی گئی ہو گئی، ناچیز بھی جامعہ دار السلام
عمرآباد سے فارغ ہو کر دائرۃ المعارف، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد سے وابستہ ہو گیا تھا اور
اس کے شعبۂ تصحیح میں ملازم تھا، دائرۃ المعارف کے دار المطالعہ میں جو دراصل "اسلامک کلچر"
نامی انگریزی رسالہ کا ایک حصہ تھا ایک عربی رسالہ نظر پڑا، دمشق کے المجمع العلمی کا ترجمان،
اس میں شام کے مشہور فاضل شیخ محمد کرد علی مرحوم پر ایک سوانحی مضمون موجود تھا، میں نے
اس کا ترجمہ شروع کر دیا، اس سلسلے میں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نے میرے عریضہ
کے جواب میں ذیل کا مکتوب گرامی تحریر فرمایا:

(۷)

مخلصم و مکرم جناب مولوی ثناء اللہ صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
گرامی نامہ پہنچا تھا، میں ان دنوں کلکتہ گیا ہوا تھا، واپس ہوا تو رمضان المبارک
شروع ہو گئے، رمضان المبارک کے مشاغل جدا ہی ہوتے ہیں، چونکہ حافظ بھی
ہوں، اس لئے زیادہ وقت تلاوتِ کلام پاک میں صرف ہوتا ہے، بہرحال
تاخیر جواب کے لئے معذرت خواہ ہوں، یاد آتا ہے کہ شیخ محمد کرد علی پر میں نے
کوئی مضمون کسی رسالہ میں پڑھا ہے مگر اس وقت بات پوری طرح یاد نہیں
اگر یہ مضمون "المجمع العلمی" کے کسی تازہ نمبر میں آیا ہے تو یقیناً جدید ہوگا،
بھیج دیجئے، ـــــ کیا کہوں، یہ سال ادارے پر سخت گذرا ہے اور اب
بھی یہی صورت ہے، دشواری سے گاڑی کھنچی جا رہی ہے، ترجمے کے لئے
متعدد کتب سامنے ہیں، مگر وسائل کی کمی سے مجبوری ہے، ان شاء اللہ خیال

رکھوں گا، آپ اب کیا کررہے ہیں؟ ترجمہ کی مشق تو بڑھ ہی رہی ہوگی، پختگی بڑی چیز ہے، امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے، فقط

عتیق الرحمٰن عثمانی

۸ رمضان المبارک ۱۳۸۱ھ

مطابق ۱۲ فروری ۱۹۶۲ء

میں نے یہ مضمون ترجمہ کرکے بھیج دیا، ایک عریضہ میں حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن مرحوم کی علالت پر تشویش کا اظہار کیا جو ان دنوں امریکہ میں زیر علاج تھے، مفتی صاحب نے جواب سے شاد فرمایا، جو میرے نام ان کا آخری مکتوب ہے:

(۸)

برادرم مخلصم جناب مولوی محمد ثناء اللہ صاحب دام مجدہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، گرامی نامہ مع مضمون ملا، ان شاء اللہ بوقت فرصت نظر ڈالوں گا، آپ حیدر آباد کب آئے اور وہاں کیا کررہے ہیں؟ امید ہے کوئی بہتر مشغلہ ہوگا، مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کی علالت کی نوعیت نے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے کہ کسی کام میں جی نہیں لگتا، بیالیس ۴۲ سال کے مخلص ترین دوست ہیں اور ملت کا قیمتی سرمایہ ہیں، میڈیسن (امریکہ) میں خاص اہتمام سے علاج ہورہا ہے، خدا نے چاہا صحت کی توقع ہے، ابھی تک کسی خاص افاقے کی خبر نہیں ہے، مرض پیچیدہ اور خوفناک ہے، رفتہ ہی رفتہ آرام ہوگا، میں شکر ہے غنیمت ہوں، ان دنوں طبیعت ماندہ رہتی ہے، ادارے کی گاڑی بھی بہرحال چل رہی ہے، امید ہے آپ بخیر ہوں گے، فقط والسلام

عتیق الرحمٰن عثمانی

۵ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ ۱۰ مئی ۱۹۶۲ء

دفتر برہان، جامع مسجد، دہلی

خدا جانے کیا رکاوٹ پیش آگئی کہ "میرا کردعلی" والا مضمون شائع نہیں ہوا، مگر مولانا کے شفقت آمیز اور نصیحت آمیز خطوط نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ان خطوط میں بڑی ادبی خوبی موجود ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ در اصل ادبی اور علمی میدان کے آدمی تھے، مگر اپنی تمام صلاحیتیں انتظامی اور تنظیمی امور کے لئے وقف فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے سے جو کام چاہتا ہے لیتا ہے، جف القلم بما ھو کائن۔

اتنی طویل مراسلت کے باوجود مدتوں ملاقات سے محرومی رہی، سنہ ۱۹۵۹ء کے اواخر میں [حیدر]آباد سے ایک امتحان کے سلسلہ میں علی گڑھ جانا ہوا، دہلی بھی گیا، مفتی صاحب سے ملاقات کے لئے ندوۃ المصنفین میں حاضری دی، مگر دفتر کے ایک ملازم نے بتایا کہ مولانا آرام فرمارہے ہیں، مخل ہونا اچھا نہیں معلوم ہوا، واپس چلا آیا، پھر میرے قیام حیدرآباد کے زمانے میں مسلم مجلس مشاورت کے وفد کا لیڈی حیدری کلب میں بڑا شاندار جلسہ ہوا، ڈاکٹر سید محمود مرحوم، سندر لال وغیرہ تشریف لائے تھے، مگر مفتی صاحب نہیں آئے، اس طرح دیدار کی حسرت ہی رہ گئی۔

غالباً سنہ ۱۹۸۱ء کی بات ہے، ناچیز ادارۂ تحقیقات اسلامی، جامعہ دارالسلام [عمر]آباد سے وابستہ تھا کہ مولانا صاحب جامعہ کے سالانہ جلسہ کی صدارت کے لئے عمرآباد [تش]ریف لائے، مدتوں کی آرزو بر آئی، میانہ قد، قدرے خمیدہ، رنگت گندمی، سن سفید [دا]ڑھی، بڑے کم سخن، ٹوپی ایسی وضع کی اوڑھ رکھی تھی کہ بعض تصویروں میں مولانا [ابو]الکلام آزاد مرحوم اوڑھے ہوئے نظر آتے ہیں، میں کچھ دیر تک اسی خیال میں [گم] ہو گیا ؎

خیال قد بلند تو می کند دل من
تو دست کوتہ من بین و آستین دراز

مغرب کی نماز کا وقت ہو رہا تھا، مفتی صاحب مسجد میں تشریف رکھتے تھے،

اذان ہوئی، میں مفتی صاحب کی خوش الحانی کی بات کہیں پڑھ چکا تھا، درخواست کی کہ
نماز پڑھائیں، مگر عذر فرمایا کہ طبیعت سُست اور آواز پست ہے، آخر امامت اس
بے بضاعت کو کرنی پڑی۔

دوسرے دن جلسہ ہوا، مفتی صاحب کا تعارف مولوی حافظ حفیظ الرحمٰن
نے کرایا، پھر مہمان خصوصی نے صدارتی تقریر فرمائی، ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے، طالبانِ علم
نبوت کو بڑی اچھی اچھی نصیحتیں فرمائیں ـــــ اس دیرینہ نیاز مند نے حسب عادت
مصافحہ پر اکتفا کر لیا۔ پرانی مراسلت کا ذکر تک نہیں کیا ـــ اخیر عمر میں مجلس مشاورت
کے پلیٹ فارم سے قومی پریس کے تابڑ توڑ حملوں کے باوجود بڑی بے باک قیادت کا
ثبوت دیا۔

مردے از غیب بروں آید وکارے بکند

اللہ مرحوم کے درجات بلند کرے، آمین۔

مفکرِ ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر

رسمِ اجراء اور محفلِ علم و دانش

از محمد اظہر صدیقی ڈائریکٹر انڈو عرب پریس فیچرس انٹرنیشنل

رب العزت کا شکر ہے کہ طویل انتظار اور انتھک محنت کے بعد ماہنامہ برہان کا "مفکرِ ملت نمبر" جلوہ گر ہو گیا۔ یہ نمبر جلیل القدر علماء، صاحبِ طرز اہل قلم کے مقالات اور اربابِ اخلاص و محبت کے تاثرات اور حضرت مفکر ملت کی حیات، خدمات، اخلاق و کردار کے تذکروں پر مشتمل ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ نقشِ اول اور خشتِ اول کی ہی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ساڑھے پانچسو صفحات پر مشتمل یہ ضخیم نمبر بھی ان تمام گوشوں اور مضامین کو اپنے اندر نہ سمو سکا جو اس موقع پر ــــ حضرت مفتی صاحب کے انتقال کے بعد لکھے گئے ہیں اور ادارہ کو موصول ہوئے ہیں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اشاعت ان تمام لوگوں کی آرزوؤں کی تکمیل کی طرف ایک قدم ہے جن کے دلوں کی دھڑکنوں میں حضرت مفتی صاحب کے اخلاصِ بیکراں کے نقوش جلوہ گر ہیں، جو حضرت مفکر ملت کے ساٹھ سالہ دورِ خدمت اور عہد جہد و عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں اور جن کی یہ خواہش و آرزو بار بار سامنے آتی رہی ہے کہ حضرت مفتی صاحب کی عظیم و بلند مرتبہ شخصیت کے وہ سارے خدوخال وہ تمام علمی گوشے اور ان کے اخلاق و کردار کے وہ

روشن نقوش محفوظ کر دیے جائیں جن کی روشنی میں آنے والی نسلیں یہ دیکھ سکیں کہ ہمارے بزرگوں نے کس قدر سخت و ناگوار حالات اور سنگین و نازک صورت حال میں بھی ملت اسلامیۂ ہند کی مدبرانہ، دانشمندانہ اور بصیرت افروز انداز سے رہنمائی کی ہے۔

امید ہے کہ مفکر ملت نمبر کا مطالعہ کرنے والا یہ محسوس کیے بغیر نہ رہے گا کہ وہ ایک ایسی ہستی کے حالات اور کارناموں کا مطالعہ کر رہا ہے جس نے اپنے عمل و کردار سے ایک روشن تاریخ مرتب کی ہے، ــــ ایک تاریخ جس کے سینے میں صبر و تحمل، فہم و تدبر، تبحر علمی، اخلاق و شرافت، اخلاص و للّٰہیت فکر و شعور، تفقہ فی الدین اور شریعت و طریقت کے نہ جانے کتنے ستارے جگمگ کر رہے ہیں ــــ ایک تاریخ جو عمل کی توانائی اور فکر و ذہن کو روشنی دے سکتی ہے ــــ ہاں ــ! ایک تاریخ جو آج کے نفرت، تعصب، پھوٹ، خود غرضی، بے راہ روی اور عداوتوں سے لبریز ماحول کی تاریکیاں دور کرنے کا فرض انجام دے سکتی ہے اور دلوں سے فکر و شعور کے گوشوں اور ذہن کے پردوں سے اُن اندھیروں کو ہٹا سکتی ہے جن سے مایوسیوں اور حرماں نصیبیوں کی مہلک کیفیت پیدا ہوگئی ہے ــــ جس طرح مفکر ملتؒ سے ملاقات کرنے والا اپنے اندر ہمت و حوصلہ لے کر رخصت ہوتا تھا اسی طرح "مفکر ملت نمبر" کے مطالعہ سے بھی "یاس" کو "آس" میں بدلا جا سکتا ہے ــــ بشرطیکہ خود بھی میدان عمل میں قدم رکھنے کا ارادہ اور کچھ حوصلہ ہو اور ملت کی دردمندی کا تھوڑا بہت جذبہ دل میں موجود ہو ــــ!

قدرتی بات ہے کہ اس موقع پر وہ ساری خصوصیات ذہن کی سطح پر نمودار ہوں جن سے حضرت مفکر ملت کی ذاتِ گرامی عبارت تھی، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا ملت کے بکھرے ہوئے عناصر کو یکجا کرنا، آپس میں دست و گریباں ہونے والے لوگوں کو ایک اسٹیج پر لانا، ملی و ملکی مسائل میں مختلف ذہن و فکر کے حامل لوگوں کو مل جل کر مسائل کا حل تلاش کرنے پر آمادہ کرنا

کتنا مشکل اور صبر آزما کام ہے یہ سب پر عیاں ہے مگر سوال یہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے جس طرح ان تعمیری مقاصد کے لئے زندگی بھر پاپڑ بیلے، سخت محنت کی، ان کی سادگی و خلوص کا وہ انداز، استقامت اور عزم و حوصلہ کی پختگی کا وہ کوہ وقار، معاملہ فہمی اور دوسروں کے جذبات واحساسات کا پاس ولحاظ کرنے کا وہ طریقہ، ناگوار و تلخ حالات میں، ماحول کی شدت و گرمی میں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے سمجھنے، مسائل پر غور کرنے اور معتدل و متوازن فیصلے کرنے کا وہ اسلوب وہ طریق فکر و عمل، ہر فرد سے ہمدردی اور دل سوزی کا وہ جذبۂ بے کراں، وہ دردمندی وہ تڑپ کیا ہمیں یہ دعوت غور و فکر نہیں دے رہی ہے اور کیا یہ سب کا فرض اولین نہیں ہے کہ وہ حضرت مفتی صاحب کے اس مشن کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں جس کو انھوں نے زندگی بھر اپنائے رکھا اور آخری سانس تک اس کی سعی، کاوش اور جد و جہد کرتے رہے کہ ملت کے تمام گروہ اور جماعتیں مسلک و مشرب کے اختلافات اور جماعتی گروہ بندیوں سے بلند ہو کر اپنی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کریں اور اپنی صلاحیتوں اور خصوصیتوں کے ذریعہ نہ صرف اپنی ملت کے افراد کی اصلاح و خدمت اور رہنمائی کا فرض انجام دیں بلکہ ملکی سماج کو بھی اصلاح و رہنمائی سے سدھارنے کی ذمہ داری کو پورا کریں، کیا شبہ ہے کہ اس وقت ملک کے اندر صورت حال تو تشویشناک ہے ہی مگر خود ہماری صفوں میں، ہمارے دینی اداروں میں ہماری ملی تنظیموں اور افراد کے درمیان بھی حالات اس قدر تفرقہ انگیز و حسرت آمیز ہیں کہ یہ ؎

آتش کدوں کا جوشِ غضب ہے شباب پر
مقتل سجے ہوئے ہیں بہ اندازِ دلنشیں

کا ہولناک منظر آنکھوں کے سامنے ہے اور مستقبل کے لئے بھی کسی اطمینان بخش صورت کی کوئی ہلکی سی کرن دکھائی نہیں دے رہی ہے، ان اندوہناک اور فکر انگیز حالات میں یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ ملت کے کچھ دردمند بزرگ، کچھ باحوصلہ افراد آگے آئیں اور اپنے اسلاف و بزرگوں

کی سینکڑوں سالہ محنتوں کو برباد ہونے سے بچانے کی سعی و کاوش کریں۔

آہ ـــ! کیا غضب ہے ؟ کہ روحانیت کا وہ پُرعظمت قلعہ، ہزاروں اولیائے کرام کی محنت و کاوش اور خود امام طریقت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہٗ کی نیم شبی دعاؤں سے وجود میں آنے والا وہ ادارہ (دار العلوم دیوبند) جو کل تک ایشیا میں مسلمانوں کی دینی و ملی عظمت کا پُر وقار نشان اور علم و روحانیت کا ایک پُرعظمت مرکز کیا جاتا تھا اور جس کی آغوش تربیت سے ہزاروں علماء و صلحاء، محدثین و مفسرین اور واعظ و خطیب پیدا ہو کر نکلے اور دنیا کے گوشے گوشے میں دین و مذہب، رشد و ہدایت اور درس و تدریس کی مسندوں کو روشنی بخشنے کا سبب بنے، وہی ارجمند مقام دینی ادارہ آج آپس کی رسہ کشی، اختلاف اور مقدمہ بازیوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے، سچ پوچھئے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مفکر ملت اور ایسے ہی سراپا اخلاص بزرگوں کی رُوحیں تڑپ رہی ہیں، اگر کسی کو وہ کان نصیب ہوں جو روح کی آواز کو سن سکیں، وہ دردمند اور روشن دل میسر ہوں جو اس درد و سوز کرب و تڑپ کو محسوس کر سکیں تو صاف محسوس ہوگا کہ آج حالات کا تقاضہ اور بزرگوں کی روحوں کی پکار ہے کہ اختلافات کی اس بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور مزید تباہیوں اور بربادیوں سے پہلے ہی کچھ اصلاح و علاج کا سرو سامان کر لیا جائے ـــ کیا اس وقت ملت اسلامیہ ہند کی کشتی حیات منجدھار میں ہچکولے نہیں کھا رہی ہے ؟ اور یہ آواز فضاؤں میں، زمین و آسمان میں اور جو در و دیوار سے سنائی نہیں دے رہا ہے ؟ کہ ؎

اک کرب جانگداز ہے اور ناتواں سا دل
طوفاں ہے اور ایک شکستہ سی ناؤ ہے

اس موقع پر جب کہ ہمارے بزرگوں، دانشوروں، علماء اور رہنماؤں اور اکثر دینی اداروں کے سربراہوں نے حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ سے اپنی عقیدت و تعلق کا مظاہرہ

کیا ہے۔ ان کے طرزِ فکر و عمل کی ستائش کی ہے، ان کے مشن ــــ اتحاد و اتفاق، باہمی روابط
کا تذکرہ بھی تحریر و تقریر میں خوب خوب کیا گیا ہے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ادب و احترام کے
ساتھ اکابرِ ملت کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی جسارت کریں کہ وقت اور حالات کی نزاکتوں
اور دین و شریعت کے عظیم الشان مرکزوں کی زبوں حالی کی طرف خصوصی توجہ فرمائیں ــــ یہ
دینی ادارے صرف ہمارے تعلیمی ادارے ہی نہیں ہیں بلکہ یہ مسلمانانِ ہند کی ریڑھ کی ہڈی کی
حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی حیات، ان کی بقا، ان کی سربلندیوں، ان کے عقائد و اخلاق بلکہ
ان کے ایمان و یقین کی ساری کائنات ہی ان اداروں سے وابستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس
حقیقت کا ادراک و احساس ہمارے ملّی رہنماؤں، علمائے کرام اور اربابِ صحافت سے
زیادہ کس کو ہو سکتا ہے ــــ؟

کاش ہم سب ہی اپنی مصروفیتوں میں سے وقت نکال کر اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کی
کوشش کریں جو ہمارے دینی ایوانوں اور روحانی مرکزوں کو بھسم کئے دے رہی ہے، بلکہ
حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے شاندار ماضی، ہماری تاریخ اور علم و کردار کا وہ تاج محل ہی
زمین بوس ہوا جا رہا ہے جس کی بنیادوں میں ہزاروں علمائے حق، اولیائے کاملین اور
مخلصینِ ملت کا خونِ دل و جگر شامل ہے ــــ!

آسمانِ علم و دانش کی کہکشاں

اکثر اربابِ اخلاص اور عمید میاں کی دلی خواہش تھی کہ مفکرِ ملت نمبر کے اجراء کے
موقع پر ایک سیمینار بھی کر لیا جائے جس میں حضرت مفتی صاحب کی شخصیت پر اربابِ فکر و
دانش اور اہلِ قلم حضرات تحقیقی و تفصیلی مقالات پڑھیں اور اس طرح حضرت مفتی صاحب
پر ایک سنجیدہ علمی و تحقیقی کام کا آغاز ہو جائے جو ان کے شایانِ شان ہو، اور جس کے
ذریعہ حضرت مرحوم کی حیاتِ مبارک کے تمام گوشوں پر روشنی ڈالی جا سکے۔ اس مقصد

کے لئے عمید میاں نے کافی سعی وکاوش اور دوڑ بھاگ بھی کی مگر بخت و اتفاق کی دنیا ہی کچھ اور ہوتی ہے بالآخر کئی وجوہ کی بنا پر فیصلہ کیا گیا کہ فی الحال سمینار کو کسی اور مناسب وقت کے لئے اُٹھا رکھا جائے اور اس نمبر کے اجراء کے موقع پر اکابر ملت، دانشوروں، مفکروں، اسکالرس اور ارباب فضل وکمال کا اجتماع کر لیا جائے، چنانچہ کافی انتظار کے بعد ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو دہلی کے مشہور ومعروف پُرشکوہ ہال ـــ ایوان غالب ـــ میں ایک با وقار، سنجیدہ اور ایسا اجتماع منعقد ہوا جس میں دور ونزدیک سے بڑے بڑے علمائے کرام، دانشور، صحافی، ارباب سیاست، اہل ادب، دینی مدارس کے لائق احترام اساتذۂ کرام، دہلی کی مختلف ادبی انجمنوں، علمی اداروں کے سربراہ، سعودی عرب کے قائمقام سفیر محترم حافظ الموفق اور مصری سفارت خانہ کے اعلیٰ افسران اور راجدھانی کے ہر طبقہ کے معزز شہری شریک تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ علم ودانش، تاریخ وادب، دین وشریعت، صحافت وسماج، سیاست اور تعلیم وتدریس غرض ہر میدان اور ہر طبقہ کے ارباب فضل وکمال اور اصحاب فکر ودانش اتنی بڑی تعداد میں جمع ہو گئے تھے کہ برادر محترم ڈاکٹر محسن عثمانی کے بقول ـــ "آسمان علم ودانش کی کہکشاں ایوان غالب میں اُتر آئی ہے۔"

آغاز

دہلی کی تاریخی مسجد فتحپوری کے امام حضرت قاری مفتی محمد مکرم صاحب نے تلاوت کلام پاک سے اس اہم اجتماع کا آغاز فرمایا ـ کفیل الرحمن نشاط اور متین امروہوی نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا، ملک وملت کے جانے پہچانے مخلص اور سرگرم رہنما محترم جناب یونس سلیم صاحب نے ہم خدام کی درخواست پر نظامت کے فرائض انجام دئے اور ابتدائی تقریر میں اجتماع کی غرض وغایت بیان فرماتے ہوئے حضرت مفکر ملت کو نہایت پر اثر

دلکش اور جامع انداز میں خراج عقیدت پیش کیا اور ملک و ملت، علم و دین، شریعت و اخلاق اور مختلف گوشہ ہائے حیات میں ان کے کارناموں اور خدمات پر روشنی ڈالی۔

سچ ہے کہ اس اجتماع کو کئی ایک حیثیتوں اور وجوہ کی بنا پر ایک منفرد و بے مثال یادگار اجتماع کہا جاسکتا ہے، سب سے اول تو یہ کہ ہماری تاریخ عزم و عمل، اور عالم اسلام کی فکری قیادت کے ایک روشن ستون اور موجودہ دور میں ملتِ اسلامیۂ عالم کی کشتی فکر و عمل کے ناخدا مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم جیسی بزرگ و محترم شخصیت جو علم و فکر اور روحانیت کے روشن نقوش، اخلاق و شرافت اور وضعداری کے حسین و جمیل پیکر کی حیثیت سے نہ صرف برصغیر ہند و پاک میں ممتاز ہیں بلکہ عرب ممالک، ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ کے ملکوں میں بسنے والے لاکھوں کروڑوں انسانوں کے دل کی دھڑکنوں میں جن کے لئے بے حد ادب و احترام کے جذبات موجود ہیں، اپنی گوناگوں مصروفیات، علالت، کمزوری و ضعف کے باوجود اس اجتماع کی قیادت و صدارت کے لئے لکھنؤ سے تشریف لائے اور کئی گھنٹے (یعنی پروگرام کے اختتام پذیر ہونے تک تشریف فرما رہے۔ آپ نے اپنے صدارتی خطبہ میں حضرت مفکر ملت کو بھرپور، مؤثر، اور باوقار و وقیع الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت مفتی صاحب کے ملت پر بہت زبردست احسانات ہیں، ان کا تقاضہ ہے کہ ہم ان کی تعلیمات اور ان کے چھوڑے ہوئے نقوشِ اتحاد و اتفاق پر چلنے کی سعی و کاوش کریں کیونکہ اپنے اسلاف اور بزرگوں کو فراموش کردینا خود اپنی زندگی کو محرومیوں اور تاریکیوں میں مبتلا کردینا ہے۔ خاص طور پر حضرت مفتی صاحب کی چھوڑی ہوئی یادگاروں ندوۃ المصنفین، ادارہ برہان، مسلم مجلس مشاورت کو ہر طرح قائم و باقی رکھنے بلکہ ترقی دینے کی جدوجہد اور کوشش کرنا ہم سب کا اولین اور اہم ترین فریضہ ہے۔ آپ نے اس اجتماع کے انعقاد پر اظہار مسرت کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ حضرات نے مجھ ناچیز کو یہ اعزاز

بخشا اور محبت کا معاملہ کیا اس کے لئے میں شکر گذار ہوں اور آپ لوگوں کو آپ کی کوششوں کی کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں۔

جناب محترم یونس سلیم صاحب نے عزت مآب ڈاکٹر شنکر دیال شرما کا پیغام پڑھ کر سنایا جس میں نائب صدر جمہوریۂ ہند نے حضرت مفتی صاحب کو بھرپور خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی جنگ آزادی کے دوران مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کی خدمات ناقابل فراموش تھیں اور ان کا رول خاص طور پر مسلم عوام میں بہت اہم رہا ہے، انھوں نے محبت، رواداری، بھائی چارہ کا جو راستہ دکھایا ہے اس پر چلنا سب کے لئے ضروری ہے اور ہر محب وطن ہندوستانی کی طرف سے مفتی صاحب جیسے مادرِ وطن کے عظیم فرزند کو یہی بہترین خراج عقیدت ہوسکتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے مزید فرمایا کہ مسلم عوام پر مفتی صاحب کا بہت اثر تھا اور لاکھوں لوگ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ دلی کے میئر مسٹر مہندر سنگھ ساتھی نے بھی اپنے پیغام میں حضرت مفتی صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا۔

ہمارے سرپرست و مربی خاص حضرت محترم مولانا حکیم محمد زماں صاحب نے جو اس اجتماع میں شرکت کے لئے کلکتہ سے تشریف لائے تھے، ایک جامع، پرمغز پراثر مقالہ پڑھا جو ہر اعتبار سے منفرد، دلکش و جامع اور اہم مقالہ تھا اور حضرت مفتی صاحب کی زندگی، مہر و مروت، سادگی، عاجزی، تفقہ فی الدین، تبحر علمی پھر ان کے خاندانی حالات و خصوصیات سب پر محیط تھا۔ مقالہ کو تمام حاضرین نے بہت دلچسپی، احترام اور سنجیدگی سے سنا اور پسند کیا۔ (یہ مقالہ برہان کی اسی اشاعت میں دیا جارہا ہے)

عزت مآب ڈاکٹر حافظ الموفق قائمقام سعودی سفیر کی تشریف آوری

اس محفل علم و عرفان کے شہ نشین (ڈائس) کی رونق، تابانی، عظمت و رفعت میں ایک خوش اطوار، خوش مزاج، متبسم نوجوان کی دلکش و جاذب نظر اور پروقار

شخصیت سے بھی مزید اضافہ ہورہا تھا، حضرت صدر محترم کی بائیں جانب تشریف فرمایہ نوجوان تھے عالم اسلام کے روحانی، دینی اور جذبوں اور عقیدتوں و امنگوں کے امین و محور، حرمین شریفین ــــ مملکت سعودی عربیہ کے قائمقام سفیر محترم عزت مآب ڈاکٹر حافظ الموفق حفظ اللہ۔
سچی بات یہ ہے کہ حرمین شریفین سے متعلق اور اس مرکز اسلام سے نسبت رکھنے والے کسی شخص بلکہ کسی ذرہ پر بھی نظر پڑجاتی ہے تو دل و دماغ ذہن و وجدان، شعور اور روح کی گہرائیاں جو مسرت، بشاشت اور تازگی محسوس کرتی ہیں ان کا اظہار لفظ و بیان زبان قلم کے بس کی بات نہیں ہے، حق تعالیٰ شانہٗ مملکت سعودیۂ عربیہ، شاہ فہد بن عبدالعزیز اور ان کی حکومت کو تمام خطروں، یورشوں اور حملوں سے محفوظ و مامون رکھے اور ہر طرح ترقیات عطا فرمائے، اس موقع پر موصوف کی تشریف آوری ہمارے لئے دلی مسرت و شادمانی، افتخار و اعزاز کا باعث ہوئی اور حضرت مفکر ملت کے جذبات اور اخلاص بے کراں کا ایک طرح اعتراف بھی ہوا ہے، حضرت مرحوم ہمیشہ عربوں اور خاص طور پر سعودی عرب کے معاملات سے گہری والہانہ وابستگی اور تعلق و ہمدردی رکھتے تھے۔

اسی طرح سفیر کبیر متحدہ عرب جمہوریہ مصر جو اس محفل علم و دانش کے مہمان خصوصی تھے موصوف اچانک علالت کی وجہ سے خود تشریف نہ لاسکے تو اپنے قونصل جنرل کو اپنا قائمقام بنا کر بھیجا اور ایک موقر بیان بھی حضرت مفتی صاحب اور مفکر ملت نمبر کے سلسلے میں ان کے ہاتھ ارسال فرمایا اور اپنے ملک کی ایک اہم علمی اور ادبی شخصیت کو بھی اجتماع میں شرکت کے لئے بھیجا، ہزایکسی لینسی سفیر مصر کا یہ بیان، محترم ڈاکٹر محمد السعید صاحب نے پڑھا۔ جس میں حضرت مفکر ملت کی عظیم الشان خدمات کے ساتھ ساتھ مفکر ملت نمبر کے اجراء پر اظہار مسرت کیا گیا تھا۔

اس اجتماع میں حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے جانشین مولانا محمد سالم صاحب قاسمی مہتمم وقف دار العلوم دیوبند نے نہایت عالمانہ انداز میں

تقریر فرمائی اور حضرت مفتی صاحب کو قرآن وحدیث کے بتائے ہوئے معیار کے مطابق ایک "مردِ مومن" قرار دیا اور ان سے اپنے قدیم خاندانی تعلقات کا تذکرہ فرمایا۔ آپ کی تقریر کو حاضرین مجلس نے بہت پسند کیا۔ اسی طرح مجلس مشاورت کے صدر محترم ممبر پارلیمنٹ سید شہاب الدین نے اس انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا کہ محسوس ہو رہا تھا کہ ایک دانشور، ایک عظیم مفکر، ایک بزرگ رہنما اور سراپا اخلاص وشرافت عالم دین کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے گہر افشانی کر رہا ہے۔ خواجہ حسن ثانی نظامی، جماعت اسلامی کے مولانا محمد شفیع مونس، سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سید اوصاف علی صاحب، مسٹر شفیع اگوائی وائس چانسلر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، مولانا عبدالوہاب خلجی قائمقام ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہلحدیث کی تقاریر بھی پسند کی گئیں۔ مفتی ہلال عثمانی اور بیگم حمیدہ قدوائی نے بھی تقریریں فرمائیں ـــــ ہمدرد خلائق محسن طب اور حضرت مفکر ملت کے بہت قدیم ومخلص رفیق عالی جناب الحاج حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد کے دست مبارک سے اس اہم نمبر کی رسم اجراء ادا ہوئی۔

دعا اور شکریہ

آخر میں حضرت صدر محترم نے دعا کرائی اور راقم الحروف نے عمید الرحمٰن عثمانی سلمہٗ، نجیب الرحمٰن اور دیگر تمام متعلقین اور خود اپنی طرف سے حضرت صدر محترم اور دیگر حضرات کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ جیسے سرکردہ ارباب فضل وکمال اور معزز ومحترم حضرات کی اتنی بڑی تعداد میں تشریف آوری ہم سب کے لئے مسرت، افتخار اور عزت افزائی کا باعث ہوئی ہے، ہم آپ کے شکر گذار بھی ہیں اور درخواست بھی کرتے ہیں کہ آئندہ بھی یہ محبت وشفقت یہ خلوص وتعاون ہمیں حاصل رہے گا۔

ناشتہ وعشائیہ

عمید میاں نے اعلان کیا کہ کافی اور ناشتہ کا انتظام کیا گیا ہے براہ کرم

سب حضرات اس میں شرکت فرمائیں، بعد نماز عشاء ندوۃ المصنفین میں ایک پر تکلف عشائیہ ترتیب دیا گیا جس میں بہت سے سر کردہ حضرات نے شرکت فرمائی۔

بحمد للہ یہ تمام پروگرام بحسن وخوبی انجام پذیر ہوئے اور تمام حضرات نے اس کامیاب پروگرام پر عمید میاں کو مبارکباد دی اور حقیقت یہ ہے کہ اس جد وجہد اور اس نمبر کی اشاعت اور سارے پروگرام میں جو محنت کی اس کے لئے وہ ہم سب ہی کی طرف سے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ناسپاس گذاری ہوگی اگر اس موقع پر ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا نہ کریں جنھوں نے نمبر کی اشاعت، مقالات کی تحریر و ترتیب، رسم اجراء کے پروگرام اور دیگر تمام امور میں دست تعاون دراز فرمایا۔ اردو اکادمی دلی کے جناب سید شریف الحسن نقوی، محترم الحاج حکیم عبدالحمید صاحب اور محترم سید اقتدار حسین صاحب ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ اسی طرح تمام انتظامات کے سلسلے میں ارباب فکر و دانش، سفارت خانوں، دینی مدارس اور مختلف جماعتوں کے سربراہوں سے رابطہ قائم کرنا، ان کو اجتماع میں آنے کے لئے مدعو کرنا اور دیگر تمام انتظامات میں مخلصانہ تعاون کے لئے ڈاکٹر محسن عثمانی (جواہر لال نہرو یونیورسٹی) جناب راحت ہاشمی، ارشد فہمی ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ ان سب کو اور دیگر معاونین کرام کو اپنے فضل وکرم سے نوازے اور بہترین اجر عطا فرمائے۔

اظہار تاسف

افسوس ہے کہ برادر محترم جناب جمیل مہدی اپنی شدید علالت کی وجہ سے اس اہم پروگرام میں شرکت نہ کرسکے اور مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اپنی مصروفیت کی وجہ سے تشریف نہ لاسکے۔ یہ امر بھی افسوس ناک ہے کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے بعض بہت ہی اہم شخصیتوں کی تقاریر نہ کرائی جاسکیں۔

اورنگ زیب اور سیکولرزم

(۳)

عبدالرؤف ایم، اے اور بی کالاس

چنانچہ اُس کے عہدِ حکومت کے اواخر میں مغل طبقۂ امرا میں مرہٹوں کا تناسب دو اعشاریہ نو فیصد ہو گیا تھا۔ لیکن اورنگ زیب کے دور حکومت کے نصف اول میں مرہٹوں کا تناسب پانچ اعشاریہ پانچ فیصد اور نصف آخر میں سولہ اعشاریہ سات فیصد ہو گیا۔ اِن میں تین ہزاری اور اس سے بلند تر درجات کے منصب دار جو امرار اعظم کے زمرہ میں شمار ہوتے تھے وہ یہ ہیں: راجہ ساہو پسر سمبھاجی ولد سیواجی سات ہزاری، سمبھاجی اور کانہوجی شر کے چھ چھ ہزاری، اَچلاجی نمبالکر، ناگوجی مانے، بہراجی پاندھرے، سوم شنکر، راناجی جنار دھن، جنکوجی، مالوجی، سنتواجی ڈفلے، نیتھوجی (بعد از قبول اسلام محمد قلی خاں) پانچ پانچ ہزاری، جادون رائے دکنی، داماجی، ہرسوجی، یشونت راؤ، باجی چوان ڈفلے اور سیاجی چار چار ہزاری نیز دیگر چند مرہٹہ ساڑھے تین ہزاری اور تقریباً تیرہ مرہٹہ تین تین ہزاری منصب دار تھے۔ سیواجی کے بیٹے سمبھاجی اور پوتے ساہو کے علاوہ اُس کے بعض دیگر خویش و اقارب بھی مغل ملازمت اختیار کیے۔ مثلاً مہادجی نمبالکر جو سیواجی کا داماد تھا، اورنگ زیب کے کمانڈر دلیر خاں کے ماتحت مغل منصب دار تھا۔ اِسے سمبھاجی کی ہمشیرِ خاص سکوار بائی عرف سکھو بائی

جو سیواجی کی بیوی سئی بائی کے بطن سے تھی، بیاہی گئی تھی۔ شر کے خاندان کے بھی کئی افراد اورنگ زیب کے منصب دار تھے۔ جبکہ شر کے سیواجی کے سسرالی خاندان کے افراد تھے۔ سیواجی کے داماد مہادجی کا باپ باجاجی نمبالکر بھی شاہی ملازمت اختیار کئے ہوئے تھے۔ جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

گذشتہ سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ راجپوت اور مرہٹوں کو ملا کر اورنگ زیب کے منصب داروں میں ہندو امرار زبردست اکثریت میں تھے۔ کیونکہ اس کی حکومت کے نصف اول میں چار سو چھیاسی منصب داروں میں ایک سو پانچ یعنی اکیس اعشاریہ چھ فیصد ہندو تھے اور دوسرے دور حکومت میں پانچ سو چھتر امرار میں ایک سو بیاسی یعنی اکتیس اعشاریہ چھ فیصد ہندو اعلیٰ مناصب پر فائز تھے۔ گویا دونوں ادوار میں اوسطاً ستائیس فیصد ہندو امرار تھے۔ اس کے باوجود معاندین اس پر یہ الزام عائد کرتے رہتے ہیں کہ اُس نے بیک جنبشِ قلم ہندوؤں کو سرکاری ملازمتوں سے موقوف کر دیا تھا۔ ہماری معلومات کی حد تک اس الزام میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ اس نے ۱۶۷۱ء میں صرف یہ حکم صادر کیا تھا کہ محکمۂ مالگذاری سے صرف وہ ہندو منشی (کلرک) دیوان اور عامل جو مرتشی (رشوت خور) ہوں اپنے عہدوں سے برطرف کر دیے جائیں۔ لیکن جلد ہی اس حکم میں یہ ترمیم کر دی گئی کہ محکمہ مالیات میں نصف پیشکار ہندو اور نصف مسلمان رکھے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس فرمان کا مقصد صرف رشوت ستانی کا خاتمہ کرنا تھا نہ کہ کسی قسم کا تعصب و تنگ نظری۔ مؤرخ سر جدو ناتھ سرکار (متوفی ۱۹۵۸ء) معترف ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد محکمۂ مالگذاری کا سارا نظم و نسق رائے رایان رگھوناتھ[۵] کے سپرد تھا جو نہایت ایماندار اور کاشتکاروں

ع۵ راجہ رگھوناتھ اولاً علامی سعد اللہ خاں شاہجہانی کے انتقال (۷ر اپریل ۱۶۵۶ء) سے ۷ر جولائی ۱۶۵۶ء یعنی اِس عہدہ پر میر جملہ کی تقرری تک، تین ماہ اور بعد ازاں ۱۶۵۷ء سے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کا ہمدرد تھا، اورنگ زیب نے اُسے راجہ کے خطاب سے سرفراز کیا۔ لیکن جیسا کہ مؤرخ موصوف کی عادت ہے کہ ایک ہی سانس میں نہایت چابک دستی سے متضاد باتیں کہہ جاتے ہیں پس اورنگ زیب کی اس غیر جانبدارانہ پالیسی پر بھی سردست یہ اتہام عائد کر ہی دیا کہ راجہ رگھوناتھ جین حیات نائب دیوان ہی بنا رہا دیوان اعلیٰ کبھی نہ بن سکا۔ حالانکہ وہ عمر بھر دیوان اعلیٰ کے سارے فرائض انجام دیتا رہا[۱]۔ لائق ناظرین کرام کو یاد ہوگا کہ آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں پروفیسر نورالحسن صاحب وزیرِ مملکت برائے تعلیم رہ چکے ہیں، وہ محکمۂ تعلیم کو پوری طرح سنبھالے ہوئے تھے مگر موصوف وزیر کابینہ کبھی نہ بن سکے اور قارئین کرام کو یہ بھی یاد ہوگا کہ موصوفہ کی کابینہ میں ایک عرصہ تک کوئی مسلمان وزیر کابینہ کی حیثیت سے شامل نہ تھا۔ جناب سید میر قاسم صاحب کو وزیرِ کابینہ بنانے کے بعد ہی یہ خلا پُر ہوا تھا۔ راجہ رگھوناتھ رایان اور پروفیسر نورالحسن صاحب کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے غور طلب امر یہ ہے کہ جمہوری اور سیکولر ہندوستان کی حکمراں اور مطلق العنان فرمانروائے ہند کی کارکردگی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ اگر پروفیسر نورالحسن صاحب کے سلسلہ میں کوئی مناسب تاویل کی جاسکتی ہے تو یہ تاویل اورنگ زیب کے حق میں بدرجۂ اولیٰ کی جانی چاہیئے کیونکہ وہ ایک مطلق العنان شہنشاہ تھا۔

اورنگ زیب کے ہندو امراء کی تعداد کے مذکورہ بالا اجمالی جائزے کے بعد اس بیان میں کیا صداقت باقی رہ جاتی ہے کہ "اکبر نے راجپوتوں کا تعاون اور ان کی ہمدردیاں حاصل کر کے ان کو حسبِ لیاقت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جین حیات (۱۶۶۳ء تک) نائب دیوان کی حیثیت سے اس اہم ترین محکمہ کے بلا شرکت غیرے تمام فرائض انجام دیتا رہا۔ برائے تفصیل ملاحظہ ہو "مغل ایڈمنسٹریشن" ص ۲۸-۳۰ ہندی ایڈیشن، مطبوعہ ۱۹۶۰ء از پروفیسر جدوناتھ سرکار۔

اعلیٰ مناصب اور عہدے عطا کیے؎ اس کے برخلاف اورنگ زیب نے راجپوتوں سے عداوت پیدا کرلی اور انھیں نیز دیگر ہندوؤں کو شاہی ملازمتوں سے موقوف کر دیا۔[۱۵]" اور ڈاکٹر آشیر وادی لال سری واستو سابق صدر شعبۂ تاریخ آگرہ یونیورسٹی نے اورنگ زیب کے بارے میں یہ کہہکر اپنی بھڑاس نکالی ہے کہ "محمد علی جناح کے ماسوا اورنگ زیب جیسا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جس نے اس ملک کے باشندوں کی دو اہم ذاتوں (ہندو اور مسلمانوں) میں تفریق کی خلیج کو اتنا وسیع کیا ہو۔[۱۵]"

سردست اورنگ زیب کے ہمعصر سیواجی کے مسلم افسران و ملازمین اور اس کی مذہبی پالیسی کے ضمن میں بھی اجمالاً عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کیونکہ اس کے بارے میں بظاہر یہ مشہور ہے کہ "وہ سرکاری ملازمین تفویض کرتے وقت مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کا امتیاز روا نہیں رکھتے تھے علی الخصوص انھیں فوج اور جہازی بیڑہ میں ذمہ دار عہدوں پر تعینات کیا کرتے تھے۔ تمام لوگوں کو بلا امتیاز مذہب وملت اس کی ملازمت حاصل کرنے کے یکساں مواقع فراہم تھے۔ وہ ہندو سادھو سنتوں کے ساتھ مسلم بزرگوں کا بھی یکساں احترام کیا کرتے تھے۔ مسلم رعایا کو مرہٹہ راج میں اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے میں کوئی خطرہ لاحق نہ تھا جیسا کہ اورنگ زیب کی کٹر مسلم حکومت میں ہندوؤں کے لئے تھا۔ اور اس (سیواجی) کی مذہبی پالیسی نہایت روادارانہ تھی۔" مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے اس ہیرو

؎ گو یہ جداگانہ بات ہے کہ اس وسیع النظر جہان اسمراٹ اکبر کے امرار اعظم میں ہمیں صرف ایک راجپوت یعنی راجہ مان سنگھ زمیندار انبیر ہی ہفت ہزاری منصب پر فائز نظر آتا ہے جبکہ "متعصب اور تنگ نظر" اورنگ زیب کے یہاں ہفت ہزاری منصب پر دو راجپوت (جے سنگھ وجسونت سنگھ) اور ایک مرہٹہ یعنی ساہو بیٹھا دکھائی دیتے ہیں۔

کی یکجائی و تمام مدح سرائی کے باوجود سر جدو ناتھ سرکار جس نے اورنگ زیب اور اس کے پہلو بہ پہلو سیواجی پر تحقیقی کام کرنے میں اپنی عمر عزیز کے تقریباً پچیس سال صرف کر کے تحقیق و تفحص کی دنیا میں یقیناً ایک عظیم خدمت انجام دی، ہندو پد پادشاہی کے نمائندے شیواجی کی کثیر فوج میں (جو دو لاکھ پانچ ہزار فوجیوں اور چھیانوے کمانڈروں پر مشتمل تھی) تلاشِ بسیار کے باوجود صرف سات سو بیجاپوری سپاہ کے معزول اور برخاست شدہ (Disbanded) پٹھان فوجیوں کو ہی شمار کرا سکے اور کمانڈروں میں سیدی ہلال اور نور خاں نیز امرا البحر (Admirals) میں سیدی سنبل، سیدی مصری اور دولت خاں اور خارجہ سیکریٹری قاضی حیدر کا نام ہی اپنی تصنیف کے اوراق میں ثبت کر سکے۔ لیکن سیواجی کے مسلم ملازمین کی یہ فہرست یقیناً نامکمل رہے گی اگر ہم اس کے ذاتی خدمت گار فراش مداری مہتر کو شامل نہ کریں فراش مداری مہتر کے تعاون سے ہی سیواجی آگرہ سے فرار ہوا تھا۔ بہر حال یہاں مداری مہتر کی خدمات کو واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ بچہ بچہ ایک مہتر کے "فرائض منصبی" سے بخوبی واقف ہے۔ قاضی حیدر کو عربی، فارسی جاننے کے سبب امور خارجہ کا انچارج بنایا تھا (قاضی صاحب نے سمبھاجی کے عہد حکومت میں اس کے مظالم سے تنگ آکر شہنشاہ اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کر لی تھی جہاں وہ دہلی کے قاضی القضاۃ بنائے گئے) عام طور سے حکومتیں علوم و فنون اور تمام زبانوں کی سرپرستی کیا کرتی ہیں لیکن سیواجی کو فارسی زبان سے انتہائی نفرت تھی اور اسے وہ غلامی کی علامت سمجھتا تھا لہذا اس نے سنسکرت زبان کو اپنی سرکاری و دفتری زبان بنانے کے لئے رگھوناتھ پنت ہنومنتے کی سرکردگی و رہنمائی میں پنڈتوں کی ایک جماعت سے "راج بیوہار" نام کا ایک فرہنگ تیار کرایا۔ اور فارسی کو اپنی حکومت سے جلا وطن کر دیا گیا۔ بحری فوج کی سربراہی مسلمانوں کے سپرد کرنا سیواجی کی مجبوری تھی کیونکہ کل تک برادرانِ وطن بحری سفر کو مذہباً "مہا پاپ" خیال کرتے تھے۔ جہاں تک مسلم بزرگانِ دین کے احترام کا سوال ہے تو بقول مرہٹہ مورخ گووند سکھارام سردیسائی ہمیں یہ تسلیم

کرسیواجی کیلسی کے بزرگ بابا یاقوت کو اپنا "دھرم گرو" مانتے تھے مگر دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ نومبر ۱۶۷۹ء میں جالنا کے نواح میں شیخ جان محمد کی خانقاہ کو سیواجی تاراج کرتا ہوا نظر آتا ہے یہاں تک کہ اس خدارسیدہ بزرگ کو ڈرایا دھمکایا اور ہتک آمیز سلوک کرتے ہوئے انھیں گالیاں تک دیں۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی اِس بدسلوکی سے کبیدہ خاطر ہو کر شیخ علیہ الرحمۃ نے اُسے بددعا دی جس کے نتیجہ میں وہ (سیواجی) پانچ ماہ بعد ۳ اپریل ۱۶۸۰ء کو اپنی خانگی زندگی یعنی بیوی بچوں سے تنگ و عاجز آکر نہایت مایوس کن حالات میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔[۸۸]

دراصل سیواجی کی نگاہیں روزِ اول ہی سے ہندو دھرم کے عظیم احیائی منصوبہ پر مرتکز تھیں چنانچہ وہ نومسلموں کو حرص و طمع اور ترغیب و ترہیب کے ذریعہ از سرِ نو شدھی کر لیا کرتے تھے۔ بالاجی نمبالکر اور نیتاجی پالکر اس کی روشن مثال ہیں۔[۸۹] وہ خود کو بقر (گاؤ) و برہمن کا محافظ و سرپرست خیال کرتے تھے جیسا کہ مفرور مغل منصب دار چھتر سال بندیلہ سے دوران ملاقات اس کی جذباتی اور اشتعال انگیز گفتگو سے ثابت ہے۔[۹۰] فی الحقیقت کچھ تو پیدائشی طور پر اور کچھ تربیتی اثرات کے تحت وہ اتنے متعصب اور کٹر قسم کے ہندو واقع ہوئے تھے کہ خود اپنے باپ شاہ جی کو محض اس وجہ سے ناپسندیدہ اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے کہ وہ رندولہ خاں کی ماتحتی میں بیجاپوری ملازمت اختیار کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ شاہ جی کی بیجاپوری سلطنت کے تئیں وفاداری اور خدمات کے پس منظر میں پیشواؤں کے اتہاس (۱۷۸۳ء) میں نانا فرنویس رقمطراز ہیں کہ "شاہ جی نے بھارت کو ایک مسلم ملک بنانے اور ہندو دھرم کے استیصال میں "ترکوں" (مسلمانوں کے لئے حقارت آمیز لفظ) سے تعاون کر کے جو ذلیل و کمینہ برتاؤ (آچرن) کیا وہ بھگوان کو بھی اچھا نہ لگا۔[۹۱] بہرسو تمام تر تاویلات کے بعد بھی سرجدو ناتھ سرکار کو اپنے آنجہانی ممدوح کے اِس مذہبی کٹر پن (Orthodoxy) کے بارے میں یہ کہنا ہی پڑا کہ "سیواجی کے

ہندو سوراج[۵] کا آدرش جس مقدار میں (ہندو) کٹرپن پر منحصر تھا اسی تناسب سے اس کی تباہی اور شامت کے بیج اس میں مضمر تھے۔ (In Proportion as Shivajis ideal of a Hindu 'Swaraj' was based one orthodoxy, it contained with in itself the seed of its own death". See 'Shivaji and his times', P.375, Sixn Edition, F. 1961)

اورنگ زیب کے امراء میں غیر مسلم منصب داروں کے اعداد و شمار کی وضاحت کے بعد اس کے ایرانی امراء (شیعی) کے فیصد تناسب اور حیثیت پر بھی اختصاراً عرض کرنا ضروری ہے تاکہ ملازمتیں وغیرہ تفویض کرنے کے سلسلہ میں اس کا نظریۂ سیکولرزم قدرے وضاحت سے ناظرین کے سامنے آسکے۔ اکثر ہندو مورخین نے اسے 'ہندوکش' ہونے کے ساتھ 'رافضی کش'[۲۱] بھی بتلایا ہے نیز یہ کہ وہ انھیں بالعموم 'ایرانی غول بیابانی' کے الفاظ سے یاد کیا کرتا تھا اور انھیں شدید نفرت اور حقارت آمیز نظروں سے دیکھتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک اہل تشیع اسلام دشمن لوگ تھے۔[۲۲] اور یہ بھی کہ جنگ برادران میں اس نے اہل تسنن کو اہل تشیع کے بالمقابل کمربستہ اور برسرپیکار کر دیا تھا۔ لیکن اس کے کل منصب داروں کے اعداد و شمار پر نظر کرنے کے بعد نہ تو یہ دعویٰ ہی قابل قبول ہو سکتا ہے اور نہ اس کی شیعہ دشمنی ہی ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ جنگ سموگڈھ (مئی ۱۶۵۸ء) ایک ہزاری اور اس سے بلند تر درجات کے ایک سو چوبیس منصب داروں میں ستائیس یعنی اکیس اعشاریہ آٹھ فیصد ایرانی امراء اورنگ زیب کے

---

[۵] ہندوی سوراج کی اصطلاح سیواجی نے اپنے اس مراسلہ میں استعمال کی ہے جو انھوں نے داداجی نرس پربھو کو ارسال کیا تھا۔ دیکھئے "دی ملٹری سسٹم آف دی مرہٹاز" از ڈاکٹر سریندر ناتھ سین ص ۱۷، ج ۱ مطبوعہ اکتوبر ۱۹۵۸ء۔

طرفدار تھے۔ ان میں چار کا منصب پانچ ہزاری اور اس سے بلند تر تھا، جن میں اُس (اورنگ زیب) کا ماموں امیر الامرار مرزا ابو طالب شائستہ خاں اور محمد سعید میر جملہ سات سات ہزاری ذات و سوار اور دو اسپہ سہ اسپہ منصب پر فائز تھے۔ یہ دونوں سموگڑھ کے معرکہ میں اورنگ زیب کے کمانڈر تھے۔ دوسری طرف شہزادہ بلند اقبال داراشکوہ کے ستاسی منصب داروں میں یتئیس (۲۶ء۲۶ فیصد) ایرانی تھے یعنی اورنگ زیب کے شیعی امراء سے صرف چار اعشاریہ آٹھ فیصد زیادہ۔

جنگِ وراثت میں اورنگ زیب کی مکمل فتح و کامرانی یعنی ۵ رجون ۱۶۵۹ء کو اورنگ نشینِ[۵۹] سلطنت ہونے کے بعد بھی ایرانیوں کی شاہی ملازمت میں تعدادی قوت اور مناصب و درجات پر کوئی اثر نہ پڑسکا اور ان کی حیثیت علیٰ حالہ قائم رہی۔ حکیم برنیر بھی اپنے سفرنامہ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ اورنگ زیب کے غیر ملکی امرار کا معتد بہ حصہ ایرانیوں پر مشتمل ہے۔ برنیر کے اس قول میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی کو دخل نہیں ہے کیونکہ اس کی حکومت کے نصف اول میں چار سو چھیاسی منصب داروں میں ایک سو چھتیس (تقریباً ۲۸ فیصد) ایرانی امراء تھے جبکہ تورانیوں (اہلِ تسنن) کی تعداد ستر سٹھ یعنی تیرہ فیصد ہی تھی۔ البتہ اس کے دورِ حکومت کے نصف آخر میں پانسو چھتر منصب داروں میں سے ایرانی ایک سو چھبیس (تقریباً بائیس فیصد) تھے۔ اس معمولی تخفیف کا سبب اس کے آخری دورِ حکومت میں مرہٹوں کا شاہی ملازمتوں میں

---

۵۹ اورنگ زیب کی رسم تخت نشینی دو دفعہ عمل میں آئی۔ اول مرتبہ جنگ سموگڑھ کے بعد یکم ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ مطابق ۲۱ر جولائی ۱۶۵۸ء کو۔ اس کا مادۂ تاریخ اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم سے مستخرج ہوتا ہے اور دوسری مرتبہ ۲۴ ر رمضان ۱۰۶۹ھ مطابق ۵ رجون ۱۶۵۹ء کو تکمیلی طور پر یہ رسم ادا کی گئی جبکہ وہ ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہِ غازی کے نام سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔

شمولیت تھا، جس کا اثر نہ صرف ایرانیوں بلکہ راجپوتوں، افاغنہ، ہندوستانیوں اور تورانی امرا کی تعداد پر بھی پڑا واضح ہو کہ شہنشاہ خود تورانی النسل تھا، باوجودیکہ دونوں وقفوں میں تورانی (سنی) علی الترتیب تیرہ اور بارہ فیصد ہی تھے۔ گویا تورانیوں کی تعداد اورنگ زیب کے پورے عہد حکومت میں پست ہی رہی۔ عصری سیاح ٹیورنیر کا بیان ہے کہ مغل مملکت میں ایرانی بلند ترین عہدوں پر قابض ہیں۔ ٹیورنیر کا بیان مبنی بر صداقت ہے کیونکہ اورنگ زیب کے اول دور حکومت میں تیئیس ایرانی پنج ہزاری یا اس سے بلند تر منصب پر فائز تھے۔ جبکہ تورانی صرف نو ہی تھے اور دورِ آخر میں بلند ترین مناصب پر چودہ ایرانی تھے جبکہ تورانی صرف چھ۔ دراصل ایرانیوں کی بہتر پوزیشن قائم رہنے کے مختلف وجوہ تھے۔ اولاً دکن کی خود مختار شیعی ریاستوں کا مغل امپائر میں الحاق، جن کے شیعی امراء شاہی ملازمت میں شریک ہو گئے۔ ثانیاً ایرانی، تورانیوں اور افغانوں کی بہ نسبت زیادہ مہذب ہوتے تھے۔ افاغنہ (پٹھانوں) کو مغل تہذیبی اعتبار سے نہایت پست اور حقیر خیال کرتے تھے۔ شہنشاہ بابر کہا کرتا تھا کہ "یہ پٹھان بھی بڑے گنوار اور جاہل ہیں[۳۳]۔" ثالثاً اورنگ زیب اہلِ خواف (ایران کے صوبہ خواف کے باشندوں) پر نہایت اعتماد کیا کرتا تھا۔ اس دعوے کی تائید میں یہاں بخوفِ طوالت صرف میرک معین الدین احمد خوافی کا نام پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ امیر موصوف کا شمار اورنگ زیب کے انتہائی معتمد علیہ امراء میں ہوتا ہے۔ کابل و دکن کے دیوانی کے فرائض نہایت حسنِ تدبیر سے انجام دیتے ہوئے میرک معین الدین نے ۱۰۹۵ھ میں رحلت فرمائی۔ "سید بہشتی شد" سے تاریخ وفات برآمد ہوتی ہے[۳۴]۔

اورنگ زیب کے دور فرمانروائی میں ایرانی امراء کی حیثیت دیگر نسلوں، ذاتوں اور فرقوں کے بالمقابل بہتر و برتر ہونے کے باوجود سر جدو ناتھ سرکار فرماتے ہیں کہ ایرانیوں کے سلسلہ میں اورنگ زیب کا طبعی عدم اعتماد اس کے سارے امورِ جہانبانی میں مسلسل مانع رہا[۳۵]۔" لیکن اس کے برعکس تاریخی شواہد اور خود مورخ موصوف کی تحقیقات ہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایرانی امراء کے بلند مراتب پر

شہنشاہ کے نہایت متشرع ہونے کے باوجود کوئی اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ ایک دفعہ جب بادشاہ کے حضور عرض کیا گیا کہ بخشی الممالک (Pay Master General) شیعہ ہے تاہم اس نے کسی اور تقرر کرنے سے انکار کر دیا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے دور حکومت کی بیشتر مدت میں بخشی الممالک شیعہ ہی رہے۔ مثلاً سربلند خاں (م ۱۶۷۹ء) ۱۶۷۲ء میں بخشی دویم اور بعد ازاں بخشی الممالک کے عہدے پر سرفراز کیا گیا۔ بعد ازاں روح اللہ خاں پسر خلیل اللہ خاں جنوری ۱۶۸۰ء تا ۱۶۹۲ء اس اہم ترین عہدہ پر تعینات رہا۔ میر حسن خانزادگاں عرف روح اللہ خاں ثانی جس نے ۱۷۰۴ء میں عین عالم شباب میں انتقال کیا، ۱۶۹۲ء میں بخشی دویم اور اپنی وفات کے وقت خانساماںؔ کے معزز عہدہ پر مقرر تھا۔ علاوہ ازیں مخلص خاں پسر صف شکن خاں متوفی ۱۷۰۱ء، بہرہ مند خاں متوفی ۱۷۰۲ء اور مرزا صدر الدین خاں صفوی (جو بہادر شاہ اول کے دور حکومت میں شاہنواز خاں کے خطاب سے مفتخر کیا گیا) بخشی گری کے عہدہ پر فائز رہ چکے تھے[۲۶]۔ مزید برآں بہت سے دیگر ایرانی (شیعی) دوسرے اعلیٰ ترین اور بلند مناصب پر قابض تھے۔ مثال کے طور پر رعد انداز خاں جیسے ستنامیوں کی بغاوت کو فرو کرنے کے صلہ میں شجاعت خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔

عہ مغل عہد حکومت میں خانساماں (High Steward) یا میر ساماں انتہائی اہمیت کا حامل عہدہ تھا جس کے تحت شاہی محل و حرم، مطبخ اور شاہی کارخانوں کا انتظام و انصرام نیز شہنشاہ کے حفاظت کا ذمہ ہوتا تھا۔ وہ شہنشاہ کے سفر و حضر میں سایہ کی طرح ہمیشہ ساتھ رہتا تھا۔ بادشاہ کا نجی عملہ بھی اسی کی ماتحتی میں اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ دیوان اعلیٰ (وزیر اعظم) کے بعد یہ دوسرے درجہ کا عہدہ تھا۔ چنانچہ یہ عہدہ نہایت باثر اور معتمد علیہ شخصیت کے سپرد کیا جاتا تھا۔ ملاحظہ ہو مغل ایڈمنسٹریشن از پروفیسر سرکار۔

قلعہ اکبر آباد کا کمانڈنٹ اور پانچ ہزاری منصب دار تھا۔ اس کے کارہائے نمایاں سے عہد عالمگیر کی تاریخ بھری پڑی ہے، یہ ۱۶۷۲ء میں افغانوں سے داد شجاعت دیتا ہوا کرایا درہ میں مارا گیا۔ عمدۃ الملک جعفر خاں اورنگ زیب کا وزیر (Chancellor) اور اس کا لڑکا کامگار خاں ۱۶۸۷ء میں عہدۂ خانساماں پر مامور تھا۔ عنایت اللہ جو اورنگ زیب کا منظور نظر سکریٹری تھا، ۱۶۹۲ء میں دیوان تن اور ۱۶۹۸ء میں دیوان خالصہ کے عہدہ پر تعینات کیا گیا تھا۔ اسی طرح موسوی خاں عرف مرزا معز فطرت ہم زلف اورنگ زیب ۱۶۸۸ء میں دیوان تن اور بعد ازاں دیوان بنایا گیا۔ میر ملک حسین خاں خان جہاں کوکلتاش ظفر جنگ اورنگ زیب کے اعلیٰ ترین امرا میں تھا جس نے ایک عرصہ تک دکن میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ حافظ محمد امین خاں پسر میر جملہ جو نہایت غالی شیعہ تھا ۱۶۷۲ء سے اپنی وفات (۱۶۸۲ء) تک گجرات کا صوبیدار رہا اور بزرگ امید خاں پسر شائستہ خاں فاتح چٹ گام و آسام ۱۶۸۲ء سے ۱۶۹۲ء تک بہار کا گورنر تھا۔ غازی الدین بہادر فیروز جنگ اورنگ زیب کے سپہ سالاروں میں امتیازی شخصیت کا حامل تھا۔ ۱۶۸۵ء میں محاصرۂ بیجاپور کے دوران شہزادہ اعظم اور اس کی سپاہ کو نیست و نابود اور تباہ ہونے سے بچانا اسی فیروز جنگ کی حوصلہ مندی اور سوجھ بوجھ کا کام تھا اور شہنشاہ اورنگ کے امیر عسکر اور مصاحب خاص عاقل خاں رازی کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہوگا کہ اس کی شخصیت سے تاریخ کا ابجد خواں بھی واقف ہے۔ اورنگ زیب کے ان ایرانی امرا میں سات ہزاری منصب داروں کی تعداد چھ تھی جبکہ شاہجہانی عہد حکومت کے اواخر میں شاہی خاندان کے باہر سات ہزاری ذات و سوار کا معزز و مفتخر منصب صرف تین امرا یعنی علی مردان خاں، سعید خاں اور اسلام خاں کو نصیب ہوا جن میں صرف اول الذکر ہی شیعہ تھا۔ آصف خاں کو جو نو ہزاری ذات و سوار کا منصب دار تھا، اس سے مستثنیٰ سمجھنا چاہیے کیونکہ وہ شاہ جہاں کا خسر تھا جس نے شاہ جہاں کو اورنگ نشین سلطنت کرنے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں۔[۲۶] اس کے برعکس رافضی کش اورنگ زیب کے شیعی

امرا میں شائستہ خاں، میر ملک حسین کوکلتاش، خانِ خاناں میر جملہ اور محمد ابراہیم خلیل اللہ خاں عرف مہابت خاں سات سات ہزاری ذات وسوار اور دو اسپہ وسہ اسپہ نیز محمد ابراہیم اسد خاں اور عزیز الدین بہرہ مند خاں سات سات ہزاری ذات کے منصب دار تھے۔ اگر ان سات ہزاری امرا کی فہرست میں دکن کی شیعی ریاستوں کے مغل سلطنت میں انضمام کے بعد وہاں سے آئے ہوئے دو امرا نواب عبدالرؤف خاں میانہ[۲۸] عرف دلیر خاں اور سید مخدوم عرف شرزہ خاں بعدہٗ رستم خاں مہدوی[۲۹] کو بھی شریک کر لیا جائے تو یہ تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔ مندرجہ بالا شواہد کے پیش نظر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے Careers open to telent پر عمل کرتے ہوئے بلا امتیاز مذہب و ملت قابل لوگوں کے لئے شاہی ملازمتوں کے دروازے مکمل طور پر کھول رکھے تھے جو اس کے سیکولر ہونے کی بین دلیل ہے۔ یہی نہیں شہنشاہ اپنے امرا کے رنج و راحت میں بھی برابر شریک رہتا تھا۔ بخشی الممالک روح اللہ خاں جب بسترِ مرگ پر آخری سانسیں گن رہا تھا تو بادشاہ بہ نفس نفیس اُس کی عیادت کو گئے اور اسے تسکین دیتے ہوئے فرمایا کہ انسان کو کسی حال میں بھی رحمت خداوندی سے مایوس نہیں ہونا چاہئے، اپنی جو کچھ خواہش کو بتلائیے اُسے پورا کیا جائے گا۔ چنانچہ اُس کی حسب خواہش اورنگ زیب نے اُس کی اولاد کے ساتھ ہمیشہ نہایت فیاضانہ سلوک روا رکھا۔[۳۰]

(باقی آئندہ)

ہادئ عالم، محسن انسانیتؐ غیروں کی نظر میں

(۲)

محمد سعید الرحمٰن شمس، مدیر نصرۃ الاسلام کشمیر

نپولین بوناپارٹ نے لکھا ہے:

"I Praise God and have reverence for the Holi Prophet Muhammad and the Holi Quran"

یعنی میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی تعظیم و تکریم کرتا ہوں۔

ریلنڈ گیلام جو لندن یونیورسٹی کے پروفیسر تھے پیغمبر اسلامؐ کے تئیں یوں رقمطراز ہیں:

"At the out set let it be Sind that Mohammed (peace be upon hing) was one of the great figures of

history whose over mastering conviction was that there was one God alone and there shold se one community of selivere this a sility as a statesman faced with proslems of extra ordinrary complexity istruly amazing with all the Pover of armies policeand civil service no Aras has ever Snec eeded in holdiny is country man toyether as he did"

یعنی ابتدا میں مجھے یہ کہنا چاہئے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ میں عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کا یہ یقین کامل تھا کہ خالقِ کائنات یکتا و تنہا ہے اور مسلمانوں کی ایک ہی ملت ہونی چاہئے انھیں غیر معمولی پیچیدہ مسئلوں کا سامنا تھا لیکن ایک مدبر اعظم کی حیثیت سے ان کی قابلیت یقیناً حیران کن ہے۔ کوئی بھی عرب اپنی فوجی پولیس اور سول سروس کی طاقت کے باوجود آج تک کبھی اپنے ہم وطنوں کو متحد رکھنے میں اس طرح کامیاب نہیں ہوا جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ہوئے۔

ڈیل بائیون سٹینڈر اپنی کتاب (RELITIONS OF THEEST) میں لکھتا ہے:

"When Mohammed (peall se upon him)

died in 632. A.D. virtually all of Arsia his Under his Control He had Succeded in Uniting his countrymen as had no other Aras sefore him in a centrry aftr the founding of Islam the follouers of Mohammed seeame the Master of an empire greeter than that of Rome at its zenith."

"یعنی جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۶۳۲ء میں انتقال کر گئے تو لگ بھگ سارا عرب ان کے زیر نگیں تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو متحد کرنے میں اس طرح کامیاب ہوئے جس طرح کوئی بھی عرب ان سے پہلے کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اسلام کے وجود میں آنے کے بعد ایک ہی صدی میں حضرت سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار ایک ایسی مملکت کے حکمراں بن گئے جو کمالِ عروج کے وقت کی سلطنت روم سے زیادہ بڑی اور وسیع تھی۔"

سر ولیم میور جو اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے سخت ترین نقادوں میں شامل ہے اپنی کتاب LIFE OF MOHAMMED میں یوں اعتراف حق کرتا ہے:

"The first peculiarity then wich attracts our atten tion in the sus division of the Arass in to innom era sle sedies ---- each independent of

of the others restless and of ten at war amongst them selves and e ven when united by blood or by intrest, ever ready on soone insignefit cast cause to separate and give way to an implaceble hustility thus at, the ern of Islam the retras pect of Arsian history exhibies, as in the kalidos cope, an eververying stali of comsination and repulsion, such as had hitherrorendered asor live any attempt at a genral union The problem had let to se solved. by what force these tribes could se susdded or drawn to one common centere and it was solved by Mohammed (peacse upor him).

یعنی پہلی انوکھی بات جس کی طرف ہماری توجہ مبذول ہوتی ہے یہ ہے کہ عرب کے لوگ بے شمار قبیلوں اور ٹولیوں میں بٹ گئے تھے جن میں ہر قبیلہ دوسرے

سے آزاد تھا، یہ قبیلے بے چین اور اکثر ایک دوسرے سے آپس میں برسرپیکار رہتے تھے۔ اور جب کبھی وہ رنگ، نسل، رشتہ یا باہمی مفاد کی بنا پر وہ متحد ہوتے پھر وہ معمولی بات پر جدا ہونے کو تیار رہتے تھے اور شدید دشمنی پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اس طرح سے اسلام کے آغاز کے وقت عرب کی تواریخ پر نظر ڈالنے سے عیاں ہو جاتا ہے کہ ہمیشہ تغیر پذیر اتصال اور نفرت کی حالت زوروں پر تھی جس نے اب تک انھیں متحد کرنے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا تھا اس مسئلہ کو حل کرنا ابھی باقی تھا۔ کون سی طاقت ان قبیلوں کو مسخر کر سکتی تھی یا ایک مشترک مرکز کی طرف کھینچ لا سکتی تھی، یہ مسئلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حل کر دیا۔"

د اور مجاعص ایک عیسائی عالم کے تاثرات:

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی جلد صفحہ پر لکھا ہے کہ بیروت کے ایک عیسائی اخبار "الوطن" نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں مذکورہ عالم نے لکھا:

"دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے کہ جس نے دس برس (مدینہ منورہ کی زندگی میں) کے مختصر زمانے میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی۔ جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا کی اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ ایک اُمّی اور ناخواندہ تھے۔ وہ کون، حضرت محمد بن عبداللہ قریشی صلی اللہ علیہ وسلم

عرب اور اسلام کا پیغمبر۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے جس کو انھوں نے قائم کیا ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود ہی مہیا کر دیے۔"

ڈاکٹر ہٹی (Hitti) مشہور مؤرخ، مفکر و مبصر جب قلم اٹھاتا ہے تو یہ الفاظ لکھنے پڑتے ہیں:

"Mohammed was born within the full light of History"

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تاریخ کی پوری روشنی میں پیدا ہوئے۔

ڈاکٹر مائیکل۔ ایچ ہارٹ مصنف "THE 100" نامی کتاب جس میں ساری انسانی تاریخ کے ایک سو ایسے آدمیوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے مصنف کے نزدیک تاریخ پر سب سے زیادہ اثرات ڈالے۔ کتاب کا مصنف نسلی طور پر عیسائی اور تعلیمی لحاظ سے سائنس داں ہے مگر اپنی فہرست میں اس نے نمبر ایک پر نہ حضرت مسیحؑ کا نام رکھا ہے اور نہ نیوٹن کا، اس کے نزدیک وہ شخصیت جس کے اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے نمبر ایک پر رکھا جائے وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ آپؐ نے انسانی تاریخ پر جو اثرات ڈالے وہ کسی بھی دوسری شخصیت خواہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی نے نہیں ڈالے۔ مصنف نے آپؐ کے کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"He was the only man in History who was supremely successful on both the religious and secular level."

یعنی آپؐ تاریخ کے تنہا شخص ہیں جو انتہائی حد تک کامیاب رہے مذہبی سطح پر بھی اور دنیوی سطح پر بھی۔

انگریز مورخ ٹامس کارلائل نے پیغمبر اسلامؐ کو نبیوں کا ہیرو قرار دیا تھا۔ مائیکل ہارٹ (امریکی) نے آپؐ کو ساری انسانی تاریخ کا سب سے بڑا انسان قرار دیا ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی عظمت اتنی واضح ہے کہ وہ صرف آپ کے پیروؤں کے ایک "عقیدہ" کی حیثیت نہیں رکھتی، وہ ایک مسلّمہ تاریخی واقعہ ہے اور ہر آدمی جو تاریخ کو جانتا ہے وہ مجبور ہے کہ اس کو بطور واقعہ تسلیم کرے۔

سنٹرل کلچرل اسلامک پیرس (centrel cultural Islamic Paris) کی طرف سے اسلام پر جو کتاب شائع کی گئی ہے اس کا نام ہے Intruduction Of Islam Policetion کتاب میں پیغمبر اسلامؐ اور اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ نبی اکرمؐ کے تعلق سے کتاب میں لکھا گیا ہے:

"He sequethed to posterity, a religion of pure monutheism, he created a well disciplined stale out of the existent chaos and gave peace in place of was of every body ajainst every body else; he established a harmonious equilisrium set ween the spiritual and the temporal, set ween the

Mosqal and the citadel, he lezt a new system of law, Which dispensed imurtial justice in which even the head of the stali was as much a subject to it as any lomm oner and in which religious to learnanee was so join it that nar Muslim in hasitants of Muslim Countries equally enjoyed Complete juridical, judicial and cultural outonomy Asove all, the prophet Mohammed (piece saupon him) seme .nosl example and folly practised all that he taught to others."

یعنی انھوں نے آنے والی نسلوں کو خالص توحید کا مذہب ورثے میں دیا۔ آپؐ نے افراتفری میں سے ایک باقاعدہ اور منظم مملکت قائم کی اور ہر شخص کے خلاف ہر شخص کی لڑائی کی جگہ امن وامان دیا۔ آپؐ نے روحانیت اور مادیت اور مسجد وحصار کے درمیان موافق توازن پیدا کیا۔ آپؐ نے قانون کا نیا نظام عطا کیا جس میں بے ریا طریقہ پر انصاف مہیا ہوتا ہے اور جس میں سربراہِ مملکت

بھی ایک عام انسان کی طرح ہے اور جس میں مذہبی رواداری اس قدر عروج پر تھی کہ مسلم ممالک کے غیر مسلم باشندے کو بھی مکمل قانونی، عدلی اور تمدنی خود مختاری حاصل تھی؛ اس کے علاوہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پاکیزہ مثال قائم کردی اور خود بھی مکمل طور پر اس پر عمل کیا جس کی تعلیم انھوں نے دوسروں کو دی۔"

مذکورہ سنٹر کی طرف سے ایک اور کتاب "محمد رسول اللہ" شائع کی گئی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور سیرت مقدسہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مصنف نے لکھا ہے:

"There are thousands books in different languages of the world on the biography of the founder of Islam, both by friends and foes. All agree unanimously that Mohammed (Peace be upon him) was a very great man, even if they do not like him on account of his religion being a rival to theirs. Those who have wilfully misrepres-ented him and there have been very many of them are in fact indirectly paying him homage,

They misrepresent him only because they are afraid that a true portrait of him would mistead their coreligionists. Whom they want to disuade from embra-cing Islam by telling them bare-less stories about him. This sort of dishonest work is continuing even today. What is however amazing that inspite of the means and materials at the dispusal of modern west, this all out propaganda agunerent the person of Mohammad (peac Icce pon him) is not succeeding as if ought to have succecded in the face of the printed word, spoken broad cost, and shown pictores. We do not know what will happen if Islam had at its dispusal the seme means and resources as

the christicn and communist missionarries, but it is afact that Islam is spreading even in both the christicn and commun--ist west with astionishing rapi--dity. An the thirty years sinc - the end of second great was England bas built over a hundred mosques; france is not ligging for behind, germiny ~~ne~~ thor. Conversions amung Amarican whires are not less. These converts are found among ambassadors, protessors, and mimbars of all imagaible pro--fessions. No, wounder hun--dreds of weshern foorists embrace Islam very year even in Islambol where religeons fervoor is not so great as in Anatohe"

یعنی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ پر دوستوں اور دشمنوں نے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہزاروں کتابیں لکھی ہیں یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بہت عظیم انسان تھے اگرچہ وہ اس لئے اسے پسند بھی نہیں کرتے کہ آپ کا مذہب ان کے مذہبوں کا حریف ہے، جن لوگوں نے دیدہ و دانستہ انھیں غلط رنگ میں پیش کیا ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے، وہ بھی درحقیقت بالواسطہ طور پر انھیں خراج عقیدت ادا کر رہے ہیں، وہ انھیں صرف اس لئے غلط رنگ میں پیش کر رہے ہیں کیونکہ انھیں خدشہ ہے کہ ان کی صحیح تصویر ان کے مذہبی ہم خیالوں کو گمراہ کرے گی جنھیں وہ آپ کے متعلق بے بنیاد کہانیاں بتا کر اسلام قبول کرنے سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے غدارانہ اور غیر دیانتدارانہ کام اب بھی جاری ہیں۔ لیکن یہ بات حیران کن ہے کہ جدید مغرب کے پاس بے شمار ذرائع کے باوجود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا شان کے خلاف یہ شدید پروپیگنڈہ اس طرح کامیاب نہیں ہو رہا ہے جس طرح یہ اخباری اشاعت، نشریات اور تصویروں کے پیش نظر ہونا چاہیئے تھا! اگر اسلام کے پاس بھی وہی ذرائع ہوں جو عیسائی اور کمیونسٹ مبلغوں کے پاس ہیں تو ہمیں معلوم نہیں کیا کچھ واقع ہوگا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ عیسائی اور کمیونسٹ مغرب میں بھی اسلام حیران کن سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تیئیس برسوں میں برطانیہ میں ایک سو سے زیادہ مساجد تعمیر کی گئیں۔ فرانس اس بارے میں پیچھے نہیں اور نہ ہی جرمنی کسی سے پیچھے ہے۔ سفید فام امریکیوں میں تبدیلی مذہب کے واقعات کم نہیں۔"

اسلام قبول کرنے والے یہ لوگ سفیروں، پروفیسروں اور تمام قابل ذکر و تصور پیشوں کے ممبروں میں سے ہیں، اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ استنبول میں بھی جہاں مذہبی جوش اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ اناتولیا میں ہے ہر سال سینکڑوں مذہبی سیاح اسلام کے دائرے میں آتے ہیں۔
انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اصلاحِ انسانی کی تاریخ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکتا اور بے نظیر انسان ہیں۔

"دنیا کی تمام مذہبی شخصیتوں میں سب سے زیادہ کامیاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔"

بہرحال اوپر جو کچھ پیش کیا گیا احاطہ مقصود نہیں یہ صرف مشتے نمونہ از خروارے ہے اور مقصد یہ ہے کہ ؏

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

ضروری اطلاع

ماہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں مفکر ملت، مفتی عتیق الرحمن عثمانی نمبر شائع کیا گیا ہے اس لئے دسمبر کا شمارہ منسوخ کردیا گیا۔
اس خصوصی شمارہ کی قیمت باسٹھ روپے ہے۔ آپ یہ زائد رقم ارسال کردیں تاکہ آپ کو یہ نمبر دسمبر کے شمارہ کے بدلے علیحدہ روانہ کردیا جائے

(ادارہ)

سنہ ۱۹۵۴ء
حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت وعصمت۔
تاریخ صقلیہ ، تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء
اسلام کا زرعی نظام ، تاریخ ادبیات ایران ، تاریخ علم فقہ ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اوّل
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء
ترجمان السنۃ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم ۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء
لغات القرآن جلد پنجم ، صدیق اکبرؓ ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم ، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء
لغات القرآن جلد ششم ، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات ، تاریخ گجرات ، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء
حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط ، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ، مصائب و رکون

سنہ ۱۹۶۰ء
تفسیر مظہری اُردو پارہ ۲۹ ۔ ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

سنہ ۱۹۶۱ء
تفسیر مظہری اردو جلد اول ۔ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط ۔ اسلامی کتب خانے ، عرب و ہند ،
تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء
تفسیر مظہری اُردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں ، معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

سنہ ۱۹۶۳ء
تفسیر مظہری اُردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ ، سرکشی ضلع بجنور ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اوّل

سنہ ۱۹۶۴ء
تفسیر مظہری اُردو جلد چہارم ۔ حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط ، عرب و ہند عہد رسالت میں ۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

سنہ ۱۹۶۵ء
ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر ۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء
تفسیر مظہری اُردو جلد پنجم ۔ رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

سنہ ۱۹۶۷ء
ترجمان السنۃ جلد چہارم ، تفسیر مظہری اُردو جلد ششم ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء
تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم ، تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

سنہ ۱۹۶۹ء
تفسیر مظہری اُردو جلد ہشتم ، تاریخ الفخری ، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء
حیات عبدالحیٔ ، تفسیر مظہری اُردو جلد نہم ، مآثر و معارف ، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء
تفسیر مظہری اُردو جلد دہم ، بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء
فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر ۔ انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
جمیل مہدی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

۱۹۴۰ء غلامان اسلام۔ اخلاق وفلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراط مستقیم (انگریزی)

۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج وزوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافت راشدہ"۔

۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظام حکومت۔ سیرۃ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافت بنی امیہ"

۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت (کامل)

۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے)

۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت۔ مسلمانوں کا عروج وزوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہو
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافت ہسپانیہ"۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافت عباسیہ اول"

۱۹۴۹ء قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات۔ حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافت عباسیہ دوم"۔ بصائر۔

۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر ومغرب اقصیٰ"۔ تدوین قرآن۔ اسلام کا نظام مساجد۔
اشاعت اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافت عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
ازسرنو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابت حدیث۔

۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیر سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

مدیر مسئول: عمید الرحمن عثمانی

شمارہ ۲	جمادی الثانی ۱۴۰۸ھ مطابق فروری ۱۹۸۸ء	جلد ۱۰۱

عمید الرحمن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس چھتہ شیخ منگلو میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

آہ جمیل مہدی

از محمد اظہر صدیقی

واحسرتا! کہ دل ہے بہت بے قرار آج
سینے میں چبھ گئی ہے کوئی نوک خار آج

دل میں درد ہے، روح مضطرب اور بے چین ہے، قلم پر لرزہ طاری ہے، زبان وبیان کی دم بخود اور مردہ ہے، نبض حیات ڈوبتی ہوئی معلوم ہو رہی ہے کہ میرے گذشتہ تیئیس سال کے قابل بزرگ مگر بے تکلف رفیق اور ہمدم ودمساز ـ بھائی جمیل مہدی (مدیر روزنامہ عزائم لکھنؤ و ماہ برہان دہلی) ۱۳ر فروری ۱۹۸۸ء کی صبح کو ساڑھے سات بجے اس دار فانی سے دار البقا کو کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ وہ بہادر، بے خوف، جیالا بے باک وبے انسان، وہ صاحب طرز ادیب، وہ سراپا اخلاص وایثار صحافی، وہ دوستوں کا دوست، کا غمخوار، چھوٹوں کا مشفق ومربی، بزرگوں کی محفلوں میں باادب مگر بے لاگ انسان ہمیں جس کے دم سے قلم کی آبرو سلامت تھی، اردو صحافت کی عظمت قائم تھی، مولانا ظفر علی خاں مولانا ابو الکلام آزاد، غلام رسول مہر، مولانا محمد علی جوہر، مولانا عبد الماجد دریا بادی، مولا محمد عثمان فارقلیط کی پاکیزہ روایات کی پاسداری تھی، اردو میں دیانت دارانہ صحافت کا بھرم قائم آج کے خود غرضانہ ماحول، مفاد پرستیوں، ضمیر فروشیوں اور مصلحت اندیشیوں کے پُرہول سنا میں بھی جس کی ولولہ انگیز اور چونکا دینے والی تحریروں سے حق وصداقت کی بلند آواز گو اٹھتی تھی، افسوس وہ آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی جس کی بدولت ملت کے زریں عہد اور شاند

ں سے اس درماندہ، شکستہ اور چاروں طرف سے مہیب و مہلک خطروں سے گھرے ہوئے
ں کی تاریکیاں، روشنی کی کرنیں، عمل کی توانائیاں فکر و بصیرت اور تجربوں کی تجلیاں حاصل
تی تھیں۔

آج ملک و ملت کے افق پر زبردست انتشار و افتراق اور سنگین و نازک صورت حالات
ملتیں چھائی ہوئی ہیں، ایسے خوفناک وقت میں جبکہ طرح طرح کے طوفانوں، سیلابوں اور
لوں کی گڑگڑاہٹ چاروں طرف سنائی دے رہی ہے جمیل مہدی جیسے بے لاگ، بے خوف
بے لوث اور اس قدر دیانت دار اور زندہ کردار وضمیر کے حامل صحافی اور عقیدہ کے پختہ اور
شن فکر کے حامل انسان کی شدید ضرورت تھی۔ مگر ؎

ضرورت جتنی جتنی بڑھ رہی ہے صبح روشن کی
اندھیرا اور گہرا اور گہرا ہوتا جاتا ہے

جمیل مہدی نے انقلاب و حریت، علم و شریعت، دین و ہدایت کے سرچشمۂ صافی۔ دیوبند
تاریخی سرزمین پر جنم لیا، اس کی علم پرور فضاؤں میں عظیم و بے مثال علمائے کرام کی آغوشِ
بیت میں پرورش پائی اور یہیں قلم پکڑنا سیکھا، اپنی خداداد ذہانت، قدرت حافظ، کثرتِ
العہ اور محنتِ شاقہ کے طفیل ابتدا ہی میں ادب و افشار کی دنیا میں اپنا مقام پیدا
لیا، "نگار" جیسے شہرۂ آفاق ماہنامہ میں پہلی نگارش افسانہ کی شکل اور ان کے چھوٹے بھائی
روں نیازی کے نام سے شائع ہوئی، بمبئی کے ماہنامہ شاعر کے نائب مدیر اور روزنامہ
ہورت کے مدیر کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا، یہیں سے بحر ادب و انشاء کے
ں شناور کا رخ سیاست کی راہوں کی طرف مڑ گیا، اُس وقت کی مشہور سیاسی شخصیتوں
ے ربط وضبط پیدا ہوا، فلم اور ادب کی بڑی بڑی ہستیوں نے جمیل مہدی کی صلاحیتوں کا اعتراف
کیا، شکیل بدایونی، علی سردار جعفری وغیرہ سے بے تکلف دوستانہ تعلقات قائم ہوئے،

اس کے بعد بہت عرصہ تک دیوبند میں ہی قیام رہا، یہیں سے ایک سہ روزہ اخبار مرکز، جاری کیا
جس کے انقلاب انگیز اداریوں نے ایوان حکومت میں تہلکہ مچا دیا، ۱۹۶۲ء میں ہم لوگوں نے دیوبند
میں مجلس مشاورت قائم کی اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا جس میں مفکر ملت
مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ، مولانا منظور نعمانی، پنڈت سندرلال، مسٹر ایم این انور، جعفر امام،
ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور بہت سے اصحاب علم وفضل تشریف لائے، اس جلسہ کی کارروائی شروع
ہوئی اور تلاوت کلام پاک کے بعد بھائی جمیل مہدی نے ایک پرزور مگر طویل مقالہ پڑھنا شروع کیا،
ابھی مقالہ شاید نصف ہی پڑھا گیا تھا کہ جمعیۃ علماء کے ایک مخصوص گروہ کی طرف سے تخریب کاری
کے مقصد سے بھیجے گئے کچھ لوگوں نے جلسہ میں ہڑبازی شروع کی، اس پر قابو پا کر دوبارہ جلسہ کی
کارروائی شروع ہوئی تو پنڈت سندرلال نے ایسے پراثر انداز میں تقریر فرمائی کہ مجمع تڑپ تڑپ اٹھا،
لیکن اسی شرپسند گروپ کے کئی سو آدمی دارالعلوم دیوبند کے طلبار کے ساتھ دوبارہ بھیجے گئے اور
لوٹ مار، پتھراؤ، آتش زنی کا وہ ننگا ناچ ناچا گیا کہ تہذیب وشرافت اور عدل وانصاف کے سارے
تقاضے پامال ہو کے رہ گئے، حد یہ ہے کہ اکابر علمائے کرام مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ
ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی وغیرہ پر قاتلانہ حملوں کی کوشش کی گئی خاص طور سے حضرت مفتی صاحب کو
نشانہ بنایا گیا اور ان کے سر اور جسم پر چوٹیں آئیں، اس جلسہ پر حملہ بلاشک دیوبند کی تاریخ وتہذیب
کے دامن پر بدنما داغ تھا مگر اس واقعہ نے جمیل مہدی کو پورے طور پر سرگرم ہو جانے پر مجبور
کر دیا، کچھ عرصہ کے بعد ہی وہ لکھنؤ لائے گئے روزنامہ قائد میں بحیثیت مدیر کام شروع کیا،
کچھ عرصہ بعد قائد کی ادارت چھوڑ کر ندائے ملت سے وابستہ ہوئے اور پھر ۱۹۶۹ء میں خود اپنا
ہفتہ وار اخبار عزائم جاری کیا جس کو دس سال کے بعد روزنامہ میں تبدیل کر دیا گیا، درحقیقت
یہ اخبار جمیل مہدی کے خون دل وجگر سے سینچا ہوا ایک ایسا پودا ہے جس کی حفاظت،
بقا اور ترقی کی ساری ذمہ داریاں ان کی وفات کے بعد اب ان لوگوں کے کاندھوں پر
آگئی ہیں جن کو اردو صحافت کی صحت مند روایات، ایماندارانہ اظہار خیال، بے لاگ تبصرہ

اور ملک و ملت کے مسائل پر شعور و تجربہ کی پختگی کے ساتھ دیانتدارانہ اظہار خیال سے دلچسپی ہے اور جن کو جمیل مہدی سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے۔ یہ ہی ان کی روح کو بہترین نذرانۂ عقیدت ہے۔ خدا کرے عزائم زندہ رہے، باقی رہے، ترقی کی منزلیں طے کرے اور ملک و ملت کی خدمت و رہنمائی کا فرض انجام دیتا رہے، رب کریم دکار ساز مسٹر حسام صدیقی، عزیز علا‌ء مہدی سلمہ، اور دوسرے اراکین ادارہ عزائم کو حوصلہ، ہمت اور استقامت عطا فرمائے اور ان کو عزائم کی بقا کے لئے قدم قدم پر کامیابیوں اور اپنی نصرتوں سے نوازے۔ (آمین)

جمیل مہدی صرف ایک نثر نگار، صرف ایک صحافی اور صرف ادیب ہی نہ تھے بلکہ وہ خود ایک عہد، ایک تاریخ اور ہماری ان روایات اور قدروں کے ترجمان، نشان اور علامت تھے جو ہماری تاریخ ملی کی جان، آبرو اور وقار ہیں۔ وہ بہت لکھتے تھے، بے تحاشہ اور بے تکان لکھتے تھے مگر اس کے باوجود بہت خوب بلکہ خوب تر لکھتے تھے، ان کی تحریر ہی میں بلکہ ان کی رگ رگ میں ملت کا درد بے کراں، بے پایاں اور گہرا درد موجود تھا۔ سوز و تڑپ کی ایک جانگداز کیفیت سے فکر و احساس اور شعور و جذبات معمور تھے۔ ان کے قلب و دماغ اور عزم و حوصلہ نے کسی بڑی سے بڑی شخصیت سے کسی طرح اور کسی قیمت پر مرعوب ہو جانا سیکھا ہی نہ تھا، اصولوں پر سمجھوتہ ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ ان کی زندگی ریب و ریا سے کوسوں دور اور مصلحت اندیشی سے پاک تھی، ان کا قلب ایسا صاف و شفاف آئینہ تھا جس میں بھلے برے، کھرے کھوٹے، سچ اور جھوٹ کا عکس نمایاں طور سے دکھائی دیتا تھا۔

اکابر دیوبند، علمائے کرام مثلاً شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبید اللہ سندھی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، حکیم الاسلام

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور دوسرے بزرگوں سے ان کا تعلق ہمیشہ ادب و احترام کا رہا اور ان ہی بزرگوں کے سایہ میں ان کے فکر و شعور کی نشو و نما ہوئی۔ مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے سانحۂ ارتحال پر جو اداریہ انھوں نے عزائم میں لکھا تھا وہ ان کے تعلق خاص کے ساتھ ساتھ حق پسندی، بے باکی، آزادیٔ فکر اور ان کے مخصوص اسلوب نگارش کا عظیم، خوبصورت، پُر اثر نمونہ تھا، حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی سے ان کے والد بزرگوار کا بھی تعلق رہا اور مرحوم بھائی جمیل مہدی بھی حضرت مفتی صاحب سے بہت قریب تھے، یہ ہی قربت و عقیدت تھی کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کے انتقال کے بعد سے وہ برہان کی ادارت بڑے خلوص کے ساتھ کر رہے تھے، ان کی وفات راقم الحروف کا ذاتی صدمہ اور نقصان تو ہے ہی لیکن قبلہ مفتی صاحب کی علمی امانت (جس کی حفاظت و بقا ہم تمام خدام ہی کا فریضہ ہے) یعنی ماہنامہ برہان کو بھی اس سے زبردست دھکا لگا ہے، برادر عزیز عمید الرحمٰن سلمہٗ پر اس حادثہ کا قدرتی طور پر بہت اثر ہے، حق تعالیٰ شانہٗ ہم کو اس علمی یادگار 'برہان' کی خدمت و حفاظت کی توفیق بخشے اور ہماری مدد فرمائے۔ آمین۔

جیسا کہ قارئین کے علم میں آچکا ہوگا کہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں دمہ کے شدید و پریشان کن اور پرانے عارضہ کے علاج کے لئے ان کو بلرام پور ہسپتال (لکھنؤ) میں داخل کرایا گیا لیکن جب دیکھا گیا کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والا معاملہ ہے تو ڈاکٹروں کے مشورہ سے انھیں دہلی لایا گیا، چند روز کے علاج کے بعد کچھ افاقہ بھی محسوس ہونے لگا تھا مگر ۱۲ر فروری کو قلب کا دورہ پڑا تو ان کو رام منوہر لوہیا ہسپتال میں منتقل کیا گیا اور ۱۳ر فروری کی صبح کو ساڑھے سات بجے اچانک وہ آواز بند ہوگئی جس کی گھن گرج سے بڑے بڑے

(باقی صفحہ ۱۲۰ پر)

مولانا واصف دہلویؒ

(ایک تاثر)

ڈاکٹر گلزار نسیم تشنی دہلوی

مدت کے بعد ہوتے ہیں پیدا کہیں وہ لوگ
مٹتے نہیں ہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی

(گلزار دہلوی)

مولانا مفتی حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی مرحوم بھی ہمیں چھوڑ کر مغفور ہوئے۔ اردو اور دلی ایک اور مایۂ ناز سپوت سے محروم ہو گئی۔ وہ ایسے خانوادے کے چشم و چراغ تھے جس نے بیسویں صدی میں دینی بصیرت، ملی دردمندی، علمی سیرابی، ادبی و لسانی تزئین و تدوین اور ملک و قوم کی وطن پرستانہ، مشترکہ اور جمہوری روایات کو خونِ جگر اور خونِ قلم سے یکساں مزین کیا تھا۔

مولانا واصفؒ، ابو حنیفۂ ہندی، مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کے فرزندِ ارجمند تھے۔ مفتی کفایت اللہؒ نے نہ صرف مسلمانوں میں اسلام کو سنوارا، نکھارا اور ابھارا، اور مسلمانوں کی عام پسماندگی، جہل و لاعلمی، توہمات، اور

شرک و بدعت کو دُور کیا، اور کتاب و سُنّت کو اور قال اللہ اور قال الرسولؐ کو،
قرآن اور احادیث نبویؐ کو عام فہم انداز میں، صحیح صحیح عوام تک پہنچایا، بلکہ اپنے سینکڑوں
ہندو اور غیر مُسلم عقیدت مندوں کو اپنے علم و کردار سے متاثر کیا اور بیشتر سیاسی
سماجی، معاشرتی، جماعتی اور قومی موضوعات پر آگاہ، آسودہ اور قائل
معقول کیا۔

آپ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے اُن جانشینوں اور شیخ الاسلام
حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ان ساتھیوں میں سے تھے جنھوں نے ہندوؤں
اور مسلمانوں کو، تمام دنیائے اسلام کو اور مغربی فرنگیوں اور برطانوی سامراج کو یہ بتایا
"مِلّت بنتی ہے دین سے، اور قوم بنتی ہے ملک سے" اور حُبّ الوطنی جزو ایمان ہے
مغربی برطانوی سامراجی استبداد سے لڑنا، برادرانِ وطن کا ساتھ دینا، اور
راسخ العقیدہ مسلمان رہنا، اس میں کوئی تضاد یا ٹکراؤ نہیں ہے۔ انھوں نے
بہ بانگ دُہل کہا کہ ہم سچے پکّے مسلمان بھی ہیں، سچے پکّے وفا کیش ہندوستانی
بھی ہیں اور سچے پکّے انسان بھی ہیں۔ عالمگیر امن، جہانگیر دوستی اور آفاقی اخوت
کے جذبہ کے ساتھ غلامی سے نجات پانا اور ساتھ ہی ساتھ سچّے دین کی تعلیم کو عام کرنا
اُن کا منشور اور تعلیم کا نچوڑ تھا۔

اسی لئے مفتیٔ اعظم ساری زندگی اسلام اور انسانیت کی فلاح کے لئے بھی کام
کرتے رہے، سامراج سے ٹکراتے بھی رہے، قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلتے
رہے اور انڈین نیشنل کانگریس، جمعیۃ العلمائے ہند کے لئے یکساں و مساوی
تگ و دو بھی کرتے رہے ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن

وہ اس کی سراپا مصداق و مثال تھے۔ علم فقہ میں اُن کا ثانی نہ تھا۔ وہ بے مثال مجتہد اور فقیہہ اعظم تھے۔ سیاسی شعور اور سوجھ بوجھ کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۱۷ء سے تقریباً سنہ ۱۹۴۲ء تک وہ اے آئی سی سی کی اکثر تجاویز، منشور، اور کارروائیاں بے ساختہ اور برجستہ اور قلم برداشتہ پہلے اردو میں تحریر فرماتے تھے، پھر اس کے انگریزی اور دیگر زبانوں میں تراجم کیے جاتے تھے۔

عالم اسلام میں جب "سعودی عرب" دنیا کی سب سے بڑی اسلامی کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تو بڑے بڑے عالم اسلام کے عرب و عجم کے علمائے دین، اور اکابر، بیز جلالت الملک پاسبان حرمین شریفین، سلطان عزیز السعود بھی آپ کی پیشوائی کو کھڑے ہو گئے اور آپ کو مسند صدارت پر اپنے قریب جگہ دی۔

آپ نے ساری زندگی شریعت کے عین مطابق اور سیرت و سنتِ رسولؐ کے عین موافق گذاری، محنت اور اکلِ حلال سے زندگی گذاری۔ مدرسہ امینیہ کی بنیاد رکھی، کتب خانہ رحیمیہ قائم کیا، اور لاتعداد عالم دین اور مجاہدین قوم پیدا کیے۔

اُن کے جانشین و فرزند تھے حضرت مولانا مفتی حفیظ الرحمٰن واصف دہلوی، مولانا واصفؒ شعر و سخن میں ابوالمعظم نواب مرزا سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی جانشین و دامادِ داغ کے شاگردِ رشید بلکہ جانشین تھے۔ عربی و فارسی کے منتہی تھے، صرف و نحو، زبان و ادب، عروض و قوافی، معائب و محاسنِ سخن، روزمرہ، محاورات اور ٹکسالی اردو و ٹھیٹھ بولی پر قادر تھے۔

اپنے استاد نواب سائل سے شستہ مذاقِ سخن، شئے لطیف، ذوقِ جمالیات زبان کی شوخی و چونچلے اور فنِ شاعری کا بھرپور اکتساب کیا۔ آپ کی عربی دانی اور مذہبی و دینی شغف، کبھی آپ کی شاعری میں زاہدِ خشک اور کٹر ملاپن لے کر داخل نہ ہو سکا۔ آپ اس معاملے میں وسیع المشرب، روشن دماغ، کشادہ ذہن، رواداد

اور وسیع القلب واقع ہوئے تھے، اپنی ذات سے ہمہ صفت موصوف ، با اخلاق
مرنجاں مرنج، گوشہ نشین وکم آمیز، کم گو اور شریف الطبع انسان تھے۔ دین کے طالب علم
کی دینی پیاس بجھاتے اور فرصت کے اوقات میں ادب کی تخلیق کرتے۔ شعر کہتے
مضامین سپردِ قلم کرتے، زبان کی اغلاط اور اصلاحوں پر توجہ دلاتے۔ تلفظ، لب ولہجہ
لغات کا صحیح محلِ استعمال، محاورہ کا بروقت و بامزہ برتنا، اور مروّجہ محاورے، روزمرہ
سلاست وفصاحت کی غلطیوں کی نشان دہی کرتے رہتے تھے۔ املا، انشار، عبارت
آرائی، فعل، فاعل، مفعول کا مناسب جگہ استعمال وترتیب، حاصل مصدر اور صفات کا
موزوں سیاق اور قرینہ، زبان، محاورے، اور الفاظ کے تابع مہمل اور ماقبل و مابعد
برجستگی پر ان کی گہری نظر تھی جو وہ کبھی کبھی اپنے مضامین میں لکھ کر زبان کے طالب علموں اور
ادیبوں، شاعروں، دانشوروں کی اصلاح وتنظیم کا بھی فریضہ انجام دیتے
رہتے تھے۔

انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت اور پرورش میں اور جملہ دیگر
دینی ودنیوی نشوونما میں، عربی وفارسی کے ساتھ ساتھ، انگریزی، اردو اور ہندی کو
مساویانہ اہمیت اور جگہ دی۔ اپنے اسلاف کے سرمایہ سے بھی انھیں مالامال کیا،
موجودہ معاشرے کے جدید تقاضوں سے بھی آگاہ رکھا اور جدید تعلیم سے بھی آراستہ و
پیراستہ کیا۔

مدرسۂ امینیہ کی ذمہ داری کے بعد تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی منہمک اور
مشغول رہے۔ بے شمار دینی، ادبی اور تہذیبی کتب ترتیب دیں اور نشر واشاعت سے
بھی غافل نہ رہے۔

آپ کی زبان مستند اور فصیح تھی۔ داغ اسکول کے عظیم نمائندہ تھے۔ زبان میں
داغ، بیخود وسائل، نوح اور علامہ زار کو اپنا آئیڈیل یا آدرش سمجھتے تھے۔

مولانا واصف دہلوی کی چند مقبول تصانیف وتالیفات مندرجہ ذیل ہیں جو
زیور طبع سے آراستہ ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

۱۔ کفایت المفتی کامل نو جلد (مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ کے فتاوی کا مجموعہ)
۲۔ مفتی اعظم کی یاد
۳۔ درس الاسلام (منظوم تعلیم الاسلام)
۴۔ اردو مصدر نامہ
۵۔ سہ لسانی مصدر نامہ
۶۔ زرگل (مجموعۂ کلام واصفؒ)
۷۔ ادبی بھول بھلیاں (تحقیق وتنقید)
۸۔ تذکرۂ سائل
۹۔ قرآنی پند نامہ
۱۰۔ مطلقہ کی شرعی حیثیت
۱۱۔ عقیدہ اور رواداری
۱۲۔ جمعیۃ علماء پر تاریخی تبصرہ
۱۳۔ مدرسہ امینیہ کی مختصر تاریخ
۱۴۔ مدرسہ حسین بخش کا تعارف
۱۵۔ قصہ بلی کا (فارسی نظم کا اردو منظوم ترجمہ)

اور اس کے علاوہ کچھ کتابیں، مضامین، کلام اور دیگر یادداشتیں غیر مطبوعہ ہیں جو
توقع ہے کہ جلد شائع ہو کر منظر عام پر آجائیں گی۔

مولانا واصف نے تقریباً ۸۰۔ ۹۰ برس کی بھرپور عمر پائی اور آخر وقت تک
فعال و متحرک اور قابل رشک دینی، مذہبی اور ادبی زندگی گذاری۔ مولانا واصف

نمود و نمائش، صلہ و ستائش اور حکام رسی سے ہمیشہ دور رہے۔ ایک خاموش او
عالمانہ و بزرگانہ پاکیزہ زندگی گذاری، جو آج کی نسلوں کے لئے قابل فخر اور باعث
تقلید تھی۔ آپ ۱۳ مارچ ۸۷ء کو بعد سہ پہر ہم کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے کر
داعی اجل کو لبیک کہکر واصل حق ہوئے اور دار باقی میں، جنت الفردوس میں تشریف
لے گئے۔ خدا ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ان کی قبر پر تاقیامت باران ر
فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم ایسے کم مایہ لوگوں کو ان کی زندگی کو
اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان کی موت میرا ذاتی نقصان بھی ہے۔ میں ۳۹-۴۲ء سے نواب سائل چچا استا
کے ساتھ مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ مرحوم کے بالا خانہ پر اور اردو بازار جامع مسجد
دلی میں، ان کے قائم کردہ کتب خانہ رحیمیہ میں باقاعدگی سے جایا کرتا تھا۔ اور دن میں
۲ دو بار تو یوں بھی ۱۹۳۹ء — ۱۹۴۲ تک اسکول آتے جاتے مولانا واصف سے
سلام کرتا ہوا جاتا تھا، ۱۹۳۹ سے بالعموم اور ۱۹۴۳ سے بالخصوص کتب خانہ عزیز
مفتی اعظمؒ کے خویش اور مولانا واصف کے بہنوئی حضرت مولانا سمیع اللہ قاسمیؒ کی
دکان پر، اپنے احباب کے ساتھ میری نشست تھی، جہاں شکیل بدایونی، محشر بدایونی
آغا طاہر، حکیم کامل خاں، مولانا احمق پھپھوندوی، مولانا عبداللہ فاروقی اور
اُس دور کے نوجوان اور مشاہیر شعراء کی نشست تھی۔

چنانچہ اُردو بازار کے علاقہ میں ہماری نشست و برخاست اور شرکت و اکتساب
اور تفریح و جولانی ادب کے جو چند مرکز تھے، اُن میں کتب خانہ رحیمیہ اور کتب خانہ
عزیزیہ کو خاص طرۂ امتیاز تھا، حضرت خواجہ حسن نظامیؒ کا اُردو گھر (جہاں اب
آزاد ہند ہوٹل اور قدیم مسلم ہوٹل وغیرہ قائم ہے)۔ مولانا راشد الخیری کی دُکان اور
نشست گاہ، شاہد احمد صدیقیؒ کے رسالہ ساقی کا مرکز اور نذیریہ بک ڈپو،

مولانا واصف اور مولانا سمیع اللہؒ کی دو کانیں، نگارستان ایجنسی اور چمنستان ماہنامہ کا دفتر اور دکان، آغا شاعر قزلباشؒ کے صاحبزادگان آغا آفتاب اور آغا سرخوشؒ کے مرکز، جہاں صابر دہلوی، راز مراد آبادی، جمیل الدین عالی وغیرہ حضرات رونق افروز ہوتے تھے۔ اور گلی ملیا محل میں پروفیسر خواجہ عبدالمجید مؤلف ضرب الامثال دلی اور ان کے فرزند، بلبل ہزار داستان، ادیب شہیر، خواجہ محمد شفیع دہلوی کی اردو مجلس کے مرکز تھے۔ اور پنڈت امرناتھ مدن ساحر، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، اور نواب سائلؒ کے دولت کدوں اور ادبی نشستوں کے علاوہ، ہمیں ۱۹۴۰ء کے بعد، مندرجہ بالا احباب کے ادبی مرکزوں تک ہی جانے اور اٹھنے بیٹھنے کی اجازت تھی، جو پنڈت ساحر کی بزم سخن دلی کے بعد اپنی دوسرے درجہ کی ادبی اہمیت کے لئے مشہور تھے، گویا اردو بازار جامع مسجد کا جانا حضرت مولانا حفیظ الرحمٰن واصف مرحوم سے ساری زندگی کا ملاقات کا واسطہ تھا جو ۱۹۳۹ء کے بعد اب ان کے انتقال ۱۹۸۷ء تک باقاعدہ جاری رہا۔ اور اب اُن کے فرزند اور مولوی سمیع اللہ کے فرزند، دونوں خاندان کے چشم وچراغ، یعنی مفتی کفایت اللہؒ کے پوتے اور نواسے دونوں اسی مروّت اور محبت و ارادت سے ملتے ہیں اور عزت کرتے ہیں، جس کی اُن سے توقع کی جاسکتی ہے۔

اب مولانا واصف دہلوی شاہ ولی اللّٰہی قبرستان مہندیان، نئی دلی میں تاریخی عمائد واکابر کے ساتھ آسودۂ خاک ہیں، جہاں ہم نے اس سے پہلے مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اصحاب کو بھی سپردِ خاک کیا تھا۔

مولانا عبدالحفیظ مکی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے خلیفہ ہیں، جو اتفاقاً واصف صاحب کی تجہیز وتکفین اور تدفین میں بھی شریک ہو سکے کہ اچانک اُن کا دلی آنا ہو گیا تھا۔ نماز جنازہ بھی انھوں نے ہی پڑھائی۔

مولانا واٰصف ہمارے پیر بھائی تھے ۔ میں نے نثار صاحب اور کیفی صاحب کے علاوہ جن لوگوں سے کچھ سیکھا اور علم وادب میں فیضان حاصل کیا ان میں مفتی اعظمؒ اور نواب سائلؒ دونوں ہستیاں شامل ہیں ، جن سے میں نے کچھ حاصل کیا اور وہ ان دونوں کے جانشین تھے گویا آج میرے لئے وہ سب ہستیاں بھی مولانا واٰصف کے ساتھ آج ہی اٹھیں، جو ان کے دم سے ہمارے لئے زندہ تھیں۔ سوائے دعا اور شکر وصبر کے چارہ ہی کیا ہے۔ مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ ۔ خدا اُن کی مغفرت فرمائے۔

الواح الصنادید

(پروفیسر محمد اسلم، شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور)

سر شیخ عبدالقادر مدیر مخزن کی قبر سے دس میٹر جانب شمال مشرق مشہور شاعر احسان دانش کی قبر ہے۔ اُن کی قبر کا ذکر پہلے الواح الصنادید میں آچکا ہے لیکن اُس وقت اس پر کتبہ نصب نہیں تھا، اب ان کی قبر پر کتبہ لگ گیا ہے اور اس پر یہ عبارت منقوش ہے:

یا اللہ　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　یا محمدؐ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

شاعر مزدور

حضرت احسان دانشؒ

مرید خاص حضرت حافظ تفضل حسینؒ

(معروف بہ بھگڑے[1] والے پیر)

تاریخ وفات ۲۲ مارچ ۱۹۸۲ء

---

[1] میرے خیال میں صحیح لفظ بگھرہ (ضلع مظفر نگر) ہونا چاہیئے۔

دانش میں خوفِ مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنّت حضورؐ کی

احسان دانش کی ابدی آرام گاہ سے چالیس میٹر جانب جنوب ان کی والدہ مرحومہ محوِ خواب ابدی ہیں۔ ان کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

مرقد

والدہ شاعرِ مزدور احسان دانش

۱۹۵۸ء

حضرت مولانا احمد علی لاہوری قدس سرہٗ کا ذکر الواح الصنادید میں ہوچکا ہے۔ اس وقت اُن کی قبر پر کتبہ نہیں لگا تھا۔ موصوف امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے شاگردِ رشید اور داماد تھے۔ انھوں نے حضرت سندھیؒ سے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تعلیمات کی روشنی میں قرآن حکیم کا درس لیا اور اِسے عام کیا۔ ان کی قبر آغا حشر کاشمیری اور خواجہ عبدالحئی فاروقی کی قبروں سے تین چار میٹر جانب جنوب مشرق ہے۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

تربت

شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ وصال ۱۷ رمضان المبارک سنہ ۱۳۸۱ھ

مطابق ۲۳ فروری سنہ ۱۹۶۲ء بروز جمعۃ المبارک

حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی قبر سے متصل جانبِ قبلہ اُن کے فرزند ارجمند
[مولا]نا عبید اللہ انور قدس سرہٗ کی آخری آرام گاہ ہے۔ مرحوم راقم الحروف پر بڑے
[مہرب]ان تھے اور کبھی کبھی میرے غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر میری عزت بڑھایا کرتے
[تھے۔] اُن کے لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

یا حی یا قیوم

موت العالِم موت العالَم

مرقد اطہر

جانشین شیخ التفسیر امام الہدیٰ

حضرت مولانا عبید اللہ انورؒ

وفات ۵ر شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ

ان حضرات کی قبروں سے پندرہ سولہ میٹر جانب شمال مشرق میاں محمد شفیع کی ابدی
[آرا]م گاہ ہے۔ مرحوم لاہور اور ملتان کے ڈپٹی کمشنر رہے ہیں۔ انھوں نے "۱۸۵۷ء"
[کے عنو]ان سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جو ۱۹۵۷ء میں جنگ آزادی ......
[کی ص]د سالہ تقریب کے موقع پر شائع ہوئی تھی۔ ان کی قبر کے کتبے پر یہ عبارت
[کندہ] ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

آخری آرام گاہ

میاں محمد شفیع ستارۂ خدمت

سکریٹری منصوبہ بندی مغربی پاکستان

تاریخ ولادت ۱۰ر فروری سنہ ۱۹۱۰ء

تاریخ وفات ۱۵ر دسمبر سنہ ۱۹۶۶ء

گذر گیا ہے چمن سے مثالِ ابرِ بہار

روش روش پہ نئے گلستاں کھلائے ہوئے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم

تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے

ابوسعید انور کی قبر سے پندرہ بیس میٹر جانب شمال مشرق مدرسۃ البنات جالندھر و لاہور کے بانی مولانا عبدالحق عباس محو خواب ابدی ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

ترجمہ: اے مطمئن روح تو اپنے رب (کے جوار رحمت) کی طرف لوٹ چل کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔ پھر تو میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

آغا جی مولانا عبدالحق عباس

بانی

مدرسۃ البنات

تاریخ پیدائش ۶ر اپریل سنہ ۱۸۸۲ء

تاریخ وفات یکم اپریل سنہ ۱۹۶۰ء

شمس العلماء علامہ احسان اللہ خاں درانی تاجور نجیب آبادی کے مزار کا ذکر
[ا]ح الصنادید میں ہو چکا ہے لیکن اُس وقت ان کی قبر پر کتبہ نصب نہیں تھا۔ میں نے
[ا]ن کی قبر کی نشان دہی کی تو جناب عبد الصمد صارم نے اس پر کتبہ لگوا دیا لیکن تاریخ
[در]ج کروانے میں غلطی ہو گئی۔ علامہ صاحب کا انتقال ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء کو صبح
[سا]ڑھے چار بجے ہوا تھا اور راقم الحروف نے ان کی نماز جنازہ اور تدفین میں
[شر]کت کی تھی۔ روزنامہ نوائے وقت بابت یکم فروری ۱۹۵۱ء میں بھی یہی تاریخ اور
[وق]ت درج ہے۔

علامہ تاجور نجیب آبادی بڑے اونچے پایہ کے شاعر تھے۔ احسان دانش،
[پنڈ]ت ہری چند اختر اور میلا رام وفا کا شمار ان کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ علامہ
[مرح]وم کا یہ شعر تو ضرب المثل بن چکا ہے:

نہ تم بدلے نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیونکر اعتبار انقلابِ آسماں کر لوں

ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

مرقد
شمس العلماء علامہ تاجور نجیب آبادی
۲۹ جنوری ۱۹۵۱ء

غازی علم الدین کے احاطۂ مزار کے شمال مشرقی کونے میں شیخ عطاء اللہ کی
[آخ]ری آرام گاہ ہے۔ موصوف مرے کالج سیالکوٹ میں پڑھا چکے ہیں۔ انھوں نے
[ار]دو زبان میں اقتصادیات کے موضوع پر سب سے پہلی کتاب لکھی تھی۔ ۱۹۴۲ء
[میں] انھوں نے علامہ اقبال کے خطوط جمع کرنے پر توجہ دی اور اس کام کو بڑے سلیقے

سے انجام دیا۔ ان کے فرزند ارجمند مختار مسعود لاہور ڈویژن کے کمشنر رہ چکے ہیں
کے مزار کا کتبہ فن خطاطی کا شاہکار ہے۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم خط طغرٰی میں
قرآنی آیت و دعا خط ثلث میں اور مرحوم کا نام اور تاریخ وفات خط نستعلیق میں
ہیں۔ کتبے کی عبارت یوں ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ وقنا
عذاب النار
وادخلنا الجنۃ مع الابرار یا عزیز یا غفار
یارب العالمین
شیخ عطاء اللہ مرحوم ومغفور
وصال ۲۷ اپریل ۱۹۶۸ء بعمر ۷۲ سال
لگا ہے یا رسول اللہ لگا ہے

غازی علم الدین کی قبر سے ۲۵ میٹر جانب جنوب، محمد مالک شہید
قدموں میں ایک بلند چبوترے پر لاہور کے معروف عالم دین مف
غلام جان ہزاروی کی ابدی آرام گاہ ہے۔ ان کے لوح مزار پر عبا
کندہ ہے:

یا اللہ جل جلالہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۷۸۶
۹۲
بسم اللہ الرحمن الرحیم
موت العالِم موت العالَم

مرقدِ منوّر

فاضل اجل مفتی اعظم قبلہ عالم حضرت علامہ ابوالمظفر مولانا محمد غلام جان

قادری رضوی ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ

خلیفۂ مجاز

امام اہلسنت اعلحضرت مجدد دین وملت حضرت مولانا محمد احمد رضا خاں

قادری بریلوی قدس سرہ

تاریخ وصال

در بست و پنج محرم بگذشت زیں جہان

اسم شریف اورا مفتی غلام جان

در سال سیزدہ صد و ہفتاد و نُہ بروز

شنبہ بُوقت نیم ویک شد داخل جنان

۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۹ھ

یکم اگست ۱۹۵۹ء

پسران

محمد مظفر اقبال ۔ محمد اشرف ۔ غلام صابر ۔ غلام مصطفیٰ

میانی صاحب کے جس خطے میں عابد علی احمد اور عبدالعزیز فلک پیما کی قبریں ہیں، اسی خطے میں حضرت نذر محی الدین قادری فاضلی بٹالوی کے روضہ سے ۳۰ میٹر جانب مغرب ڈاکٹر سید ظفر الحسن محو خواب ابدی ہیں۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کو اُن سے شرفِ تلمذ ہے بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ پاکستان میں فاروقی صاحب ان کے افکار کے سب سے بڑے ترجمان ہیں۔ سید صاحب کے لوحِ مزار پر یہ

عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کل نفس ذائقۃ الموت

مرقد الحاج ڈاکٹر سید ظفر الحسن

(ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی فل)

(ابن خاں صاحب سید دیوان محمد رئیس کھرڑ ضلع انبالہ)

پروفیسر فلسفہ و صدر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

تاریخ وفات دوشنبہ ۲۲ر شعبان سنہ ۱۳۶۸ھ

مطابق ۱۹ر جون سنہ ۱۹۴۹ء

اللھم اغفر لہ و ارحمہ۔ آمین

ڈاکٹر سید ظفر الحسن کی قبر سے متصل جانب قبلہ اُن کے خسر اور مشرقی پنجاب کے مشہور سیاست دان اور تبلیغی جماعت کے روحِ رواں سید غلام بھیک نیرنگ کی قبر ہے۔ جس زمانے میں سوامی شردھانند نے شدھی تحریک کا ڈول ڈالا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد الیاس کاندھلوی، خواجہ حسن نظامی اور غلام بھیک نیرنگ مسلمانوں کو ارتداد سے بچانے پر کمربستہ ہو گئے۔ غلام بھیک نیرنگ نے انبالہ سے "تبلیغ" کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری کیا، جس کے چند پرچے راقم الحروف کی ذاتی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے:

۷۸۶

تلک الدار الآخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون علواً فی الارض ولا فساداً والعاقبۃ للمتقین

مرقد

الحاج سید غلام بھیک نیرنگ عفا اللہ عنہ

(خلف سید قاسم علی ترمذی رضوی غفرلہ ساکن دورانہ ضلع انبالہ)

وکیل انبالہ ناظم عمومی جمعیۃ مرکزی تبلیغ الاسلام انبالہ شہر

وممبر مرکزی اسمبلی ہندوستان وممبر مجلس دستور ساز پاکستان

تاریخ وفات ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۲ء

مطابق ۲۶ محرم الحرام ۱۳۷۲ھ

مادہ تاریخ وفات

میر غلام بھیک نیرنگ پارسا

۱۹۵۲ء

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

سید ظفر الحسن کے سرہانے، ان کے قریبی عزیز اور سید غلام بھیک نیرنگ کے برادرزادے سید محمد قاسم رضوی مدفون ہیں۔ ان کے لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یاحی یاقیوم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اللھم صل وسلم وبارک علی سیدنا ومولنا وحبیبنا محمد النبی الامی

وعلی الہ واصحابہ وعترتہ بعدد کل معلوم لک وبعدد

خلقک ورضی نفسک وزنۃ عرشک ومداد کلماتک

استغفر اللہ الذی لا الہ الا ھو الحی القیوم واتوب الیہ

اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم لا تاخذہ

سِنۃ ...... وھو العلی العظیم

سید محمد قاسم رضوی

وفات ۶ر جون ۱۹۷۵ء لاہور

خدا مغفرت کرے

لوح مزار کے علاوہ ان کی قبر کے تعویذ پر یہ عبارت درج ہے:

سید محمد قاسم رضوی

زمانہ طالب علمی

پنجاب اور پاکستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سرگرم کارکن

زمانہ ملازمت

ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ و لائل پور

کمشنر سرگودھا ڈویژن

ڈائریکٹر سول سروس اکیڈمی لاہور

وفات

۶ر جون ۱۹۷۵ء لاہور

خدا مغفرت کرے

میانی صاحب کے خطہ باغ گل بیگم میں پروفیسر محمد شجاع الدین کا مزار ہے۔
موصوف نامور مؤرخ سید عبدالقادر کے شاگرد رشید اور دیال سنگھ کالج لاہور

میں تاریخ کے استاد تھے۔ انھوں نے اپنے استاد گرامی کے ساتھ مل کر تاریخ ہند و پاکستان اور تاریخ اسلام لکھی تھیں جو انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں شامل تھیں۔ مرحوم نے انگریزی زبان میں نور جہاں کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی اور اسرار احمدی کو بڑے سلیقے کے ساتھ مرتب کیا تھا۔ ان کے تحقیقی مضامین پاکستان کے اکثر علمی جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ قدیم لاہور کے بارے میں انھیں بہت معلومات تھیں۔ راقم الحروف کی توجہ پرانی عمارتوں اور قبروں کی طرف انھوں نے ہی دلائی تھی۔ میں نے طہماسپ نامہ کا انتساب ان ہی کے نام کیا ہے۔ ان کا انتقال شادی کے دو سال بعد ۴۲ سال کی عمر میں ہوا اور اولاد جیسی نعمت سے محروم رہے۔ ان کے لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

یا اللہ　　بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　یا محمد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مزار حسرت آیات:

پروفیسر شجاع الدین

پئے دیدار آیم بر مزارے　　توانم دید شاید آں نگارے
چرا در گِل روی اے گُل عذارے　　دلم سوزد دریں سینہ فگارے

زیر تہِ خاک آنکھوں کا نُور　　شادی کے جوڑے میں روتی ہے حُور
سینہ میں پنہاں جلتا ہوا طُور　　یہ کیا دکھایا یا رب غفور

انجام اور اتنا قریب　　دورِ جوانی کتنا مہیب
آہوں میں اشکوں میں ذکر حبیب　　کچھ بھی نہ کر پائے سارے طبیب

یہ آندھیاں اور ایسی بہاریں — کن کن کو ڈھونڈیں کن کو پکاریں
بڑی پیاری قدریں بنی یادگاریں — لٹا کرتی ہیں اس طرح کب بہاریں

کجا روز روشن کجا کالی رات — بڑا مختصر ہے فریبِ حیات
فریبِ نظر ہے حیات و ممات — جہانِ الم ہے یہ سب کائنات

(بیگم شجاع الدین) (محمودہ سوز)

عمر بیالیس سال

تاریخ وفات ۲۳ر رمضان ۱۴۰۴ھ

مطابق ۲۷ر جنوری ۱۹۶۵ء بوقت ۹ بجے صبح

گارڈن ٹاؤن لاہور کے قبرستان میں شاکر علی مصوّر کی قبر سے تیس میٹر جانب ش
اور مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش کی قبر سے تیس میٹر جانب مشرق ڈاکٹر محمد صادق کی ابد
آرام گاہ ہے۔ انھوں نے "محمد حسین آزاد، احوال و آثار" کے موضوع پر تحقیقی مق
لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انھوں نے
SEVEN ONE ACTS ، ریاض الادب ، "آبِ حیات کی حمایت میں
دوسرے مضامین"، آپ بیتی (غیر مطبوعہ) HISTORY OF URDU
LITERATURE ، ابوالاثر حفیظ (غیر مطبوعہ) اور NENTIETH
CENTURY URDU LITERATURE جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ ۱۹۸۵ء
میں نعیمہ منیر راؤ نے "ڈاکٹر محمد صادق، تحقیقی و تنقیدی مقالہ" لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے
ایم اے کی ڈگری لی ہے۔ نعیمہ راؤ کے خیال میں ان کی تحقیق میں کافی جھول ہے۔ ڈ
صاحب کے مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یا اللہ یا محمدؐ

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام

مرقد مطہر

جناب ڈاکٹر محمد صادق صاحب

تاریخ وفات

۱۷ جون سنہ ۱۹۸۴ء بطابق ۱۷ رمضان سنہ ۱۴۰۴ھ بروز اتوار

از جہاں سوئے جناں رفت محمد صادق — صاحب علم و ہنر بود عمیم الاحساں

زندگی کرد دلبر بہر فروغ علمی — شد زبان و قلمش فیض رساں بہر جہاں

درس و تدریس و تعلم بہ تصانیف لطیف — بہ ہمیں ذوق و تجسس سفر عمر رواں

جادۂ زلیست فروزاں شدہ از حسن عمل — منزلے یافت کہ باقیست ازاں جملہ نشاں

فضلِ حق شامل حال شفاعت ز رسول

گفت ہاتف کہ درین مغفرت و راہِ جناں

۱۹۸۴ء

ڈاکٹر محمد صادق، ڈاکٹر تصدق حسین خالد کے برادر بزرگ تھے اور مرحوم ٹیلی ویژن پر انٹرویو دیتے ہوئے حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئے تھے۔ اس منظر کو لاکھوں ناظرین نے پردہ سکرین پر دیکھا۔ ان کا انتقال ۸۶ برس کی عمر میں ہوا۔

پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کے قریب دار السلام کے نام سے لاہوری احمدیوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے اور ان کا اپنا قبرستان ہے۔ اس قبرستان میں شیخ عبد الرحمن مصری اور حکیم عبد الوہاب عمر ابن خلیفہ نور الدین بھیروی جیسے افراد مدفون ہیں۔ اسی

قبرستان میں مولوی صدر الدین، امیر جماعت احمدیہ (لاہوری گروپ) کی ابدی آرام گاہ ہے۔ مولوی صاحب، مولانا عبید اللہ سندھی، مولوی برکت اللہ بھوپالی اور اقبال شیدائی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جس زمانے میں یہ حضرات ترکی، امریکہ اور اٹلی میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے، مولوی صدر الدین برلن کی مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مولانا سندھی کے مکاتیب میں ان کا کئی بار ذکر آیا ہے۔ ان کی قبر پر جو لوح نصب ہے، اس پر یہ عبارت درج ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

رب اغفر وارحم وانت خیر الرّٰحمین

حضرت امیر قوم مولٰنا صدر الدین

تاریخ پیدائش

یکم جنوری ۱۸۸۱ء مطابق ۱۲۹۹ھ

تاریخ وفات

۱۵ر نومبر سنہ ۱۹۸۱ء بمطابق ۱۰ر محرم الحرام سنہ ۱۴۰۲ھ

مولوی صدر الدین کی اہلیہ کی قبر بھی اسی قبرستان میں ہے۔ ان کا انتقال مورخہ ۳۰ر جون ۱۹۷۹ء کو ہوا تھا۔ راقم الحروف نے مولوی صاحب کو اقبال شیدائی کے جنازے پر دیکھا تھا۔ جس وقت موصوف پہنچے اس وقت شیدائی صاحب کی نماز جنازہ ہو چکی تھی۔ مولوی صدر الدین نے چند ساتھیوں کے ہمراہ دوبارہ نماز جنازہ ادا کی۔ اقبال شیدائی حنفی العقیدہ مسلمان تھے۔ مولوی صاحب نے پرانے تعلقات کی بنیاد پر ان کے جنازے میں شرکت کی تھی۔

"الحصن المتین فی احوال الوزراء والسلاطین"

تاریخ اودھ اور سلاطین اودھ سے متعلق ایک نادر عربی مخطوطہ

جناب مسعود انور علوی کاکوروی، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

صوبہ اودھ کی تاریخ اور نوابین و امراء کے حالات و واقعات بہت سی فارسی اور انگریزی نیز اردو کتابوں میں اجتماعی و انفرادی صورت میں دستیاب ہوتے ہیں۔ فارسی میں ایسی بکثرت کتابیں ہیں جن کے مؤلف ان واقعات اور حالات کے چشم دید گواہ ہیں اسی وجہ سے تاریخ اودھ پر کام کرنے والوں کے لئے یہ فارسی مآخذ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے درج ذیل کسی نہ کسی وجہ سے کافی اہم وقیع ہیں:

۱۔ تاریخ فرح بخش ۔ منشی محمد فیض بخش علوی کاکوروی۔ عبدالسلام کلکشن مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ۔ مؤلف شجاع الدولہ کے عہد حکومت میں فیض آباد میں قیام پذیر تھے، اس وجہ سے انھوں نے اپنے چشم دید واقعات و حالات قلم بند کیے ہیں جو بہت اہم اور معاصر مآخذ کا درجہ رکھتے ہیں۔

۲۔ رسالۂ صبح صادق ۔ محمد صادق خاں اختر۔ عبدالسلام کلکشن۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ اس رسالہ کے مؤلف نے نظام حکومت اور اس دور کی سماجی برائیوں کا ذکر کیا ہے۔ معاصر ہونے کی بناپر امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد سلطنت پر تنقید بھی کی ہے۔ مخطوطہ

۱۵ر جمادی الثانی ۱۲۶۷ھ کا ہے

۳۔ مراۃ الاوضاع ۔ لال جی ۔ رضا لائبریری رامپور ۔ مؤلف کا ۱۸۲۹ء میں ایک وقائع نگار کی حیثیت سے لکھنؤ ریزیڈنسی میں تقرر ہوا۔ وہ اس عہدہ پر کتاب کی تکمیل یعنی ۱۸۵۴ء تک فائز رہا۔ اس میں سول، ملٹری اور مال گذاری نظام، دار السلطنت لکھنؤ کا ایک تفصیلی جائزہ اور ۱۸۲۹ء یعنی نصیر الدین حیدر کے عہد سے چشم دید واقعات تاریخ وار قلم بند کیے ہیں۔ اس مخطوطہ سے ریزیڈنسی اور حکومت اودھ کے باہمی تعلقات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے نیز مؤلف کی سوجھ بوجھ اور وقائع نگاری سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صحیح حالات سے پوری طرح آگاہ تھا۔

۴۔ تاریخ اودھ معروف بہ زبدۃ الکوائف ۔ جے گوپال ثاقب ۔ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری۔

۵۔ عمادت السعادت ۔ سید غلام علی ۔ یہ طبع ہو چکی ہے۔

ان مندرجہ بالا کتب کے علاوہ دیگر مآخذ بھی ہیں۔ اردو میں درج ذیل مخطوطے اہم ہیں:

۱۔ تاریخ آفتاب اودھ ۔ مرزا محمد تقی ۔ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری ۔ مخطوطہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے میں لکھنؤ اور فیض آباد نیز برہان الملک سے واجد علی شاہ اور انتزاع سلطنت تک کے حالات ہیں۔ دوسرے حصہ میں غدر کے حالات ہیں۔ تیسرے حصہ میں اودھ کے تعلقداروں کی ریاست کا حال نقشہ کی صورت میں ہے، اس کے مطالعہ سے ان کی ترقی اور تنزلی کی پوری کیفیت واضح ہو جاتی ہے ۔ مؤلف، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے عہد سے واقف تھا۔

۲۔ مرقع خسروی ۔ محمد عظمت علی نامی کاکوروی ۔ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری ۔ مؤلف سلطنت اودھ کے بیشتر اعلیٰ عہدے داروں سے مراسم رکھتے تھے۔ آخری شاہانِ اودھ

کے معاصر ہونے کی بنا پر اکثر واقعات ان کے چشم دید ہیں۔ چودہ ابواب پر منقسم ہے۔ برہان الملک سے واجد علی شاہ تک ایک ایک باب میں ہر نواب کے حالات ہیں۔ آخری چار ابواب میں ادبی و ثقافتی حالات اور دو ابواب میں ان حالات کا ذکر جو غدر اور انتزاع سلطنت کا پیش خیمہ تھے۔ مخطوطہ اہم ہے اور اس میں موجود مواد دوسری جگہ عام طور پر دستیاب نہیں ہوتا ہے (یہ مخطوطہ کچھ روز پہلے لکھنؤ سے ڈاکٹر ذکی کاکوروی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے)۔

۳۔ نسب نامہ سادات جرول۔ حیدر مہدی۔ مخطوطہ ذاتی۔ ڈاکٹر صفی احمد کاکوروی۔ سرسید اکاڈمی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ اس کا مؤلف آخری تین بادشاہوں کا معاصر ہے اس میں اودھ کی سماجی حالت اور مال گذاری کے نظام کا ذکر ہے۔

۴۔ کتاب سلطان التواریخ۔ راجہ رتن سنگھ زخمی ہشیار جنگ بہادر۔ لکھنؤ یونیورسٹی ٹیگور لائبریری

۵۔ رپورٹ بابت مسائل تعلیم مسلمانانِ ہند۔ مولوی مسیح الدین خاں علوی کاکوروی سفیر شاہ اودھ از مقام کاکوری۔ محفوظ سرسید اکاڈمی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

۶۔ تاریخ انگلستان۔ سفر نامہ لندن۔ مولوی مسیح الدین خاں علوی۔ کتب خانہ انوریہ کاکوری۔ ان مخطوطہ کتابوں کے علاوہ چند مطبوعہ کتابیں بھی ہیں جن کا شمار معاصر مآخذ میں ہے مثلاً فسانۂ عبرت رجب علی بیگ سرور اور قیصر التواریخ از سید کمال الدین حیدر وغیرہ۔

انگریزی زبان میں بھی گزیٹرس وغیرہ میں جستہ جستہ حالات ملتے ہیں۔ لیکن راقم اسطر کی نظر سے اب تک تاریخ اودھ اور امرا و سلاطین سے متعلق کوئی مستقل عربی تصنیف کسی معاصر کی نہیں گذری تھی۔ زیر نظر مخطوطہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانہ (۱۲۸۹) میں محفوظ ہے۔ اس کے مؤلف عباس مرزا بن سید احمد الحسینی بن سید محمود کاظم

ہیں۔ مؤلف معروف نہیں ہیں۔ راقم کی نظر سے اب تک ان کی کوئی دوسری تصنیف نہا
گذری ہے۔ کتاب کے مختلف صفحات کے مطالعہ سے ان کے بارے میں یہ معلومات
فراہم ہوتی ہیں کہ ان کے اجداد نوابین اودھ کے یہاں اعلیٰ مناصب پر فائز تھے
ان کے دادا سید محمد کاظم انجینئر تھے۔ سعادت علی خاں کے عہد میں ان کی زیر نگرانی
شاہی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ مؤلف کے باپ غازی الدین حیدر بادشاہ کے معتمد خا
تھے۔ مرزا امجد علی شاہ نے شروع میں ان کی بڑی عزت و توقیر کی اور اُن کو سلو
کا گورنر بنادیا۔ مگر انجام کار درباری سازشوں کی بنا پر اُنھیں اس عہدہ سے ہٹ
گیا۔ ان کی تمام جائداد و سامان کو ضبط کرلیا گیا۔ لیکن بعد میں تھوڑا سا مشاہرہ ان
گذر معاش کے لئے دے دیا گیا جو واجد علی شاہ کے عہد تک ان کو ملتا رہا۔ ۱۲۷
میں مؤلف مشہد بھی گئے تھے۔

یہ مخطوطہ ۲۱۱ اوراق پر مشتمل ہے، ہر صفحہ میں ۱۵ سطریں ہیں۔ بخط نسخ
عنوانات عام طور پر سرخ روشنائی سے ہیں، سنہ کتابت اگرچہ مذکور نہیں
مگر قیاس یہ ہے کہ تیرھویں صدی کا ہے۔ نسخہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ
میں تمام واقعات بالتفصیل درج ہیں۔ امراء و حکام، علماء، اطبا اور ماہرین فن
اسماء اور حالات تک درج ہیں۔ نسخہ کی تکمیل ۱۲۸۱ھ میں ہوئی لیکن بعد میں
اضافے بھی ہوئے ہیں اس لئے کہ اقبال الدولہ بن فتح علی کپتان تاریخ وفات
۱۲۸۷ھ اور چند لوگوں کی درج ہے۔

پورا مخطوطہ تین ابواب اور ایک خاتمہ پر منقسم ہے۔ پہلا باب (۳-۱۷۸ اور ق
اس میں سلاطین اودھ اور امراء کے حالات ہیں۔ دوسرا باب (۱۷۸ ب سے ۱۲
الف) نوابین اودھ کی ماؤں کے نسب ناموں پر مشتمل ہے۔ تیسرے باب میں
الف سے ۲۰۳ ب) دس فصلیں ہیں جن میں امراء، وزراء اور ملازمین کے حا

ہیں۔ خاتمہ میں (۲۰۳ ب سے ۲۰۸ تک) دارالسلطنت لکھنؤ کے بارے میں مفید معلومات ہیں۔

ابتدا اس طرح ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ان احلی ثمرات تشتھی الیھا النفوس، واسنی کلمات تزین بھا الطروس حمد من جعل النظام منوطا باٰراء السلاطین واحسن نغمات یترنم بھا عنادل الاقلام وانزین حلی یترشح بھا خرائد المرام الخ

نعت و مدح کے بعد لکھا ہے:

امابعد فیقول اقل الخلیقۃ بل لاشئ فی الحقیقۃ القصیر الباع والکاسد المتاع الاٰرمدستانی اصلا والکنوی موطنا ومنشاً المدعو لعباس مرزا ابن السید احمد الحسینی ابا والرضوی اما انی حصلت فی زمان لیس لی شغل من الاشغال ولا تعلق بشیٔ من الاعمال فکنت مشوش الخاطر و مضطرب البال فارادت ان اترجم احوالے ولاۃ الاودھ من النواب برھان الملک الی اخلافہ..

قیاس یہ ہے کہ یا تو یہ کتاب مکمل نہ ہوسکی یا اس کی نقل کسی ناقص نسخے سے کی گئی ہے اس لیے کہ مندرجہ ذیل عبارت پر کتاب کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آخری صفحات غائب ہوگئے ہوں۔

ومات نادر مرزا ابن شاہ میر خاں بن مرزا نصیر بن مرزا یوسف الاعمی یوم السبت العاشر من شعبان

من السنة المذکورة وله ستون سنة۔"

الباب الاول فی بیان ولایة صوبة الاوده وفیه اذکار الاولیاء وهو
النواب المدعو بالسید محمد امین بن السید محمد نصیر برهان الملك
بهادر جنگ۔ (۳ الف - ۹ ب)

الفصل التاسع فی ذکر النواب نجف خاں (۲۰۲ب)

" العاشر " " اعقاب محمد شفیع خاں بیگ

ثم النواب صفدر جنگ (۲۰۳ الف)

الخاتمة فی ذ... (۲۰۳ ...)

اورنگ زیب اور سیکولرزم

از عبدالرؤف ایم اے اودیؔ کلاں

خواجہ سربلند خاں جو اکتوبر ۱۶۷۳ء سے ۲۷ر دسمبر ۱۶۷۹ء (وفات) تک بخشیِ دوم کے عہدہ پر مامور رہا، تقیہ کیے رہتا تھا۔ ایک دفعہ شہنشاہ نے اس سے پوچھا کہ تمہاری باتوں سے بعض اوقات شیعیت کی بو آتی ہے تو اس نے جواباً عرض کیا کہ "جہاں پناہ بہت سے سید اس فرقہ (شیعیت) سے تعلق رکھتے ہیں مجھ پر بھی ان کی سابقہ مصاحبت کے سبب شیعیت کے کچھ اثرات باقی ہیں لیکن میں اس فرقہ کا غالی معتقد نہیں ہوں۔ میں نے اپنے تئیں اس فرقہ سے علیحدہ کرلیا ہے تاہم مکمل طور پر اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا ہوں۔" شہنشاہ اس کے جواب پر صرف مسکرا کر رہ گیا[۱] اور کسی قسم کی باز پرس نہ کی اس سے ثابت ہے کہ وہ (شہنشاہ) لوگوں کے ذاتی معتقدات میں دخل دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ یہی سربلند خاں ایرانیوں کا برملا طرفدار تھا اور شہنشاہ سے انھیں اعلیٰ مناصب اور بلند عہدے تفویض کرنے کی سفارشیں کیا ہی کرتا تھا۔ اس کی سفارش پر ہی ایک ایرانی کو کابل کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس سب کے علاوہ محکمۂ دیوانی پر تو شیعہ مکمل طور پر قابض تھے۔ سادات بارہہ (جن کی اکثریت شیعہ تھی) کی پوزیشن تو اتنی بہتر

تھی کہ وہ یہاں تک خودسر ہو گئے تھے کہ ایک دفعہ بادشاہ کے درباریوں سے خانہ جنگی تک کی نوبت آ گئی اور جب اورنگ زیب نے حکم دیا کہ معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش کیا جائے تو ساداتِ بارہہ نے کہا کہ ہم اپنا فیصلہ خود کریں گے، اس پر شہنشاہ نے آستین چڑھا کر بہ نظرِ عتاب فرمایا کہ جو لوگ میری شمشیرِ برّاں کا مزہ چکھ چکے ہیں وہ شریعتِ غرّا کے حکم کے بالمقابل ایسے الفاظ منہ سے نکالتے ہیں؟ کہدو سب مل کر آجائیں۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ پہرے وغیرہ پر جس قدر سادات ہیں برطرف کر دیئے جائیں۔ یہ سن کر ساداتِ بارہہ کا تمام نشۂ جرأت ہرن ہو گیا۔[۳۲]

معاشی اعتبار سے بھی عہدِ عالمگیری میں ہندو اور شیعہ علی الخصوص اسماعیلی[۳۳] و داؤدی بوہرے[۳۴] ملکی تجارت پر پوری طرح قابض تھے۔ اُس وقت کے GATE WAY OF INDIA یعنی بندر سورت پر یا تو ہندو بنیوں کا کنٹرول تھا یا بوہروں کا۔ سورت کا سوداگر بہاورجی بوہرہ تو اس وقت دنیا کا متمول ترین تاجر (ملک التجار) سمجھا جاتا تھا، بعدہٗ حاجی سید یا سعید بیگ اور حاجی قاسم کا شمار تھا۔ ہندو بنئے دور چند بوہرے کی دولت کا بھی کوئی شمار نہ تھا، جس سے خود شہنشاہ اورنگ زیب بھی بوقتِ ضرورت لاکھوں روپیہ قرض لیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس سے شہنشاہ نے چار لاکھ روپیہ قرض مانگا تو اس نے عرض کیا کہ جہاں پناہ جس سکّہ کا نام فرمائیں مطلوبہ رقم اسی سکّہ میں حضور کے قدموں پر نثار کر دی جائے (واضح ہو کہ اُس وقت سورت میں آٹھ قسم کے سکّے رائج تھے یعنی طلائی روپیہ، اٹھنی و چونی اور علی الترتیب یہی نقرئی سکّے نیز طلائی بگوڑا اور نقرئی لرین (ZARINS)۔ ان آٹھ قسم کے سکّوں میں سے وہ چار لاکھ روپیہ کسی بھی ایک سکّہ میں پیش کرنے کو تیار تھا۔ ایک عصری یوروپین سیاح رقمطراز ہے کہ مغل اعظم (اورنگ زیب) ایسے قرضوں کو بالعموم ابواب (مالگذاری) کی وصولیابی ہونے پر ادا کر دیتا ہے اور ادائیگی حسبِ وعدہ اتنے معینہ وقت پر ہوتی ہے کہ اُسے جتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے وہ فوراً مل جاتی ہے۔ رعایا کو بادشاہ

سے جتنا زیادہ امن وسکون اور مراعات حاصل ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ فراخدلی کے ساتھ
رعایا بھی اپنی تھیلی کا منہ شہنشاہ کے قدموں پر کھول دیتی ہے[۳۵]۔ بالفرض محال اگر اورنگ زیب
ہندو اور شیعوں کے استحصال واستیصال پر ہی تُلا ہوا تھا تو انہیں نہایت مفلس و
قلاش ہونا چاہیئے تھا۔ دراصل ہندو اور شیعوں کا استحصال اورنگ زیب نے
نہیں بلکہ سورت کو دو دو دفعہ "بے صورت" کر کے سیواجی نے کیا۔ پہلی دفعہ ۶ جنوری
۱۶۶۴ء بروز بدھ بوقت ۱۱ بجے دوپہر سے ۱۰ جنوری ۱۶۶۴ء بروز اتوار بوقت ۱۰ بجے
دوپہر تک سیواجی اور اس کے غارت گر ہمراہی سورت کے لوگوں کو لوٹتے اور مکانوں
کو نذر آتش کرتے رہے، جمعرات وجمعہ کی درمیانی شب آگ زنی کے سبب نہایت
مہیب تھی۔ آگ کے شعلوں اور التہاب نار اور شب دیجور کو روشن دن میں اور
دھوئیں کے کالے بادلوں نے دن کی تابانی کو سیاہ رات میں تبدیل کر دیا تھا۔ دھواں
اتنا کثیف اور گہرا تھا کہ اس نے ایک گھنے بادل کی طرح سورج کو ڈھانپ لیا تھا[۳۶]۔
بہارجی بوہرہ کے محل کو انھوں نے جمعہ کی رات تک جی بھر کر لوٹا، فرش کھود ڈالا گیا
اور اس کے بعد محل کو نذر آتش کر دیا گیا۔ یہاں سے انھیں اٹھائیس سیر بڑے بڑے
موتی، بہت سے لعل، جواہر اور زمرد نیز دوسری بے شمار دولت حاصل ہوئی۔
دو تین ہندو تاجروں کو بھی کئی کروڑ کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ مزید برآں ایک دن
چھبیس[۲۶] آدمیوں کے سر اور تیس آدمیوں کے ہاتھ کاٹ کر پھینک دیئے۔ انگریزوں کی
کوٹھی کے قریب حاجی سعید بیگ کا محل اور گودام تھا۔ بدھ کی دوپہر کو مرہٹہ اس
میں داخل ہوئے۔ تمام دروازوں اور صندوقوں کو تہس نہس کر ڈالا اور محل میں
جتنا اور جو کچھ مل سکا اُسے اپنے قبضہ میں کیا اور پھر گودام کا رُخ کیا، وہاں رکھے
ہوئے سیماب کے کنستروں کو توڑا اور تمام پارے کو فرش پر لنڈھا دیا۔ جمعرات کی
سہ پہر لٹیرے انگریزوں کے خوف کے سبب سعید بیگ کے محل اور گودام سے بھاگ

چھوٹے[۴۵] "سورت میں مرہٹوں کے مظالم اور کشت و خون" عنوان کے تحت سر جدو ناتھ رقمطراز ہیں کہ "اپنا چھپا ہوا سرمایہ بتانے کے لئے مرہٹوں نے لوگوں پر مظالم ڈھانے میں کوئی کور کسر باقی نہ چھوڑی۔ انھیں کوڑوں سے پیٹا گیا اور جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ کسی کا ایک اور کسی کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے گئے اور بہت سے لوگوں کو جان سے مار ڈالا گیا۔ قیدیوں میں سے جو شخص مرہٹوں کو کچھ نہ دے سکا اس کا کوئی نہ کوئی عضو قلم کر دینے یا اُسے قتل کرنے کا حکم دیا گیا۔ سیواجی نے ہر ایک گھر سے جتنا مل سکا اتنا مال لے لیا اور پھر صاحبِ خانہ سے کہا کہ اگر مکان محفوظ رکھنا چاہتے ہو تو کچھ اور پیش کرو، اپنا گھر بچانے کے لئے جب رہا سہا مال و متاع اور اثاثہ بھی سیواجی کو دیدیا گیا تو اُس نے وعدہ کی پرواہ کیے بغیر اُسی وقت اُس گھر کو بھی نذرِ آتش کروا دیا۔ انھی ایام میں ایک بوڑھا تاجر آگرہ سے چالیس بیلوں پر کپڑے کے تھان لاد کر لایا تھا۔ اس سے بھی رقم کا مطالبہ کیا گیا مگر کپڑا فروخت نہ ہونے کے سبب وہ سیواجی کو نقد روپیہ نہ دے سکا اور اپنا تمام اسباب دے دینا چاہا جسے سیواجی نے قبول نہ کیا اور روپیہ نہ دینے کی پاداش میں اس کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا گیا نیز تمام تھان جلا کر راکھ کر دیئے[۴۶]۔ سیواجی کی فوج کے سپاہیوں نے تمام پارسیوں کو بھی لوٹ لیا اور ان کے مکانات جلا دیے۔ پارسیوں میں سے جو مقید کر لیے گئے تھے انھیں رستم مانک جی نے دس ہزار روپیہ زرِ فدیہ دے کر سیواجی کے خونی پنجوں سے رہائی دلائی[۴۷]۔ بہرحال چوتھے دن مغل فوج کی آمد کی خبر سن کر سیواجی سورت سے بقول پرتگالی مورخ کاسمیڈا گوآرڈا لوٹ کے مال و اسباب کو نو سو بیلوں پر لدوا کر اپنی راجدھانی رائے گڈھ بھاگ گیا۔ اسمتھ جین ڈے تیوزٹ لکھتا ہے کہ اس غارت گری میں تقریباً تین کروڑ کی مالیت سیواجی کے ہاتھ لگی[۴۸]۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بے شمار مالِ غنیمت کو شمار کرنے کی اسے کبھی فرصت نہ مل سکی[۴۹]۔ اس سنگدلانہ کارروائی کو

سربہ دوناتھ سرکار سیواجی کی زندگی کا عظیم ترین کارنامہ قرار دیتے ہیں اور اس تمام ترظالمانہ کارروائی سے اغماض برتتے ہوئے نہایت معصومانہ انداز میں فرماتے ہیں کہ "شہر (سورت) کے چار روزہ قیام کا سیواجی نے لوٹ مار اور غارت گری کرنے میں خاطر خواہ فائدہ اٹھایا مگر دولت حاصل کرنے کے لئے بیجا ظلم وستم اور سفاکانہ خون خرابہ سے گریز کیا۔[۱۴] گویا پروفیسر موصوف کے نزدیک سیواجی نے جو بھی ظلم وستم اہل سورت پر ڈھائے وہ سب ایک رحمدلانہ کارروائی تھی۔ ۳ر اکتوبر ۱۶۷۰ء کو موقعہ پاکر سیواجی نے سورت کو دوسری دفعہ لوٹا جس میں کم از کم چھیاسٹھ لاکھ روپے مرہٹوں کے ہاتھ لگے[۱۵]۔ اس مرتبہ بھی انھوں نے بڑے بڑے مکانات کو اپنی قزاقی کا نشانہ بنایا اور تقریباً نصف شہر کو جلاکر خاکستر کردیا۔ چھیاسٹھ لاکھ مال غنیمت میں، ترپن لاکھ زرنقد، جواہرات اور قیمتی اسباب کی صورت میں تھا۔ باقی تیرہ لاکھ نوں ساہو (ساہوکار) بری ساہو اور سورت کے ایک مضافاتی قصبہ سے لوٹے گئے تھے۔ سیواجی کے اس کارنامہ کی تفصیل "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتیم" کی مصداق قدرے طویل ضرور ہوگئی ہے لیکن اس تطویل سے ناظرین کرام پر یہ واضح ہوجائے گا کہ "ہندو اور رافضی کش" اورنگ زیب تھا یا سیواجی۔

آخر میں محقق شہیر علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ مستعار میں یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ:

"مسلم حکمرانوں کے عیوب اور خامیوں کے ساتھ، مسلمان حکومتوں اور حکمرانوں کے محاسن، اُن کی ملکی خدمات اور کارناموں کا بھی اعتراف کیا جائے۔ انھوں نے ہندوستان کو جو گوناگوں فوائد پہنچائے اور اس کو جس ابتدائی درجہ سے معراج کمال تک پہنچایا، اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔ پھر اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے والے واقعات کی بھی کمی نہیں، اُن کو اجاگر کرنے کی ضرورت ہے اور قومی اتحاد کا یہ زریں اصول بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ آگے بڑھنے میں

پچھلے واقعات پر نگاہ نہیں ڈالی جاتی۔[۲۴]"

حواشی و تعلیقات

[۱] تا [۱۰] حاشیہ کے لئے ملاحظہ فرمائیں برہان بابت ماہ اکتوبر ۱۹۸۷ء
[۱۱] ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۳ ص ۹۴، از پروفیسر جدوناتھ سرکار۔
[۱۲] بھارت کا برہت اتہاس ج ۳ ص ۳۲۷ طبع سوم از ڈاکٹر سری نیتر پانڈے۔
[۱۳] مغل کالین بھارت ص ۱۹۴ مطبوعہ ۱۹۶۵ء از ڈاکٹر اے ایل سری واستو۔
[۱۴] ہاؤس آف سیواجی ص ۳۷۵، از سرکار۔ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز از سرکار ص ۳۶۸، ہسٹری آف دی مرہٹاز ج ۱ ص ۶-۲۵ از جی۔ ایس۔ سردیسائی، فال آف دی مغل امپائر ... نے جے آوکن ص ۵۴ طبع ۱۹۶۰ء، ہسٹاریکل الیسیز از قانون گو ص ۱۰۲۔
[۱۵] شیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۲۵۹۔
[۱۶] نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز (ہندی ایڈیشن) ج ۱ ص ۲۶۵ و ۳۳۵۔
[۱۷] اے شارٹ ہسٹری آف اورنگ زیب (ہندی) ص ۷-۳۰۶، نیو ہسٹری آف ... مرہٹاز ص ۳۱۶، سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۸-۳۲۷، دی ملٹری سسٹم آف دی ... از ڈاکٹر سریندر ناتھ سین ص ۱۸ حاشیہ ۲۔
[۱۸] نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ص ۳۲۵ و ۳۵۵۔
[۱۹] دی ملٹری سسٹم آف دی مرہٹاز ص ۱۷ حاشیہ ۲۔
[۲۰] مین کرنٹز آف مرہٹہ ہسٹری از جی ایس سردیسائی ص ۱۳ و ۱۴۔
[۲۱] جدوناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ جب کسی امیر نے رافضی کش نام کا ایک ... قبض (خنجر) شہنشاہ کے حضور پیش کیا تو اورنگ زیبؒ نے اظہار مسرت فرماتے ہوئے ... قسم کے کچھ اور خنجر تیار کرانے کا حکم صادر فرمایا۔ ملاحظہ ہو مغل ایڈمنسٹریشن (ہندی)

ص ۱۲۶، مطبوعہ ۱۹۶۰ء۔

۲۲؎ ایضاً ص ۱۲۶ نیز انیکڈوٹس آف اورنگ زیب صفحات ۱۲۲ تا ۱۲۵۔

۲۳؎ تزک بابری اردو ترجمہ ص ۲۶۲ مطبوعہ اکتوبر ۱۸۹۸ء۔

۲۴؎ میرک معین الدین احمد خوافی کے سوانحی حالات اور ان کی خدمات کے لئے ملاحظہ

"مکتوبات خواجہ محمد معصوم سرہندی رحمۃ اللہ علیہ" تلخیص و ترجمہ از محقق شہیر حضرت مولانا مفتی نسیم

صاحب امروہی مدظلہ العالی ص ۴۶ تا ۵۱ حاشیہ ۱ مطبوعہ ستمبر ۱۹۶۰ء۔

۲۵؎ اے شارٹ ہسٹری آف اورنگ زیب ہندی ص ۳۶۱ طبع ستمبر ۱۹۵۱ء

۲۶؎ اینکڈوٹس آف اورنگ زیب ص ۸۴۔

۲۷؎ ہسٹری آف شاہ جہاں آف دہلی از ڈاکٹر بنارسی پرساد سکسینہ ص ۱۷

مطبوعہ ۱۹۵۸ء۔

۲۸؎ میانہ قبائل افغانستان میں سے ایک قبیلہ کا نام تھا۔ اس قبیلہ کا مورثِ اعلیٰ حسن

میانہ جہانگیری دورِ حکومت میں واردِ ہندوستان ہوا۔ دربار میں رسائی حاصل کر کے دکن

کسی عہدہ پر مامور ہوگیا۔ نواب عبدالرؤف خاں میانہ خانِ موصوف ہی کے احفاد میں سے

بیجاپور دکن کی عادل شاہی حکومت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔ ۱۶۸۶ء میں اس ریاست کے

مغل سلطنت میں انضمام کے بعد نواب موصوف نے اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کی ملازمت اختیار

کرلی۔ شہنشاہ نے اُسے سات ہزاری منصب اور دلیر خاں کے خطاب سے نوازا۔ مختلف

مقامات پر شاہی خدمات انجام دیتے ہوئے بعہد بہادر شاہی ۱۷۱۰ء میں راہیٔ ملک

ہوئے۔

۲۹؎ مہدوی فرقہ سید میر محمد جونپوریؒ متوفی ۹۱۰-۱۱ھ / ۱۵۰۵ء کی طرف منسوب ہے۔ کہا جا

کہ وہ مہدی ہونے کے مدعی تھے۔ سترہویں صدی کے وسط تک اس فرقہ کے باقیات بیجاپور میں

موجود تھے۔ اس فرقہ کے بانی اور حالاتِ زندگی کے لئے دیکھئے "تذکرہ" مولانا ابوالکلام آزاد

۲۹ جناب مالک رام صاحب ص ۴۴ نیز ۴۶ تا ۴۷، اور ص ۳۵، حاشیہ ۲ مطبوعہ ۱۹۸۱ء۔

۳۰ ہاؤس آف سیواجی ص ۹-۹۸۔

۳۱ اینکڈ ڈانس آف اورنگ زیب ص ۳ - ۱۲۲ نیز مغل ایڈمنسٹریشن ص ۱۲۷۔

۳۲ اینکڈ ڈانس آف اورنگ زیب ص ۸۴ نیز مغل ایڈمنسٹریشن ص ۱۲۶۔

۳۳ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر از علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ص ۱۲۵ مطبوعہ ۱۹۶۰ء۔

۳۴ اسماعیلی شیعہ سیدنا امام جعفر صادقؒ (م ۱۴۸ھ) کے صاحبزادے سیدنا اسماعیلؒ سے انتساب کے سبب اسماعیلیہ کہلاتے ہیں۔ اِن کا دوسرا نام تعلیمیہ بھی ہے۔ یہ امامیہ (اثناعشری) فرقہ کی ہی ایک شاخ ہے جو جمہور امامیہ سے سیدنا جعفر صادقؒ کی جانشینی کے بارے میں اختلاف رکھتا ہے، چنانچہ صرف سات اماموں کو تسلیم کرنے کے سبب ابتدا میں سبعیہ بھی کہلاتا تھا ملاحظہ ہو مذہب اور باطنی تعلیم از مرزا محمد سعید دہلوی ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس صفحات ۲۱۵ تا ۲۲۴ نیز ص ۴-۳۲۳۔

۳۵ لفظ بوہرا ہندی زبان کے لفظ بیوہرا (ब्योहरा) سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی روپیہ قرض دینے والا (Money - lender) یا تاجر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بوہروں کا پہلا داعی عبداللہ یمن سے روانہ ہو کر ہندوستان میں کھنبائت (صوبہ گجرات) کے ساحل پر ۱۰۶۷ء میں وارد ہوا۔ اس کی تبلیغی مساعی نے قلیل عرصہ میں حیرتناک کامیابی حاصل کر لی۔ یہاں تک کہ گجرات کا راجہ سدھو راؤ جے سنگھ اور اس کی رعایا کی اکثریت اسماعیلی ہو گئی۔ ہندوستان کے بوہرے داؤدی اور خوجے اسماعیلیہ ہی کے باقیات ہیں۔ ان میں بوہرے نسبتاً ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ بوہرہ اسماعیلیہ جماعت دو بڑے فرقوں میں منقسم ہے جن میں سے ایک داؤد بن قطب شاہ کی رعایت سے داؤدیہ (داؤدی) اور دوسری شاخ سلیمان بن یوسف کی پاسداری سے سلیمانیہ کہلاتی ہے۔ تعدادی لحاظ سے داؤدی فرقہ کو غلبہ حاصل ہے۔ چونکہ اس فرقہ کی غالب اکثریت

ہندو نژاد ہے اس لئے اسماعیلیوں کے بعض فرقے بہت سے ہندو رسم و رواج اور اعمال و عقا
مثلاً حلول و تناسخ کے قائل ہیں اور فاطمی خلیفہ حاکم کو خدا کا اوتار تسلیم کرتے ہیں۔ ان عقائد کے
سبب غیر مسلم مورخین کا ان سے اظہار ہمدردی کرنا لازمی بات ہے۔

۳۵ کریسنٹ ان انڈیا ص ۹۰-۵۸۴۔

۳۶ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۹۶، نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ص ۱۷۷۔ کریسنٹ ان انڈیا
ہندی ترجمہ ص ۵۹۰ نیز ویدروہ کا جھادیر (ہندی) ص ۱۰۶ مصنف مسٹر ڈیبس۔

۳۷ شیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۷-۹۶

۳۸ ایضاً حاشیہ ص ۹۹ نیز اسی تصنیف کا ہندی ملخص ایڈیشن ص ۵۴-۵۳۔

۳۹ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ضمیمہ ص ۱۱۴۔

۴۰ کریسنٹ ان انڈیا ص ۹-۵۸۸۔

۴۱ نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ص ۱۷۸ نیز سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۹۸۔

۴۲ ایضاً، ایضاً ص ۹۲، ۹۹۔

۴۳ سیواجی اینڈ ہز ٹائمز ص ۱۷۲، ۱۷۴ نیز نیو ہسٹری آف مرہٹاز ۲۳۹۔

۴۴ ایضاً۔ سورت کی اس غارت گری کے سلسلہ میں مرہٹی زبان کے تاریخی لٹریچر میں سورت
کے ساتھ فخر و مباہات کے طور پر جا بجا "بے سورت" یعنی بدشکل کا استعمال کیا گیا ہے (ہندی
زبان میں سورت اور صورت کا املا یکساں ہوتا ہے) ملاحظہ ہو نیو ہسٹری آف دی مرہٹاز ہندی
ایڈیشن ص ۱۷۸ ج ۱۔

۴۵ دیباچہ تاریخ سندھ۔

(ختم شد)

مُسلم خواتین اور تعلیم

(قرونِ اولیٰ اور وسطیٰ میں)

از پروفیسر ڈاکٹر آنہ لعل بہا، شعبۂ تاریخ پشاور یونیورسٹی۔ پاکستان

علم کی فضیلت قرآن کریم اور احادیث نبوی میں کئی بار اور بڑی وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ اور مسلمانوں کو تحصیل علم کی ہدایت اور تاکید کی گئی ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات نے نوع بشر پر جو ان گنت احسانات کیے اُن کی وجہ سے صنفِ نازک کے مقام و رُتبہ، عزت و وقار اور حقوق میں جو انقلاب آفریں خوش آئند تغیّر ظہور پذیر ہوا، اس کی مثال تاریخ عالم میں کوئی دوسری قوم، کوئی دوسری تہذیب اور کوئی دوسرا معاشرہ پیش نہیں کرسکتا۔ شعبہ ہائے حیات میں مرد و زن کے حقوق میں ایک مساویانہ روش اختیار کی گئی ہے اور ضیائے علم سے بھی دونوں کو منوّر ہونے کی اجازت دی گئی ہے بلکہ تاکید کی گئی ہے۔

صرف چند احادیث فضیلت علم کے بارے میں پیش کی جاتی ہیں۔ ارشاد نبوی ؐ ہے: طلبُ العِلمِ فَرِیضَۃٌ عَلیٰ کُلِّ مُسلِمٍ وَّ مُسلِمَۃٍ (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان عورت اور مرد پر فرض ہے) ایک اور فرمانِ رسول ؐ ہے: من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتیٰ یرجع (جو شخص علم کی طلب میں نکلے، وہ اللہ کی راہ میں ہے، یہاں تک کہ وہ واپس لوٹے)

اور یہ اقوال اُطلبوا العلم مِنَ المھدِ الی اللحدِ اور اطلبوا العلم ولو کان بالصین (تم جھولے سے لے کر لحد تک علم حاصل کرو۔ اور تم علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے چین جانا پڑے) تو زبان زدِ عام ہیں۔

علم دین کا حاصل کرنا مسلمان مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں ضروری قرار دیا گیا ہے حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈیوں تک کو علم سکھانے کی تاکید فرماکر اسے باعث ثواب بتایا ہے اور لڑکیوں کو علم و ادب سکھانے کی ہدایت فرمائی۔

مسجدِ نبویؐ کو اسلام کی اولین عظیم درس گاہ کا شرف حاصل ہوا۔ جہاں آنحضرت صلعم اصحاب کرامؓ کو درس دیتے رہتے تھے۔ اور اس طرح آپؐ نے اسلامی نظام تعلیم کی خود بنیاد رکھی اور نظارت بھی خود فرمائی۔

ابتدا میں مسلم خواتین ان درسوں میں شرکت نہیں کرتی تھیں۔ اور اُن کے مرد بھی اُن کو مسجد نبویؐ جانے سے روکتے تھے۔ نبی کریم صلعم نے ان کو حکم صادر فرمایا کہ "تم اللہ کی بندیوں (عورتوں) کو اللہ کی مساجد میں جانے سے نہ روکو" نتیجتاً مسلم خواتین کی ایک کثیر تعداد اُن کی مجالس وعظ و تعلیم میں حاضر ہونے لگی۔ اور آپؐ کی تعلیمات سے مستفید ہونے لگیں۔ مگر چونکہ بعض زنانہ مسائل حضورؐ سے براہ راست نہیں معلوم ہو سکتے تھے۔ اس لئے مسلم خواتین ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور دوسری ازواج مطہراتؓ سے اس بارے میں رجوع کرتیں، اور اس طرح خواتین کے مخصوص مذہبی مسائل سے وہ ان کو آگاہ کرتیں۔ خواتینِ انصار کا ذوق و شوقِ علم مندرجہ ذیل حدیث سے عیاں ہوتا ہے:

وَقَالَتْ عَائِشَۃُؓ نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْاَنْصَارِ۔ لَمْ یَمْنَعْھُنَّ الْحَیَاءُ اَنْ یَّتَفَقَّھْنَ فِی الدِّیْنِ (عائشہؓ فرماتی ہیں کہ انصار کی عورتیں کیا اچھی عورتیں ہیں۔ ان کو حیا نے اِس بات سے نہیں روکا کہ دین میں سمجھ حاصل کریں)

اگرچہ خواتین کو یہ سہولتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ پھر بھی انھوں نے محسوس کیا کہ

...ہیں ہفتہ میں ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے لئے مخصوص کرا لینا چاہیئے۔
...انچہ ان کی درخواست پر ہفتہ میں ایک دن ان کے لئے مخصوص کر دیا گیا۔ اُس دن
...ب ان کے سوالات کے جوابات دیتے، اور وعظ و نصیحت فرماتے۔ اِن اجتماعات
...بہت مفید نتائج برآمد ہوئے۔ مسلم خواتین غزوات میں اپنے جان و مال کے ذریعہ
...ں کھول کر مدد کرنے لگیں۔ نیز آپ صلعم نے خواتین کو یہ مشورہ بھی دیا کہ چرخہ کاتیں
...ور گھریلو صنعتوں میں دلچسپی لیں۔

اہل بیت میں ازواج مطہرات ؓ، حضرت فاطمہ ؓ، ان کی صاحبزادیاں ؓ اور پوتیاں ؓ
...ہیں علم اور فروغ علم میں پیش پیش نظر آتی ہیں۔ اور اِس طرح مسلم خواتین کے لئے ایک
...ی نمونہ پیش کرتے ہوئے رہبری اور رہنمائی فرماتی ہیں۔ اُم المومنین حضرت عائشہ ؓ کے
...ر علم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دین کا آدھا علم حضرت عائشہ ؓ سے منقول ہے۔
...ب سے ۲۲۱۰ احادیث مروی ہیں۔ حضرت عروہ بن زبیر ؓ جو فقہائے سبعہ میں سے ہیں۔ فرماتے
...یں کہ "میں نے کسی ایک کو بھی معانی قرآن، احکام حلال و حرام، اشعارِ عرب اور علم الانساب
...یں عائشہ ؓ سے بڑھ کر نہیں پایا۔" فقہ کے علاوہ ان کو ادب اور طب میں بھی بڑا دخل تھا۔
حضرت عائشہ ؓ کو اسلام میں اولین معلمہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ حضرت عائشہ ؓ کا
...لقہ درس و تدریس بہت وسیع تھا۔ لڑکے، عورتیں اور جن مردوں سے حضرت
...ائشہ ؓ کا پردہ نہ تھا، وہ حجرہ کے اندر آ کر مجلس میں بیٹھتے تھے۔ اور دوسرے لوگ
...جرہ کے سامنے مسجدِ نبوی میں بیٹھتے۔ دروازہ پر پردہ پڑا رہتا۔ پردہ کی اوٹ میں وہ خود
...یٹھ جاتیں، لوگ سوالات کرتے، یہ جوابات دیتیں، کبھی کوئی سلسلۂ بحث چھڑتا اور استاد و
...اگرد اس خاص موضوع پر گفتگو کرتے۔ کبھی خود کسی مسئلے کو چھیڑ کر بیان کرتیں اور لوگ خاموشی
...کے ساتھ سنتے۔ تابعین میں اُس عہد کے جو علمائے حدیث ان کے خوشہ چین تھے ان میں
...تو تابعین ؓ عورتیں تھیں۔

امہات المومنین حضرت حفصہؓ اور حضرت اُم سلمہؓ دونوں پڑھنا اور لکھنا جانتی تھیں
آنحضرت صلعم کے حکم پر حضرت حفصہؓ نے پڑھنا لکھنا شفاء بنت عبد اللہ العدویہ سے سیکھا تھا
یہ حضرت عمرؓ کی رشتہ دار تھیں۔ حضرت ام سلمہؓ شاعرہ بھی تھیں۔ اُن کی دختر زینب بنت ابو
اپنے وقت کی عورتوں میں بہت بڑی فقیہہ تھیں۔ حضرت سیدہ فاطمۃ الزہراؓ قرآن پاک، حا
کے ساتھ عروض میں بھی درک رکھتی تھیں اور بہترین خطیبہ تھیں۔ ان کی صاحبزادیاں حضر
زینبؓ اور حضرت اُم کلثومؓ زیور علم سے آراستہ تھیں۔ ان کی پوتیاں حضرت سکینہ اور حضر
فاطمہ صغریٰ تعلیم یافتہ خواتین تھیں۔ حضرت سکینہ کو شاعری اور ادب سے لگاؤ تھا۔
منورہ میں ان کی قیام گاہ، مرجع علماء، فقہاء، شعراء اور ادباء تھی۔ حضرت عائشہؓ کی
بھانجی عائشہ بنتِ طلحہ جو آپ ہی کی تربیت یافتہ تھیں، بہت بڑی عالمہ تھیں۔

عہد بنو عباس کی اولین دو صدیاں اور اندلس میں دولت بنو امیہ کا عروج مسلمانو
کے سیاسی اور ذہنی ارتقاء کی انتہا ثابت ہوا۔ اِس سُنہری دَور میں مسلمانوں نے علو
فنون میں جو بے مثال ترقی کی، اس سے بعد میں مغربی دنیا نے اپنی شمعِ علم روشن کی۔

اُس زمانے میں درس و تدریس کا قدیم طریقہ رائج تھا، اور مساجد میں اور علماء کے
ہاں حلقے اور مجالس منعقد ہوتی تھیں اور ذوق و شوق علم کا یہ عالم بیان کیا گیا ہے کہ
ایک ایک حلقۂ درس میں ہزاروں کی تعداد میں حاضرین ہوتے تھے جن میں لکھنے وا
اور سننے والے دونوں شامل ہوتے تھے۔ امراء، رؤساء، خلفاء کے یہاں مجالس
بھی منعقد ہوتی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ تعلیم کی نوعیت و ماہیت اور درس و تدریس
میں ایک بڑا انقلاب آیا۔ باقاعدہ اور منظم تعلیم کے لئے مدارس، کلیات، جامعا
اور اکادمیاں معرض وجود میں آنے لگیں۔ جن کی سرپرستی خلفاء، وزراء و امراء او
علماء کرنے لگے۔ بغداد میں بیت الحکمۃ اور نظامیہ جیسے شاندار تحقیقی اور علمی ادار
قائم ہوئے، جن میں اساتذہ کے لئے تنخواہوں اور طلباء کے لئے وظائف کا

انتظام بھی کیا گیا۔ نظامیہ کی طرز پر خراسان، عراق، شام اور مصر میں سینکڑوں مدارس تعمیر کیئے گئے۔

دنیائے اسلام میں چاروں طرف شمعِ علم روشن تھی اور دخترانِ اسلام نے بھی اس کی روشنی میں بہت کچھ سیکھا۔ یہ بات بھی بعید از قیاس ہے کہ علوم و فنون کی اتنی زیادہ ترقی اور وسیع پیمانے پر پھیلاؤ دخترانِ اسلام کے ذوق و شوق کے لئے باعثِ کشش نہ ہوا ہو۔ اور تاریخ اسلام ایسی روشن اور قابلِ فخر مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جن ادوار کا ذکر ہو رہا ہے ان میں خواتین اسلام نے قابلِ ستائش علمی سرگرمیوں کا ثبوت دیا ہے۔

کئی خواتین زمرۂ علماء میں شامل تھیں اور کئی علماء اور فقہاء کی ماؤں اور بہنوں نے اپنے بیٹوں اور بھائیوں کی علم کی کٹھن راہوں میں راہبری کی، امام ابن جوزیؒ کی پھوپھی ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام صحیح طور پر نہ کرتیں تو ہم ان جیسے جلیل القدر امام سے محروم رہتے۔ اگر امام ربیعۃ الرایؒ (استاد امام مالکؒ و حسن بصریؒ) کی والدہ ماجدہ ان کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہ دیتیں تو وہ اتنے بلند پایہ امام و عالم نہ ہوتے۔ اگر قاضی زادۂ روم کی خواہر اُن کی مالی اعانت نہ کرتیں تو شرح چغمنی (عربی کی ریاضیات پر کتاب) جیسی نادر کتاب ہمارے کتب خانوں کی کیونکر زینت بنتی؟ اسی طرح اگر امام بخاریؒ کی والدہ ماجدہ اور ان کی خواہر ان کی کفالت نہ کرتیں تو ہم کو صحیح بخاری شریف کہاں سے ملتی؟

ہمیں علماء خواتین کی تعداد ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ امام حافظ ابن عساکر مؤرخِ دمشق نے فن حدیث جن علماء سے سیکھا اُن میں اسّی سے زیادہ خواتین تھیں۔ حافظ ابن حجرؒ کے اساتذہ میں کئی عورتیں شامل تھیں۔ علامہ سیوطی کی معلمہ آسیہ اُمّیمہ کو علم حدیث میں کمال تھا۔ بُوران خلیفہ مامون الرشید کی ملکہ جیّد عالمہ تھیں۔ رضیہ جو

نجم سعیدہ کے لقب سے مشہور تھیں، شاعرہ اور مؤرخہ تھیں۔ علماء اور فضلاء کی محفلوں میں شرکت کرتی تھیں۔ اسی طرح شہدہ خاتون جید عالمہ تھیں اور حدیث، تاریخ اور ادب میں یدِ طولیٰ رکھتی تھیں۔ ان کے ہم عصر بغداد کے کئی علماء کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ شیخہ سیدہ فخر النساء جامع مسجد بغداد میں کثیر التعداد حاضرین کے سامنے علم کلام، شاعری اور ادب پر بڑے بلیغ خطبے دیا کرتی تھیں۔ یہی وجہ ان کے فخر النساء کہلانے کی ہوئی۔ فاطمہ بغدادیہ جو مصر میں سکونت پذیر ہوگئی تھیں، نہایت جلیل القدر واعظہ تھیں۔ ان کی مجلس وعظ میں اکابرین حتیٰ کہ شاہِ مصر بھی شرکت کرتے تھے۔ صبح کے وقت وہ عورتوں کو فقہ و حدیث کا درس دیا کرتی تھیں۔ جن میں تقریباً پچاس ساٹھ طالبات شریک ہوتی تھیں۔

اسپین میں جب اموی خاندان عروج پر تھا۔ علوم وفنون میں مسلم خواتین نے قابلِ رشک کمال حاصل کیا۔ قرطبہ، غرناطہ، طلیطلہ اور اشبیلیہ میں کثیر تعداد میں عالمہ اور فاضلہ عورتیں موجود تھیں۔ وہ کالج کے کمروں میں لڑکوں کے ساتھ لیکچر سنتی تھیں، شاعری کرتی تھیں اور ادبی مذاکروں اور مجمعوں میں مردوں کے مدمقابل آتی تھیں۔ حفید بن زہر اشبیلیہ کے مشہور طبیب کی بہن اور بھانجی طب اور معالجات میں عالمہ تھیں اور امراضِ نسواں کے معالجے میں ان کو مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ خلیفہ منصور (فرماں روائے اندلس) کے محلات کا علاج اُن کے سپرد تھا۔

اسلامی معاشرے کے اونچے اور اوسط طبقوں میں خواتین اتنی کثرت سے زیورِ علم آراستہ ہو رہی تھیں تو ایسی سازگار اور خوشگوار فضا میں کنیزوں اور لونڈیوں تک کو علم سے مستفید ہونے کے مواقع فراہم ہوئے اور بہت سی باندیوں نے اپنے دامنوں کو علمی جواہر پاروں سے بھرا۔ خلفاء اور امراء کی حرم سراؤں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ کنیزیں داخل ہوتی تھیں۔ ہارون الرشید کی ملکہ زبیدہ کی کنیزوں میں سے سَو کنیزیں

حافظِ قرآن بتائی جاتی ہیں جو کہ اُن کو روزانہ قرآن مجید سناتی تھیں۔

دخترانِ اسلام نے علوم وفنون کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی عملی طور پر کرتے ہوئے مدرسی اوارے قائم کرنے کا شرف بھی حاصل کر کے اپنی علم دوستی کا بیّن ثبوت فراہم کیا۔ مشہور ومعروف تدریسی ادارے دمشق بغداد اور مصر میں معرضِ وجود میں آئے جن کے بانیوں میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے خاندان کی خواتین سرِفہرست نظر آتی ہیں۔ دمشق میں رابعہ بنت نجم الدین اور سِتّ الشام بنت نجم الدین (صلاح الدین ایوبی کی بہنیں) نے مدارس قائم کیے۔ ایک اور شہزادی عذرا بنت نور الدولہ نے العذرویہ کی بنیاد رکھی۔ شاہی خاندان کی ایک خاتون بنتِ عزّ الدین نے الاتابکیہ قائم کیا۔ خاتون عزیزہ نے المردانیہ کی بنیاد ڈالی۔ ایک اور مدرسہ الدّماغیہ قائم کیا گیا جو ایک جیّد عالم دین شجاع الدین بن الدماغ کی بیوی کی علم دوستی کا نتیجہ تھا۔

فاس میں جامعہ قرویین کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اور یہ ایک رئیس زادی جو فاطمہ کہلاتی تھیں، کے شوقِ علم کا نتیجہ تھا۔ بغداد کی بنت ابی یعقوب جو کہ مشہور ومعروف معلمہ تھیں، اپنے نام کو ایک مدرسۂ لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کھول کر پائندہ بنا دیا۔ مصر میں شہزادی عصمۃ الدین بنت العادل نے القطبیہ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا۔ اسی طرح مصر ہی میں ایک امیر شخص کی بیوی عشورا بنت ساروع نے ایک تعلیمی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔

بقیہ نظرات

ایوانوں میں زلزلہ سا آجاتا تھا، وہ چمن خاموش ہوگیا اجڑ گیا جس میں "آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی" کے جیتے جاگتے، ہنستے اور بولتے ہوئے پھول مہک رہے تھے، جمیل مہدی کی وفات ایک فرد کی ہی موت نہیں ہے بلکہ ایک دورِ حریت، آزادیٔ فکر و ضمیر، خودداری خود اعتمادی کے ایک درخشاں عہد کی موت ہے۔ دیوبند کے "خطۂ صالحین" (قبرستان قاسمی) میں سینکڑوں اولیائے کاملین، مفسرین، محدثین اور شہدائے کرام کے مزارات کے درمیان صرف جمیل مہدی کی تدفین عمل میں نہیں آئی بلکہ ملی دردمندی، خلوص، بے غرضی اور بے خوف اظہار خیال کی گراں قیمت روایات منوں مٹی کے نیچے دفن ہوگئی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس دورِ زوال و پستی میں جب کہ بہت سے قلم اور بہت سی زبانیں بازار کی ایک جنس بن کر رہ گئی ہیں، ان گراں مایہ قدروں اور روشن روایات کی بڑی اہمیت ہے جن کو جمیل مہدی نے اپنا خونِ دل و جگر دے کر زندہ رکھا اور آخر دم تک ان کو سینے سے لگائے رہے۔

حق تعالیٰ شانہ، مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے، قارئین کرام سے پرخلوص گزارش ہے کہ مرحوم کے لئے ایصال ثواب کا خاص اہتمام فرمائیں۔ یہ ادارۂ برہان اور خود راقم الحروف پر بہت بڑا احسان ہوگا۔!

ایک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی۔!!

از۔ عمید الرحمٰن عثمانی

برہان، اور ادارۂ ندوۃ المصنفین کی کشتی حیات کیسے کیسے طوفانوں اور کیسی کیسی خوفناک موجوں سے گذر رہی ہے، اس کی ایک اہم، اندوہناک اور دل دوز کڑی وہ حادثۂ فاجعہ ہے جو ۱۳ فروری کی صبح کو پیش آیا جس سے دل و دماغ کی کائنات اور ہوش و حواس کی دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا۔۔۔ برادر محترم جمیل مہدی کی وفات حسرت آیات ادارہ برہان کے لئے ایک خوفناک، لرزہ خیز اور تہلکہ انگیز واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے، حضرت والد ماجد مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی کی وفات حسرت آیات کے بعد ایک شجر سایہ دار سے محرومی تھی، مگر زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں ہولناک تپش اور دھوپ کی شدت کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ سہارے نظر آتے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی سرپرستی مجھے ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا حوصلہ دیتی تھی، ان کی شدید علالت اور سفر پاکستان کے موقع پر میرے بہنوئی جناب بھائی اظہر صدیقی نے میرا ساتھ دیا، دست تعاون بڑھایا اور کچھ عرصہ برہان کی ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے انجام دیں، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے انتقال کے بعد بھائی جمیل مہدی نے برہان کی ادارت سنبھال لی تو مجھے ایک گونہ اطمینان ہوگیا تھا مگر اس زندگی میں اطمینان و سکون تو

اب دولتِ گم گشتہ ہو کے رہ گئی ہیں بھائی جمیل مہدی بھی اس دنیا سے منہ موڑ کر چلے گئے ا
میں پھر ایک بار بے سہارا ہو کر رہ گیا ــــــ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور
سب لوگوں کو صبر کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین۔

براہ کرم دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ میری مدد فرمائیں اور میں حضرت مفتی
کی علمی یادگاروں کو "بادِ خزاں کے مسموم جھونکوں" سے محفوظ رکھ سکوں بلاشبہ حق تعالیٰ
محافظ حقیقی ہیں، وہی ہمارے حافظ و ناصر ہیں۔

جمیل مہدی کیا تھے اور کیا نہیں تھے یہ تو ملک بھر کے اخبارات و رسائل میں لک
جا چکا ہے مگر مجھے سب سے زیادہ ان کے خلوص اور بے لوثی و بے نیازی ک
شان اور اس تعلق کا احساس بہت دنوں تک بلکہ ہمیشہ یاد رہے گا جو گذشتہ دوس
میں مجھے ان کے اندر بدرجۂ اتم نظر آیا۔ میں تمام قارئین کرام سے خصوصی درخواس
کرتا ہوں کہ براہ کرم جمیل مہدی کے لئے بارگاہ رب العزت میں دعائے مغفرت
فرمائیں اور ان کے پس ماندگان کے لئے صبر جمیل کی توفیق کی دعا کریں۔ شکریہ۔
والسلام۔

غم آگیں
عمید الرحمٰن عثمانی
(ڈائریکٹر ندوۃ المصنفین و برہان دہلی)

تبصرہ

باب التقریظ والانتقاد

از محمد عبداللہ طارق دہلوی رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

مصنف ابن ابی شیبۃ جلد دہم (عربی)

تحقیق وتعلیق: مختار احمد الندوی

سائز: ۲۳-۱۵ سم

کاغذ عمدہ - طباعت معیاری ٹائپ

ضخامت: ۵۷۸ مع فہرست

جلد: فل ریگزین عمدہ مضبوط

ناشر: الدار السلفیۃ ۱۳- محمد علی بلڈنگ، بھنڈی بازار بمبئی ۴۰۰۰۰۳

زیر تبصرہ کتاب اپنے سیٹ کی دسویں جلد ہے اور اس کے بعد بھی کام جاری ہے، الدار السلفیہ نے محترم مولانا مختار احمد ندوی صاحب کی سرکردگی میں جو عظیم منصوبہ شروع کیا تھا وہ گویا مکمل ہو رہا ہے اور اس میں شک نہیں کہ الدار السلفیہ نے جو کثیر تعداد میں بڑی چھوٹی کتابیں شائع کی ہیں ان سب سے قطع نظر یہ ایک کام بھی اس کے لئے بڑا قابل فخر کارنامہ ہے۔

ابن ابی شیبہ تیسری صدی ہجری کے شروع کے اونچے محدث اور بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ابن ماجہ کے اساتذہ میں ہیں، ان کی اس کتاب کے بعض اجزاء اب سے پہلے

چھپے تھے مگر پوری کتاب تحقیق وتعلیق کے ساتھ نہ چھپی تھی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے م
مختار احمد ندوی صاحب کو کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ کتاب کو زندہ کر کے ناظرین کے ہا
تک پہنچا دیا بلکہ تحقیق وتعلیق کر کے کتاب کو اغلاط سے بھی بڑی حد تک پاک کر دیا۔ امی
بقیہ جلدیں بھی جلد چھپ کر منظر عام پر آجائیں گی۔

اتنے عظیم دفتر میں پورے اہتمام کے باوجود بھی کچھ بھول چوک ہو جانا کوئی عجیب با
نہیں ہے بالخصوص جبکہ کتاب میں سندیں بھی ہیں اور متون بھی، متن کی غلطی کا پکڑنا نس
آسان ہے سیاق وسباق اس میں رہنمائی کر دیتے ہیں مگر سند کی غلطیوں کا پکڑنا بہت
دشوار کام ہے اس لئے کہ بقول ابو اسحاق ابراہیم بن عبداللہ نجیرمی (م نحو ۳۵۵ھ) ک
اس میں نہ سیاق سے کوئی رہنمائی ملتی ہے اور نہ قیاس اس میں کچھ رہبری کر سکتا ہے (المؤ
والمختلف ص ۲ لعبد الغنی بن سعید الازدی)

چنانچہ خاص طور پر ہم سند کی بعض فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں تاکہ آئندہ
درست کیا جا سکے:

(۱) صفحہ ۲۶۷ سطر ۴ میں جو سند ہے اس میں ایک نام "ابو العدبس" جو کتا
کے دو مخطوطوں میں تھا محقق نے حذف کر دیا ہے اس لئے کہ سنن ابن ماجہ میں وہ نام نہ
تھا جبکہ سند ہو بہو وہی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ نام یہاں ہونا چاہئے اس لئے کہ "ابو العدبس" "ابو العنبس" کے
استاد ہیں جیسا کہ ابن ماکولا نے الاکمال میں (ج ۶ صفحہ ۱۸۰ و ۱۵۱) لکھا ہے، چنا
ابن ماکولا نے یہ سند ہو بہو اسی طرح نقل کی ہے جس طرح مصنف ابن ابی شیبہ کے قلم
نسخوں میں ہے یعنی ابو العنبس اور ابو مرزوق کے درمیان "ابو العدبس" موجود ہے، اگر
اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے۔

اسی سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ حاشیہ میں یہ نام "ابو العدلیس" دال ک

بعد یار (آخرالحروف) سے لکھا ہے، صحیح بار موحدہ سے ہے ع د ب تینوں مفتوح ہیں اور بار مشددہ ہے۔

سنن ابن ماجہ کی سند میں یہ نام نہ ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے نسخوں میں اختلاف ہے۔ حاشیہ پر ایک نسخے میں اس نام کی موجودگی کا بھی اشارہ دیا گیا ہے۔

(۲) صفحہ ۳۰۵ پر سطر ۳ اور سطر ۶ میں "جھبل" ہے جو طبقات ابن سعد سے لیا گیا ہے قلمی نسخوں میں جمیل (ج م ی ل) تھا۔ اور اتفاق سے یہی جمیل جیم میم اور یار سے اصابہ (ج ۲ ص ۱۷۱) میں ہے اور ابن ابی شیبہ کی اسی روایت نمبر ۹۵۱۵ کا حوالہ دیا ہے مگر درست جھیل ہے (ج ھ ی ل) جیسا کہ تاریخ کبیر بخاری (جلد ۲ قسم ۲ صفحہ ۲۴۴) اور ثقات ابن حبان (ج ۴ ص ۳۲۳) میں ہے، طبقات ابن سعد سے جو نقل ہوا ہے اس میں یار مثناۃ تحتیہ کے بجائے موحدہ آگئی ہے، یہ بھی غلط ہے۔

(۳) صفحہ ۳۳۲ سطر ۱۰-۱۱ میں چھپا ہے: ... أخبرنا حصين عن ابي اليقظان حصين بن يزيد الثعلبي ـــــ اس کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ ابوالیقظان کا نام حصین بن یزید ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے، محقق نے لکھا ہے کہ اس کا نام عثمان بن عمیر ہے اس لئے انھوں نے حاشیہ میں "کذا" لکھ کر اپنی بے اطمینانی کا اظہار تو کر دیا ہے مگر اس عقدے کا حل نہ کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں ابوالیقظان کے بعد "عن" چھوٹ گیا ہے یعنی ابوالیقظان نے حصین بن یزید الثعلبی سے روایت لی ہے چنانچہ امام بخاری نے تاریخ کبیر (ج ۲ ق ۱ ص ۷) میں بعینہٖ یہی روایت اسی سند سے بیان کی ہے، وہاں یہ "عن" موجود ہے اور ابن حبان نے الثقات (ج ۴ ص ۱۵۸) میں لکھا ہے کہ حصین بن یزید ثعلبی حضرت ابن مسعود سے روایت کرتے ہیں اور حصین سے ابوالیقظان روایت کرتے ہیں۔

(۴) صفحہ ۳۴۳ حدیث نمبر ۹۶۱۳ ... عن الجويري عن ابي الورد عن ابن اعبد ا د

ابن معبد قال: قال علی ...

محقق نے لکھا ہے "یہ تصحیح اسی کتاب کی کتاب العقیقہ کی مدد سے کی گئی ہے، اصل کے دونوں نسخوں میں یہاں "ابن عبد" تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہاں اور کتاب العقیقہ میں جو کچھ ہے سب محرّف ہے صحیح "ابن اغید" ہے بالهمزة واسكان الغين المعجمة وفتح التحتية ــــ اس نام میں تقریب کے نسخوں میں تحریف ہو گئی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے لسان المیزان (ج ۶ ص ۱۸۲) میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں اور ان سے ثمامۃ الوالورد روایت کرتے ہیں، یہ بعینہٖ وہی سند ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ لہٰذا یہاں اور کتاب العقیقہ دونوں جگہ درست کرنے کی ضرورت ہے۔

جدید علمی طریقے کے مطابق احادیث پر نمبرات بھی دیے گئے ہیں اسی طرح ابواب پر بھی نمبر ہیں اور ابواب اور کتاب کا ایک ہی تسلسل ہے یعنی کتاب الدعاء کا نمبر مثلاً: ۳، ۱۵ ہے تو اس کے ذیلی عنوان کا نمبر ۴، ۱۵ ہے۔

آج کے طرز تحقیق میں عربی میں یہ بھی ضروری چیز ہے کہ مشکل الفاظ اور غیر مانوس صیغوں پر اعراب دیدے جائیں یہ گویا اشاروں کی زبان میں لفظ کی شرح ہوتی ہے، اس سے پڑھنے والوں کو بڑی سہولت ہو جاتی ہے، یہ اہتمام اس کتاب میں نہیں ہو سکا ہے جس کی بڑی وجہ غالباً طباعت کی دشواری ہے، ہندوستان میں ایسے پریس ناپید تو نہیں مگر ابھی ایک دو ہی ہیں جہاں ہر سائز کے تمام حروف اور جملہ اعراب دستیاب ہوں اور جہاں ہیں بھی وہاں کمپوزیٹران ابھی اتنے ماہر نہیں ہیں کہ ان تمام نزاکتوں کا لحاظ رکھ سکیں۔

یہ چند چیزیں فاضل محقق کی توجہ کے لئے عرض ہیں۔ امید ہے آئندہ تحقیق کا معیار مزید بلند ہوگا ہم اس عظیم کارنامے پر مولانا مختار احمد ندوی صاحب اور ان کے رفقاء کو اور

کارکنان الدار السلفیہ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایسے ہی کسی اور اہم حدیثی دفتر کو زندہ کرنے کی طرف توجہ کریں گے۔

محمد عبد اللہ طارق
۱۴۸ - حضرت نظام الدینؒ
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

خریدارانِ برہان کی خدمت میں

ایک ضروری گذارش

ماہنامہ برہان کے مفکر ملت نمبر کی اشاعت ماہ دسمبر میں ہوئی اس لیے دسمبر کا عام شمارہ شائع نہیں ہوسکا اس لئے خریدار حضرات کی مدت خریداری میں ایک ماہ کا اضافہ کردیا گیا۔

---

(۲) جو خریدارانِ محترم مفکر ملت نمبر حاصل کرنا چاہیں ان کو چاہئے کہ مبلغ 1.50 روپے (زائد قیمت اور خرچ رجسٹری ڈاک) بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں ان کی خدمت میں مذکورہ نمبر بلا جلد بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ارسال کر دیا جائے گا۔

والسلام

منیجر
ادارۂ برہان
اردو بازار
جامع مسجد دہلی ۶

۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب)، جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب اور [illegible]

۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹-۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے، عرب دنیا،
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں۔ معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک۔

۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم۔ تاریخ ردہ، سرکشی ضلع بجنور۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، ایشیا میں آخری نو آبادیات

۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم، رموز عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء — حیات عبدالحیؒ، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر۔ انتخاب الترغیب والترہیب۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سرایہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔
اشاعتِ اسلام یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ جارج برنارڈ شا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

جلد ۱۰۱ | رجب المرجب ۱۴۰۸ھ مطابق مارچ ۱۹۸۸ء | شمارہ ۳

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی میں چھپوا کر
دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

پورے ملک کے سماجی اور سیاسی نظام کو تعصب، نفرت، دہشت گردی، تفریق، نفاق
اختلاف، انتشار، بغض، کینہ، حسد، شر انگیزی، لسانی اور طبقاتی کشمکش کے مہلک امراض
اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ہمارے اِرد گرد کے ماحول میں خوف وہراس کی فضا چھائی ہوئی
ہے اور یہ صورت حال یقیناً انتہائی تشویشناک اور قابل توجہ ہے۔ بداعتمادی، بے اعتباری
اور جنگ وجدل کے ماحول اجتماعی طور پر ہمارے دل ودماغ کو متاثر کیے جارہے ہیں۔ ہم
کہاں جارہے ہیں؟ کدھر جارہے ہیں؟ اور ہماری منزل مقصود کیا ہے؟ یہ ایسے بنیادی اور
اہم سوالات ہیں جن کی طرف فوری سنجیدہ توجہ کی ضرورت ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ
مجموعی طور پر قوم وملت کے ذی شعور افراد اور دانشور طبقے اس معاملہ میں تساہل برت
رہے ہیں۔

یہ اصولی حقیقت ہے کہ "اچھا معاشرہ اچھے افراد سے بنتا ہے" اور دنیا کی تاریخ
اس بات پر شاہد عدل ہے کہ دنیا کے کسی بھی مذہب کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ اچھے
افراد مذہب اسلام میں پیدا ہوئے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اسلام نے ہمیشہ شخصیت کی
کی تعمیر اور فرد وجماعت کے اخلاق کی تطہیر پر زور دیا ہے، وہ آدمی سے اچھے کردار کا
مطالبہ کرتا ہے نہ کہ صرف گفتار کا۔ انسانی زندگی کے جملہ تقاضوں، اس کی ذہنی، فکری،

جسمانی اور روحانی بالیدگی اور ارتقاء کو اسلام فکری انداز سے پورا کرنے کا قائل ہے۔ اسلام اپنے پیروکاروں کو دوسروں سے محبت کرنا سکھاتا ہے نہ کہ نفرت وعداوت۔ وہ اپنے ماننے والوں میں انسانیت، شرافت، اخلاق اور مروّت کے اعلیٰ اقدار دیکھنے کا خواہاں ہے نہ کہ حیوانیت، شیطنت اور بداخلاقی کے جراثیم وامراض۔

اسلام بحیثیت تخلیق پوری نوع انسانی کو ایک "وحدت" اکائی اور کنبہ سمجھتا ہے، اس کا فلسفہ ہے کہ بحیثیت خالق اللہ تعالیٰ کی ذات وحدہٗ لاشریک ہے اور تخلیق و پیدائش کے اعتبار سے انسان ایک ہی جنس کی مختلف کڑیاں ہیں، اسلام تواضع، انکساری، ایثار وقربانی، حلم وبُردباری اور عزم وہمت، عالمی اور انسانی مذہب ہے۔ اس کے باوجود دَورِ حاضر میں ہمیں اِس تلخ حقیقت کے ماننے سے بھی انکار نہیں ہے کہ آج مجموعی طور پر ہمارا معاشرہ ابتری کا شکار ہے۔ ملت اسلامیہ جس پستی اور انحطاط کے دَور سے گذر رہی ہے وہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ مسلمان آج نہ صرف مُلکی بلکہ عالمی سطح پر بے کردار کیوں ہو رہا ہے؟ ان میں ہی زیادہ تر سنگین نوعیت اور بھیانک قسم کے جرائم کیوں پھیل رہے ہیں؟ اگر ہم بے لاگ انداز سے اپنا محاسبہ کریں تو پتہ چل جائے گا کہ ہمارا زوال خود ہمارے اعمال کا براہ راست نتیجہ ہے۔ اسلام نے زندہ رہنے کا جو ہمیں گُر سکھایا تھا اُسے ہم نے نظر انداز کر کے فراموش کر دیا اور اُن راہوں پر چل پڑے جو بظاہر ہیں تو پُرکشش لیکن وہ زوال پذیر قوموں کی گذرگاہیں ہیں۔ وہی تن آسانی، عیش وعشرت، لذّتِ نفس کی راہیں جن پر ہزاروں قافلے گذرے اور دنیا سے مٹ گئے۔ عروج وزوال کے لئے قدرت کا بنایا ہوا قانون اٹل اور بے لچک ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ زوال کی راہوں پر چل کر ایک گروہ عروج حاصل کرے اور دوسرا پستی ونکبت سے دوچار ہو جائے۔ خواہ کوئی بھی اس راہ پر چلے قدرت کے مقرر کردہ اصولوں اور نتائج سے اُسے بہرحال

دوچار ہونا پڑے گا

یہ صحیح ہے کہ موجودہ وقت میں ہمارے معاشرے کی تقریباً وہی حالت ہے جو ظ
اسلام کے وقت لوگوں کی تھی اور جس کی بہترین تصویر کشی حبشہ کے بادشا
نجاشی کے بھرے دربار میں مظلوم مہاجر مسلمانوں کے وفد کے قائد سی
جعفرؓ بن ابی طالب نے اپنی معرکۃ الآرا تقریر میں کی تھی۔ ہمیں یہ مان
چاہیئے کہ ہم دن بدن اخلاقی پستی کی طرف گرتے چلے جارہے ہیں۔ چھو
بڑی اور نئی و پرانی ایسی کوئی برائی نہیں جو مسلم معاشرہ میں وبا
صورت میں پھیل کر ہمارا مذاق نہ اُڑا رہی ہو۔ غور کیجئے! مجموعی طو
پر اس قوم کا حال ہو رہا ہے جس کا کام نہ صرف برائی سے بچنا تھا بلکہ انسا
کو برائی کے ارتکاب سے روکنا بھی تھا۔

"اَلنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ" (التوبہ) جس کا طرۂ امتیاز اور صفت تھی، ہما
معاشرے میں کبائر اور سنگین جرائم کا ارتکاب جس طرح عام ہو رہا
اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے "خیر الامم" کے لقب سے سرفرا
کی جانے والی قوم اپنا ماضی بھلا بیٹھی ہو۔ اپنا ملی کردار کھو چکی ہو او
اپنی انفرادیت فراموش کر چکی ہو۔ یہ صورت حال بڑی الم انگیز ہے

معاشرتی اور سماجی برائیوں کی مثال ایسی ہے کہ ان کے وبال اور نتا
سے معاشرے کے وہ افراد بھی نہیں بچتے جو بظاہر ان میں شریک نہ ہوں
ایک ہی کشتی میں سوار بظاہر کچھ لوگ ڈوبنے سے اس لئے نہیں بچ سکت
کہ وہ سوراخ کرنے میں شریک نہیں تھے۔ ایک گھر کے کچھ مکین اگر گھر کو
آگ لگا دیں تو اس گھر کے دوسرے مکین جلنے سے تو اس لئے نہیں بچ سکت

کہ انھوں نے آگ نہیں لگائی، مکافات عمل کا یہ فطری قانون اور منطقی نتیجہ ہے۔ اسی حقیقت کی طرف قرآن کریم کی سورۂ انفال کی اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے:

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً (انفال)

اس عذاب سے بچو جو صرف ان لوگوں پر ہی نہیں آتا جو تم میں سے ظلم کے مرتکب ہوں۔

اس وقت بلا مبالغہ بگاڑ اس قدر پھیل گیا ہے کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہا۔ اصلاح حال کے لئے ہمیں اپنے کام کی ابتدا وہاں سے کرنی ہوگی جہاں سے خاتم النبیین، رسول رحمت جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت کے بگڑے ہوئے معاشرۂ انسانی کی اصلاح کے لئے کام کی ابتدا کی تھی اور انہی خطوط اور حدود میں اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہوگی جس کی رہنمائی قرن اول کے مسلمانوں کی دینی، علمی، دعوتی، تبلیغی، اصلاحی اور سیاسی زندگی میں ملتی ہے۔ ہمیں اپنے عقائد کو ٹھوس بنیادوں پر استوار کرنا ہوگا، اسلام کی مقرر کردہ عبادات کو ان کی روح کے ساتھ عام کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا، معاملات کو صحیح اسلامی خطوط پر درست کرنا ہوگا۔ معیشت کا ایسا نظام قائم کرنا ہوگا جو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ہو۔ انسانیت، محبت، شرافت اور اخلاق کے اعلیٰ اور عظیم اقدار کے فروغ کے لئے تعمیر سیرت اور شخصی کردار کی طرف پوری توجہ دینی ہوگی۔ موجودہ بے اصول سیاست کو صحیح اسلامی تصور سیاست سے آشنا کرکے اس کو حسن انتظام اور خدمت خلق کی عظیم روایات سے ہمکنار کرنا ہوگا۔ مروجہ علوم و فنون کے بگڑے ہوئے مزاج کو درست کرنے کی سبیل کرنی ہوگی۔ نئے علوم وفنون

کی تحویل قبلہ کرنی ہوگی اور مادیت کی طرف سے ان کا رُخ موڑ کر روحانیت کی طرف کرنا ہوگا۔ فساد کے ان سوتوں کو بند کرنا ہوگا جہاں سے برائی نکل کر پھیلتی ہے۔ اصلاح کا کام اس وقت تک مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتا جب تک کہ ہر محاذ پر بیک وقت بُرائی اور استحصال کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کیا جائے گا۔ یہ سارے کام مشکل اور دشوار طلب ضرور ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ یہی کام کرنے کے ہیں، یہی وقت کا تقاضا بھی ہے اور مجموعی طور پر ملتِ اسلامیہ کا فریضہ بھی۔

انسانیت کے خیر خواہ اور بہی خواہ شب و روز ارتقائے انسانیت کی جدوجہد میں مصروف رہیں تو انسانیت کے حریف اور دشمن بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہتے۔ جہاں اور جس جگہ عوام کے ہمدرد، محب وطن اور انسان دوست افراد صلاح و فلاح کی دعوت دیں گے وہاں شر کے حامی بھی اپنے ابلیسانہ اور عیارانہ ہتھکنڈوں سے لیس ہو کر پہونچ جائیں گے۔ اچھے لوگوں کی اگر یہ کوشش اور دعوت ہوگی کہ نیک کام کرنے سے انسان کو حقیقی مسرت اور خوشی حاصل ہوتی ہے تو بدی کے فروغ کے خواہشمند بھی تشدد، نفرت، فرقہ واریت، لوٹ مار، قتل و غارت اور دوسری شیطانی خصلتوں میں مخلوق خدا کو مبتلا کرنے کے لئے اخلاق باختہ سماجی برائیوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ انانیت اور شرافت کے ازلی دشمنوں سے نپٹنے اور ان پر غالب آنے کا سب سے آسان راستہ یہ ہے کہ ہم صرف ذہنی اور فکری طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر

مکمل مسلمان ہوں۔

آزادی کی چار دہائیاں پوری ہو جانے کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ملک ذہنی، عقلی، فکری اور سماجی اعتبار سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہو سکا ہے۔ آزاد ہندوستان میں انسانی زندگی اور مسائل حیات تو بے حد و بے شمار ہیں اور اس کی تفصیل کا یہ موقع بھی نہیں ہے۔ تاہم ملک کی آزادی کے بعد تعمیر و ترقی کا جو دور شروع ہوا اس کے عمومی فوائد اور نتائج براہ راست سماج کے غریب، کمزور، دبے کچلے اور پسماندہ طبقوں تک قابل ذکر حد تک نہیں پہونچ پائے۔ سماج کے غریب اور کمزور طبقوں کے ساتھ مسلسل حق تلفی، ناانصافی اور استحصال کا عمل جاری ہے۔

قضا و قدر کے فیصلے اور قدرت کا نظام، اس وقت ہمارے ملک کے اکثر علاقے یا تو سوکھے اور خشک سالی کی زد میں ہیں جبکہ بعض حصوں میں بے پناہ بارش اور سیلاب نے جانی و مالی اعتبار سے ناقابل تلافی نقصان پہونچایا ہے، اور اس کا اثر بھی براہ راست اور زیادہ تر دیہاتوں اور قصبات میں رہنے والے غریبوں اور کسانوں پر پڑا ہے۔ اگرچہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں عوام کے فلاح و بہبود، باز آباد کاری اور ان کے اونچا اٹھانے کے لئے مقدور بھر کوشش اور جد و جہد کر رہی ہیں لیکن اس کا بھی اظہار یہاں ضروری ہے کہ اس کا فائدہ بھی بعض قوتوں کو ہی زیادہ پہونچ رہا ہے اور اس طرح حق دار اپنے بنیادی

حقوق اور امداد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ملک کے ارباب اقتدار و اختیار محض زبانی دعاؤں اور بیان بازیوں سے کام نہ لیں بلکہ موقع پر جاکر حالات کا عملی جائزہ لیں اور غریب و ضرورت مند لوگوں تک حکومت کی راحت رسانی اور تعمیر و ترقی کے زیادہ سے زیادہ فوائد پہونچانے کی کوشش کریں۔

ملک کا ایک اہم داخلی مسئلہ مختلف مذہبی، لسانی اور تہذیبی اکائیوں کے مابین اعتماد و اعتبار کی فضا کو بڑھاوا دے کر قومی یک جہتی کے کاز کو تقویت دینا ہے، اگرچہ مختلف فرقوں کے درمیان خلیج اور بعد کو بڑھاوا دینے کے ذمہ دار ہمارے موجودہ سیاست دانوں کے علاوہ حکمراں طبقہ بھی ہے تاہم اس کے انسداد کے لئے اخلاقی، روحانی اور جمہوری اقدار کو اجاگر کرنے کے ساتھ تمام جماعتوں کے سربراہوں، سیاسی، سماجی اور مذہبی رہنماؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ذاتی، وقتی اور پارٹی مفادات سے بالاتر ہوکر قومی مفاد کے تحفظ اور ملکی یکجہتی کے لئے کمربستہ ہوجائیں۔ اور یہی ایک راہ ہے متحدہ قومیت کے بقا کی۔ ؏

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

میرے بھائی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحب

جناب شمس نوید عثمانی

معروف و درد مند اہل قلم جناب شمس نوید عثمانی کی یہ مختصر مگر پُر اثر تحریر ـــــ برہان کے "مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر" ـــــ کے لئے لکھی گئی تھی مگر یہ دفتر برہان میں اس وقت وصول ہوئی جب مذکورہ نمبر ترتیب، کتابت وطباعت کے تمام مراحل سے گذر چکا تھا اس لئے اب اس کو برہان میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

اپنے خاندان عثمانی کے جن بزرگوں کو "سُننے" کا ہی موقع ملا، 'دیکھنے' کا نہیں، اس لئے کہ وہ دنیا میں میرے آنے سے پہلے یا ہوش میں آنے سے پہلے یا ہوش میں آنے سے پہلے ہی جا چکے تھے! ـــــ ان میں سے مجھے سب سے زیادہ عقیدت روحانی جس خون کے رشتے والے بندۂ خدا سے محسوس ہوئی وہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے والد ماجد حضرت مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی ہیں! ـــــ جو میرے بڑے چچا یا 'تائے' دیوبند کی زبان میں تھے! ـــــ

اور ـــــ

خود مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح یا واقعات میں سب سے زیادہ

جس واقعہ نے مجھے اپیل کیا اور وہ میرے لئے اللہ کی رحمت سے سفرِ حیات کے زادِ راہ میں شامل ہو گیا وہ مختصراً حسب ذیل ہے :-

"اپنی بیوی یعنی میری تائی اماں مرحومہ سے ان کے حسن معاشرت نے مجھے اپیل کیا اور پڑوس کی بیکسوں، بیواؤں کے ساتھ مفتی صاحب کے غمگسارانہ حسن معاشرت نے گہرا اثر ڈالا۔ سنا یہ ہے کہ ہماری تائی اماں کی گفتگو نرم کم اور گرم زیادہ تھی۔ حضرت مفتی صاحب کے 'ضبط' کا یہ عالم تھا کہ وہ ان کی ہر گرمی کے جواب میں نرم ترین نرمی کی شان سے "گرم" ہوتا تھا!!۔ یعنی جس بات پر تائے ابا کو غصہ ۔۔۔ بشری طور پر غصہ آجاتا تو اس کی پہچان یہ نہ تھی کہ ان کی آواز غصہ کے پارے کے ساتھ چڑھتی اور بلند ہوتی جائے!۔۔۔ بلکہ یہ تھی کہ غصہ کا پارہ جوں جوں چڑھتا جاتا تھا آواز پست تر ہوتی چلی جاتی تھی یہاں تک کہ اگر آواز محض زیر لب ہونٹوں کی سرسراہٹ تک ڈوب جائے تو سمجھ لیا جائے کہ اس وقت ان کا عتاب بشری اپنے شباب اور نقطۂ عروج پر ہے؟۔

حقیقت میں شب بیداریاں اور روزہ داریاں سب اس کے آگے آسان تر ہیں کہ جذبات نفسانی کی تیز و تند آندھیوں اور زلزلوں میں اپنے اندرون کے گھر کا ایک پتہ بھی نہ ہل رہا ہو ۔۔۔ ایک ذرہ کو بھی اپنے مقام سے ہلنے کی اجازت نہ مل رہی ہو۔

حقیقت میں یہ مومن کا دوہرا کردار تھا۔ جس کے ذرّے کے آگے پہاڑ بھی بے وزن ہیں ۔۔۔ دوہرا اس لئے کہ ایک طاقت ور 'مرد' کا ردِّ عمل تھا ایک کمزور اور نابہ بنائی گئی 'عورت' کے مقابلے میں!!۔ اسی جگہ تو پیغمبر اسلام ؐ نے ہم سے ہمارے 'مسلمان' ہونے اور 'عبد' ہونے کی

عملی دلیل و شہادت طلب کرتی — ان کے نزدیک وہی 'بندہ' جس کی باندی اور بیوی کی شکل میں کمزور بندی یہ گواہی دیدے کہ یہ میری کمزوری کے آگے اس لئے شیر نہیں ہو پاتا کہ اس کے پیش نظر ہمیشہ اس 'معبود' کی ذات رہتی ہے جس کا وہ بھی خود ایک بندہ ہے اور اس کی بیوی بھی اسی کی تخلیق اور بندی ہے — اور جس نے محض سنّت کے اور خدا کے نام پر اپنی آزادی کی قربانی شوہر کے تابع ہوکر رہنے کی قربان گاہ پر دیدی ہے اس کے یا شوہر کے نفس کی قربان گاہ پر نہیں! — اس لئے شوہر کو حق نہیں پہونچتا کہ اپنے نفسانی جذبات کے وقت وہ اپنی 'شریک حیات' سے یہ مطالبہ کرے کہ یہاں میرے مقابلہ میں نیچی نظر آؤ! — مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے بھی مفتی باپ کا یہ اُسوۂ حسنہ تھا کہ وہ نفس کے غیظ و غضب کے وقت خوفِ خدا سے مغلوب ہوکر پہلے اپنے آپ 'بندہ' ہونے کا عملی ثبوت دیتے تھے اور پھر— پھر خاموشی سے گویا 'بیوی' سے 'بندگی' کے ثبوت کی امید فرماتے تھے! —

— 'بیوی' ہی نہیں، ہمسائیگی کے لحاظ سے ہر کمزور 'بیوہ' کا بھی یہ تجربہ تھا کہ وہ ان کی تکلیف لیتے تھے اور اپنا آرام انھیں دیتے تھے! — برسات کی آمد سے پہلے ان بیواؤں کی کچی چھتوں پر یہ پکّا مسلمان ایک 'بلا مزدوری والا مزدور' بن کر مٹی کوٹتا نظر آتا تھا اور روزانہ اپنا سودا لاتے ہوئے اس کی کمر پر محلے بھر کی بیکسوں کے سودوں کی الگ الگ پوٹلیاں اور بنڈل سوار ہوتے تھے۔"

یہ تھا مفتی صاحب کے مفتی صاحب کا کردار! — ایک ایسے باپ کے بیٹے میرے سامنے دو تھے۔ ان میں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ہمارے دیو بند سے دور دہلی میں تھے

اور دوسرے صاحبزادے خود دیوبند میں قریب تر تھے لیکن یہ دور افتادہ دہلی والا تائے زاد بھائی جب بھی ہمارے قریب گھر یا سفر میں آیا ہم حیران ہوکر رہ گئے کہ وہ روحانی طور سے ان بھائی صاحب سے زیادہ ہم سے قریب نظر آیا کہ جو دیوبند میں تھے!۔ اپنے والد کا یہ ورثہ بھی انھیں بطور خاص ملا تھا کہ حقوق العباد کو ایک لحاظ سے حقوق اللہ سے بھی زیادہ اہمیت دی جائے!۔ اس لئے کہ حقوق اللہ کی معافی اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے مگر حقوق العباد کی معافی بندوں ہی کے پاس رکھی ہے؟۔ اور بندے؟ بندے کے لئے معاف کرنا اور بھول جانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا خدا کے لئے آسان ہے!۔ دوسری طرف ٹھیک اپنے والد مرحوم کی طرح مفتی عتیق الرحمن عثمانی کو بھی اپنی زندگی کے نصف آخر میں اپنی مرحومہ بیوی کی ناز برداری کا مجاہدہ کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ ان کی بیوی مفتی صاحب کی زندگی کے نصف اول میں یہی مجاہدہ خود کر چکی تھیں لیکن۔ یعنی اول دور میں بیوی کو گرمی کے جواب میں نرمی کا صحرا کے ریاضت طے کرنا پڑا مگر پھر بیوی کی اس بندگی نے آخر اپنے شوہر کو بھی بندگی کے اسی امتحان میں ہنسی خوشی اترنے کی تحریک بخش دی اب بیوی کا مقام اپنے شوہر پر ناز کرنا تھا اور شوہر کا کام عمر بھر اسی بیوی کے ناز اٹھانا۔

۔ گویا مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ تو اس مجاہدے کے اول و آخر کامیاب مجاہد اور شہید حق تھے مگر ان کے بیٹے اور میرے بھائی عتیق الرحمن صاحب کا نصف آخر حیات آخر کار اتنے بڑے باپ کی سیرت کا شاہکار اور آئینہ دار بن گیا تھا!۔ ایک لحاظ سے یہ بیٹے کی کمی ہے اور باپ کی فضیلت!۔ مگر دوسرے زاویئے سے بیٹا، باپ سے آگے نظر آتا ہے: اس لئے کہ گناہ نہ کرنا ملکوتیت کی شان ہے مگر گناہ میں پھنس کر ملکوتیت تک اڑ جانا صرف معراج بشریت ہے؟۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دار السلام میں۔ جنت الفردوس اور خلق عظیم والے حضورؐ کے پڑوس میں دائمی رفاقت و معیت کا تحفہ عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

••

غزوۂ احد میں مسلمانوں کی ہزیمت کے اسباب

قرآن، حدیث اور تاریخ کی روشنی میں

سید امین الحسن رضوی

احد کی جنگ، ۷ شوال ۳ھ ہجری میں واقع ہوئی، اس میں مسلمانوں کی تعداد سات سو اور کفار قریش کی تعداد تین ہزار تھی۔ تمام کتب تاریخ اس بات پر متفق ہیں کہ اس جنگ میں اول مرحلہ میں مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا اور قریشِ مکہ پسپا ہونے لگے لیکن بعد کو پانسہ پلٹ گیا اور بظاہر ہوتی ہوئی فتح، شکست نہ بھی سہی تو مسلمانوں کی یک گونہ ہزیمت میں تبدیل ہو گئی۔ اس صورت حال کے پیدا ہو جانے کے بارے میں بھی اجمالاً کتب تاریخ متفق ہیں کہ اس کا باعث دو باتیں ہوئیں۔ ایک تو مسلمانوں کا پسپا ہوتے ہوئے لشکرِ قریش کا تعاقب سے رک کر مالِ غنیمت کو جمع کرنے میں لگ جانا اور دوسرے مسلمان تیر اندازوں کے اس دستہ کا، جسے آنحضور صلعم نے کوہ احد کی ایک گھاٹی پر متعین فرمایا تھا کہ اس طرف سے حملہ نہ ہونے دیں، درہ کو چھوڑ کر ہٹ جانا اور مال غنیمت جمع کرنے والوں میں شامل ہو جانا جس کے باعث خالد بن ولید کو (جو اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) اس بات کا موقع ملنا کہ وہ اس طرف سے آکر مسلمانوں پر پہلو سے حملہ آور

ہوں۔ میرا خیال ہے کہ مختلف پہلوؤں سے یہ تاریخی واقعہ زیادہ گہرائی سے مطالعہ کا متقاضی ہے۔

غزوات نبوی کے بارے میں یہ بات مستحضر رہنی چاہئے کہ ہر غزوہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیاتِ قرآنی کے ذریعہ جو اس غزوہ کے متصلاً بعد نازل ہوئیں، اس غزوہ پر مجملاً اور کبھی نسبتاً تفصیل سے تذکرہ فرمایا ہے جبکہ متعلقہ واقعات معہ اپنی جزئیات کے متعدد لوگوں کے ذہن میں تازہ تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ ان واقعات کے بہ کثرت چشم دید گواہ موجود تھے۔ اگر قرآن میں بیان کردہ ان واقعات اور اس کی جزئیات میں جو قرآن میں بیان ہوئیں کوئی ذرا سی بات بھی خلاف حقیقت ہوتی تو کفار و منافقین کی زبانیں اس کی تردید میں بے محابا حرکت میں آجاتیں اور خود مسلمانوں کے دل میں قدرتاً ان آیات کے وحی الٰہی ہونے کے بارے میں شبہ پیدا ہو جاتا۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہوا اور آج چودہ سو سال گذرنے تک ان واقعات کے کاملاً صحیح ہونے کے بارے میں اسلام کے بدترین مخالف و معاند کو بھی شبہ کے اظہار کی جرأت نہیں ہوئی اور اس بنا پر یہ بات پورے اعتماد اور بلا خوف تردید بلکہ بطور چیلنج کہی جاسکتی ہے کہ اس طرح ان واقعات کا جس مستند ترین انداز کا ریکارڈ تاریخ میں محفوظ ہوگیا ہے اس کی ہمسری ممکن نہیں۔ لہٰذا جنگِ احد میں مسلمانوں کی ہزیمت کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے بھی آیاتِ قرآنی سے استناد کیا جائے گا جس سے واقعات کی صحت پر کلام کرنے کا محل باقی نہیں رہے گا البتہ جو نتائج ہم اخذ کریں گے ان سے اختلاف کی گنجائش باقی رہے گی۔

جنگِ احد کے مختلف مرحلوں کو پہلے ذہن میں تازہ کرلیں۔ اس جنگ میں آنحضورؐ نے لشکر اسلام کو اس طرح کھڑا کیا تھا کہ اس کی پشت پر احد کی پہاڑی تھی اور دائیں و بائیں بھی اس کا پہاڑی سلسلہ چلا گیا جو داہنی سمت تو بالکل مستحکم تھا البتہ بائیں سمت میں ایک درّہ تھا جس میں سے آدمی گذر سکتے تھے۔ سامنے احد کا میدان تھا، اس

طرح لشکرِ اسلام اپنی پشت کی طرف سے اور دائیں پہلو سے کسی بھی حملہ سے بالکل مامون تھا صرف بائیں طرف کے درّہ سے اس پر حملہ کا امکان تھا اور اس کے دفاع کے لئے آنحضورؐ نے یہ اہتمام فرمایا کہ اس کے دہانے پر حضرت عبداللہ بن جبیر کی زیرِ کمان ۵۰ تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین فرما دیا کہ اگر اس طرف سے دشمن حملہ کرنے کی کوشش کرے تو اس کو روکا جا سکے۔ اس موقعہ پر جو ہدایت آپ نے اس دستہ کو دی تھی وہ ان الفاظ میں تھی:
"اگر تم لوگ یہ دیکھو کہ احد کے چیل کوّے اور گدھ ہماری لاشوں کا گوشت نوچ کر کھا رہے ہیں تو بھی اس جگہ سے نہ ہٹنا۔"

جنگ کا آغاز حسبِ معمول کفار قریش کی طرف سے مبارزت طلبی سے ہوا۔ پہلے قریش کے نامور سردار طلحہ نے اپنے سے مقابلہ کے لئے مسلمانوں کو للکارا۔ سپہ سالار فوج آنحضور صلعم کے ایما پر حضرت علیؓ صفوں سے نکل کر اس سے نبرد آزما ہوئے اور اسے واصل جہنم کیا۔ اس کو دیکھ کر اس کا لڑکا بپھرتا ہوا میدان میں آیا اور مبارزت طلب ہوا۔ آنحضورؐ نے اس دفعہ اپنے محبوب چچا سید الشہداء حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کو مقابلہ کا اشارہ کیا جنھوں نے بہ آسانی اپنے مقابل کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس کے بعد جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی اور کفار کی عددی برتری اور بہتر اسلحہ کے باوجود شروع ہی سے مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا اور رفتہ رفتہ قریش پسپا ہونے لگے۔ مسلمان ان کو دھکیلتے اور رگیدتے ہوئے آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ لشکرِ قریش اپنے خیموں (camps) سے بھی پیچھے ہٹ گیا اور اس کی صفیں منتشر ہو گئیں۔ اس نوبت پر مسلمانوں نے تعاقب وقتال ترک کر کے لشکریوں کے خیمہ سے مالِ غنیمت جمع کرنا شروع کر دیا۔ یہ صورت حال جب اس دستہ نے دیکھی جو درّہ پر متعین تھا تو یہ سمجھ کر کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور مسلمان فتح یاب ہو چکے ہیں، اس دستہ کے سپاہیوں نے اپنے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر کے روکتے رہنے کے باوجود درّہ چھوڑ دیا اور میدان میں آکر دشمن کے خیموں سے

مالِ غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے۔

اُدھر پسپا ہوتے ہوئے لشکرِ قریش نے جب یہ دیکھا کہ ان کا تعاقب نہیں ہو رہا ہے تو انھیں اپنی ہزیمت پر غیرت آئی۔ ان کے سرداروں نے ان کی پھر سے صف بندی کی اور یہ لوگ منظم ہو کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے جن کی صف بندی ختم ہو چکی تھی اور اکثر مسلمان مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف (حضرت) خالد بن ولید نے جو اس سے پہلے دو دفعہ اس درّہ کی طرف سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ناکام کوشش کر چکے تھے۔ جب درّہ کو محافظوں سے خالی پایا تو اس طرف حملہ کر دیا اور حضرت عبداللہ بن جبیر اور ان کے پانچ ساتھیوں کو جو ان کے ساتھ باقی رہ گئے تھے شہید کر کے درّہ میں سے گذر کر مسلمانوں پر ان کے بائیں پہلو سے حملہ آور ہو گئے۔ اس طرح غیر صف بند مسلمانوں پر سامنے سے قریشِ مکہ نے یلغار کی اور بائیں پہلو سے (حضرت) خالد بن ولید اور ان کے زیر کمان دستہ حملہ آور ہو گیا۔ نتیجہ میں مسلمانوں میں افراتفری مچ گئی اور جنگ کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔ اس وقت اگر کفار کچھ اور استقامت دکھاتے اور جنگ کو جاری رکھتے تو بظاہرِ اسباب مسلمانوں کی مکمل شکست یقینی تھی اور اس کے جو بھیانک عواقب ہوتے ان کا بس تصور ہی کیا جا سکتا ہے لیکن مشیّتِ الٰہی کے تحت چراغِ مصطفیٰ کو ضیاء بار رہنا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے (حضرت) ابوسفیان کے دل میں جو اس وقت لشکرِ قریش کی قیادت کر رہے تھے (جو بعد کو فتح مکہ کے وقت مشرف بہ اسلام ہوئے) یہ بات ڈالی کہ بدر کی شکست کا انتقام مکمل ہو گیا اور جنگ اسی غیر فیصلہ کن مرحلہ میں ختم کر دی جائے، حالانکہ (حضرت) خالد بن ولید نے اصرار بھی کیا کہ جنگ جاری رکھی جائے اور بدلی ہوئی سازگار حالت کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔

جنگ کا حال جو اوپر مختصراً عرض کیا گیا اس سے مسلمانوں کی دو غلطیاں بالکل

ج طور پر سامنے آتی ہیں۔ ایک تو مسلمانوں کا پسپا ہوئے دشمن کے لشکر کے تعاقب سے رک
جانا (اور مال غنیمت جمع کرنے میں لگ جانا) اور دوسرے درہ پر متعین دستے کا اپنے
مقام سے ہٹ جانا، فوجی نقطۂ نظر سے ان دونوں کا یکسر غلط ہونا تو اظہر من الشمس ہے ہی
ان کا نتیجہ وہی ہوا جو ان غلطیوں کے سبب ہونا ہی تھا تاہم ان غلطیوں کا قرآنی
آیات کے سیاق میں جائزہ لیا جائے گا تاکہ ان کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کیا جا سکے۔
ذیل میں پہلے ہم مسلمانوں کے دشمن کے تعاقب سے رک جانے اور مال غنیمت جمع
کرنے میں لگ جانے کے معاملہ کو لیتے ہیں۔

اس معاملے کے دو رخ ہیں۔ ایک تو تعاقب و قتال سے رک جانا اور دوسرے
غنیمت جمع کرنے میں لگ جانا۔ ان دونوں کا قرآنی آیات کی روشنی میں الگ الگ جائزہ
لیا جائے گا۔

پہلے تعاقب اور نتیجتاً قتال سے رک جانے کے معاملے کو لیجئے۔ اسلام میں جنگ
ملک گیری اور مال و زر کے لئے نہیں لڑی جاتی بلکہ وہ مذہب جو ایک انسانی جان
ناحق لینے کو پوری انسانیت کے قتل اور ایک انسانی جان کو بچانے کو پوری انسانیت
کو بچانے کے مماثل قرار دیتا ہے (مائدہ : ۳۲) ظاہر ہے وہ مذہب نہایت ہی ناگزیر
حالتوں اور نہایت ہی ارفع و اعلیٰ مقاصد کے لئے قتال (جہاد بالسیف) کی اجازت
دے گا۔ اسلام میں جہاد کا مقصد فتنہ کا استیصال ہے (البقرہ : ۱۹۳) اور اس
سے مراد وہ فتنہ ہے جس کو قرآن نے اشد من القتل (البقرہ: ۱۹۱) کہا ہے
جس کے دفعیہ کی غایت یہ ہو کہ دین اللہ کے لئے خاص ہو جائے۔ کوئی گردن اس
سے باغی ہو کر سرفراز نہ رہنے پائے بلکہ ہر گردن یا تو اس کی بندگی کے قلادہ سے مزین ہو جائے
یا اسلامی ریاست کی محکومی کا طوق اس گردن میں ڈال دیا جائے۔ فتنہ کے
استیصال کا ذریعہ یہ ہے کہ فتنہ پیدا کرنے والوں کے وسائل فتنہ کو مٹا ڈالا جائے

دورانِ جنگ اس کی صورت یہ ہے کہ دشمن کی نفری طاقت کو زیادہ سے زیادہ ختم کر
جائے ۔ عام جنگی اصول کے بھی یہ بات عین مطابق ہے اور اسلامی جنگ کی غا
اور اس کے اصول بھی اس کی حمایت کرتے ہیں ۔ میدان جنگ میں اولین اہمیت قت
کی ہے قیدی بنالینے کی نہیں ۔ چنانچہ سورہ محمد میں جس کا دوسرا نام سورۂ قتال بھی
اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت ان الفاظ میں ملتی ہے :

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۚ ذٰلِكَ ۛؕ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝

پس جب کفار سے مقابلہ ہو جائے تو ان کی گردنیں مارو اور جب ان کو اچھی طرح کچل چکو تب قیدی بناؤ اور مضبوط باندھو اس کے بعد یا تو احسان کرد یا فدیہ کا معاملہ کرلو ۔

(۴۷ : ۴)

سورۂ محمد کی یہ آیت مدنی ہے اور بالاتفاق غزوۂ بدر سے پہلے نازل ہوئی تھی یعنی اس
جبکہ ابھی مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مقاتلہ کی کوئی نوبت ہی نہیں آئی تھی پھر بھ
مسلمانوں کو میدان جنگ میں ان کے طرز عمل کے بارے میں ایک متعین ہدایت دی گئی
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کی دعوت ایک نئے مرحلہ میں داخل ہونے والی تھ
اور اس کا انداز و منہاج بدلنے والا تھا یعنی سلبی مدافعت (Passive resistance)
کا دور ختم ہوا ۔ کفار مکہ جو آپ کی دعوت کے اولین مخاطب تھے ان پر حجت تمام ہو چکی
انھوں نے اسے مسترد کر دیا تھا اور آپ کو اپنے ابتدائی دارالدعوۃ مکہ مکرمہ سے ہجرت

اپنا مرکزِ دعوت مدینہ میں منتقل کرنا پڑا اور چونکہ مشیت الٰہی سے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ مزاحمتوں کے باوجود اس دین کو غالب اور برپا ہونا ہے اس لئے کفر و شرک کو مغلوب کرنے کے لئے بہ شرطِ ضرورت قتال ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس بنا پر حکیم مطلق نے ضروری سمجھا کہ دعوت اسلامی کے اس دوسرے مرحلہ میں داخل ہونے کے آغاز میں ہی مسلمانوں کو ذہنی طور پر قتال کے لئے تیار کر دیا جائے اور چونکہ یہ اللہ کی سنت رہی ہے کہ وہ کسی بھی اہم مرحلہ میں رسولؐ اور اہل ایمان کو ضروری ہدایت کے بغیر نہیں چھوڑتا اس لئے قتال کے تعلق سے یہ ہدایت نازل فرما دی گئی۔

اس آیت میں واضح طور پر یہ ہدایت موجود ہے کہ جب کفار و مشرکین سے میدان کارزار میں مقابلہ کی نوبت آ ہی جائے تو میدان جنگ میں یہ کوشش ہونی چاہئے کہ دشمن کی نفری طاقت کو ممکنہ حد تک ختم کر دیا جائے اور آخر وقت تک قتال جاری رکھا جائے اس لئے کہ یہ استیصال فتنہ کے لئے جو مقصد حیات ہے اولین درجہ میں ضروری ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا یہ ہدایت غزوۂ بدر سے بھی پہلے، جو مسلمانوں اور کفار کے درمیان پہلی جنگ تھی اور جیسا کہ معمول تھا کہ ہر سورۃ یا چند آیتوں کے نزول کے بعد انھیں قرأت قرآنی کے واسطے سے تمام مسلمانوں اور غیر مسلموں کو سنا دیا جاتا تھا اور خود مسلمان ذاتی طور پر بھی اس بات کے مشتاق رہتے تھے کہ جب بھی کوئی نئی سورۃ نازل ہو وہ اس سے واقف ہو جائیں اس لئے سورۂ محمد کی یہ آیتیں بھی تقریباً تمام ہی مسلمانوں کے علم میں تھیں جنھوں نے غزوۂ احد میں حصہ لیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ غزوۂ بدر میں جب مسلمان مجاہدین سے یہ عمل سرزد ہوا کہ جب دشمن پسپا ہونے لگا اور انھوں نے قتال جاری رکھنے کی بجائے دشمن سپاہ کے افراد کو گرفتار کر کے انھیں قیدی بنانا شروع کر دیا تو سورۂ انفال کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں غزوۂ بدر پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں کے اس عمل پر گرفت و سرزنش کرتے ہوئے فرمایا گیا:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

کسی نبی کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ پہلے زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو، حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے اگر اللہ کی طرف سے تقدیر پہلے ہی سے لکھی ہوئی نہ ہوتی تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تمھیں سخت سزا دی جاتی۔ بہرحال اب جو کچھ مال تم نے حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ اللہ نے اسے تمھارے لیے حلال و پاک قرار دے دیا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو کہ بیشک وہ بڑا درگذر کرنے والا اور بڑا رحم کرنے والا ہے۔

(الانفال: ۶۷-۶۹)

یہاں ضمناً یہ بات عرض کر دوں کہ بعض مفسرین کے نزدیک سورۂ انفال کی یہ آیات بدر کے میدان میں قتال سے رک کر قیدی بنا لینے پر بطور سرزنش نازل نہیں ہوئیں بلکہ بدر کے قیدیوں کو جب مدینہ لے آیا گیا اور اس کے بعد ان سے جو معاملہ کیا گیا کہ حضرت عمرؓ کی تجویز کے خلاف ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر عمل کیا گیا کہ ان ۷۰ قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، اس پر یہ آیات بطور تنبیہ نازل ہوئیں لیکن مجھے کسی دعویٰ ہمہ دانی

کے باعث نہیں بلکہ اپنی ہیچمدانی کے عاجزانہ اعتراف کے ساتھ ان مفسرین عظام کی اس رائے سے اختلاف ہے کہ اسیرانِ بدر کے ساتھ مدینہ پہنچنے کے بعد ان سے فدیہ لے کر انھیں رہا کرنے کا جو معاملہ کیا گیا وہ اِن آیات کا محلِ نزول ہے۔ یہ تسلیم کہ یہ آیت اسیران بدر سے فدیہ کا معاملہ کر لینے کے بعد نازل ہوئی لیکن محلِ نزول یہ معاملہ نہیں بلکہ فی نفسہٖ میدان بدر میں قتال روک کر دشمنوں کو قیدی بنا لینے کا عمل ہے۔ اس بارے میں مولانا مودودی مرحوم نے تفہیم القرآن میں اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں حاشیہ نمبر ۴۹ میں یہی رائے ظاہر فرمائی ہے اور سورۂ محمد کی آیت ۴ کی نسبت سے اس کی عمدہ تطبیق کی ہے اور یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ امام جصاص اپنی کتاب احکام القرآن میں "اس تاویل کو کم از کم قابلِ لحاظ ضرور قرار دیتے ہیں"۔ پھر مولانا مرحوم نے سیرت ابن ہشام سے یہ روایت اپنی تاویل کی تائید میں نقل کی ہے کہ غزوۂ بدر میں "جس وقت مجاہدین اسلام مال غنیمت لوٹنے اور کفار کو پکڑ پکڑ کر باندھنے میں لگے ہوئے تھے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت سعد بن معاذ کے چہرہ پر کچھ ناگواری کے آثار ہیں۔ حضورؐ نے ان سے دریافت فرمایا "اے سعد معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی یہ کارروائی تمھیں پسند نہیں آرہی"، انھوں نے عرض کیا "جی ہاں یا رسول اللہ یہ پہلا معرکہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ شرک کو شکست دلوائی ہے۔ اس موقع پر انھیں قیدی بنا کر ان کی جانیں بچا لینے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ ان کو خوب کچل ڈالا جاتا"۔ جلد ۲، صفحہ ۲۸۰-۲۸۱)

سورۂ انفال کی اس آیت کے آخری ٹکڑے: "بہرحال جو کچھ مال تم نے حاصل کیا ہے اسے کھاؤ کہ اللہ نے اسے تمھارے لیے حلال و پاک قرار دے دیا ہے ..." کے بارے میں مولانا مودودی فرماتے ہیں: "اس ارشاد میں جنگی قیدیوں سے فدیہ وصول کرنے کی اجازت تو دی گئی تھی لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگائی گئی تھی کہ پہلے دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل دیا جائے پھر قیدی پکڑنے کی فکر کی جائے اس فرمان کی رو سے مسلمانوں نے بدر میں جو قیدی گرفتار کیے اور اس کے بعد ان سے جو فدیہ وصول کیا وہ تھا تو

اجازت کے مطابق مگر غلطی یہ ہوئی کہ دشمن کی طاقت کو کچل دینے' کی جو شرط مقدم رکھی گئی تھی اسے پورا کرنے میں کوتاہی کی گئی۔ جنگ میں جب قریش کی فوج بھاگ نکلی تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ غنیمت لوٹنے اور کفار کو پکڑ پکڑ باندھنے میں لگ گیا اور بہت کم آدمیوں نے دشمنوں کا کچھ دور تک تعاقب کیا۔ حالانکہ اگر مسلمان پوری طاقت سے ان کا تعاقب کرتے تو قریش کی طاقت کا اسی روز خاتمہ ہو گیا ہوتا۔"

دوسرے یہ کہ یہ بات خود اللہ تعالیٰ کے کریم ہونے کی صفت اور رسول اللہ ؐ کے بہ الفاظِ قرآن رحمۃ اللعالمین ہونے کے منصب کے قطعاً منافی معلوم ہوتی ہے کہ جنگ کے پوری طرح ختم ہو جانے کے بعد جب مسلمان اپنے مسکن کو پہنچ جائیں تو اس وقت ان قیدیوں کو جو کامل بے بسی اور لاچارگی کے عالم میں مسلمانوں کی تحویل میں ہوں ان کی گردن ماردی جائے۔ چنانچہ مختلف غزوات و سرایا میں دشمن کے افراد مسلمانوں کے ہاتھوں قید ہوتے رہے اور خصوصاً غزوۂ حنین اور جنگ اوطاس کے بعد تو ہزاروں قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے تھے لیکن انھیں آپ نے قتل نہیں کیا۔ یہود بنی قینقاع کو آپ نے بعد محاصرہ قابو میں آنے پر قتل نہیں کیا بلکہ صرف مدینہ سے نکال دینے پر اکتفا کیا۔ یہود بنی قریظہ کے مرد بے شک قتل کیے گئے لیکن وہ بھی اپنے جرم کی سنگینی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے کہ انھوں نے اپنا معاملہ رسول اللہ ؐ پر چھوڑ دینے کی بجائے حضرت سعد بن معاذ کے فیصلہ کو قبول کرنا منظور کیا (ان سے ان کے قبول اسلام سے قبل یہودیوں کے بہت اچھے تعلقات تھے اس بنا پر ان سے یہودیوں کی رعایت کی امید تھی) اور حضرت سعد نے ان کے مردوں کے قتل کا فیصلہ دیا۔

یہاں ایک اور بات ضمناً عرض کر دوں کہ سورۂ انفال کی اس آیت میں سرزنش کا خطاب بہ اعتبار الفاظ رسول اللہ ؐ سے ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس عمل کا ذمہ دار آنحضور ؐ کو قرار دے کر فی الواقعی آپ ہی کو سرزنش کی گئی ہے۔ قرآن کا یہ معروف اسلوب ہے کہ لفظاً تو نبی ہی کو مخاطب کیا جاتا ہے لیکن آیت یا آیات کے اصل مخاطب ہم عصر اور تمام

متقدمین مسلمان ہوتے ہیں۔ ویسے یہ کچھ مستبعد بھی نہیں کہ اس آیت کے مخاطب آنحضورؐ ہی ہوں اس لئے کہ جنگ بدر میں سپاہ مسلمین کے کماندار اعلیٰ آپؐ ہی کی ذات اقدس تھی اور آپؐ ہی کے زیر کمان مسلمان جنگ کر رہے تھے۔ یہ عام اصول ہے کہ میدان جنگ میں سپاہیوں کے عمل کی اخلاقی ذمہ داری constructive responsibility بہر حال فوج کے کمانڈر پر ہی عائد ہوتی ہے اور خود قرآن شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضورؐ کے بعض افعال پر گرفت فرمائی ہے اور اس سرزنش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قرآن میں ریکارڈ کر دیا ہے۔ سورۂ تحریم اور سورۂ عبس اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

تو یہ تھی مسلمانوں کی پہلی غلطی کہ احد کی جنگ میں جب لشکر کفار کو ہزیمت ہوئی اور وہ پسپا ہونے لگے تو مسلمانوں نے قتال روک دیا اور مال غنیمت جمع کرنے میں لگ گئے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت ان کو پہنچ چکی تھی کہ جب میدان کارزار گرم ہو تو اولین ترجیح قتال کو جاری رکھنے اور دشمن کی عددی طاقت کو زیادہ سے زیادہ کچل دینے کو حاصل ہوگی۔

مسلمانوں کی دوسری غلطی جو فی الاصل پہلی غلطی کا سبب تھی یہ تھی کہ انھوں نے بھاگتے پسپا ہوتے ہوئے دشمن کے قتال سے اپنے ہاتھ روک لئے اور دشمن کے کیمپوں سے مال جمع کرنے میں مصروف ہوگئے۔ مسلمانوں کے اس عمل کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں اس وقت تک کی مسلمہ جنگی روایت یہ تھی کہ میدان جنگ میں جو اور جتنا مال بھی کسی فوجی کے ہاتھ آجاتا اس پورے مال کا وہ مالک ہو جاتا تھا۔ جس دشمن کو وہ قتل کرتا اس کے اسلحہ اور جسم کے کپڑے بھی قتل کرنے والے کی شخصی ملک ہو جاتے تھے۔ لیکن جنگ بدر کے بعد جب غنیمت کی تقسیم کا سوال اٹھا تو عرب کے اس مروجہ دستور کو منسوخ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۂ انفال کی یہ آیت نازل فرمائی:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ   اور تمھیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تمھیں

فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ......	حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں (کی ضروریات) کے لئے ہے.... (۸: ۴۱)

اس آیت کی رو سے مالِ غنیمت کے تعلق سے قانون یہ وضع ہوا کہ کل مال غنیمت کا $\frac{4}{5}$ حصہ جنگ میں شریک تمام افراد پر خواہ کسی نے عملاً قتال کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ بعض صحابہ آنحضورؐ کے باڈی گارڈ کے طور پر آپ کے قریب کھڑے رہتے تھے اور اس طرح ان کے لیے عملاً قتال کی نوبت ہی نہیں آتی تھی) اور خواہ اس نے اپنے ہاتھوں کوئی مالِ غنیمت جمع کیا ہو یا نہ کیا ہو، افسر اور عام سپاہی کے درمیان کسی فرق کے بغیر سب میں مساوی تقسیم کیا جائے گا اور بقیہ $\frac{1}{5}$ (خمس) پر رسول اللہ اور ان کے بعد جو بھی اسلامی ریاست کے سربراہ ہوں ان کے تصرف میں آئے گا اور وہ اس کو ان مدات میں خرچ کریں گے جن کا ذکر اس آیت میں ہے لیکن اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ مال غنیمت کے خمس کا معاملہ زکوٰۃ کی رقم سے اس بارے میں مختلف ہے کہ زکوٰۃ کی رقم کو تو صرف اُن ہی مدات میں سے ایک یا چند پر صرف کیا جاسکتا ہے جو متعلقہ آیت (سورۂ توبہ آیت ۶۰) میں مذکور ہیں لیکن مال غنیمت کی جو مدات اس آیت میں مذکور ہیں ان کی حیثیت ایک رہنما اصول یا بطور نمونہ چند مدات کے تذکرہ کی ہے اور اسلامی مملکت کے سربراہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ ریاست کے مصالح کے پیش نظر کسی بھی اور مد میں اس رقم میں سے خرچ کرسکتا ہے۔

تو چونکہ غزوۂ احد سے قبل غزوۂ بدر کے بعد مالِ غنیمت کے تعلق سے یہ قانون وضع ہو چکا تھا اور بدر کی غنیمت کو خود رسول اللہؐ نے اسی کے مطابق تقسیم کیا بھی تھا تو پھر مسلمانوں کے لیے اس بات کا کوئی محل تھا ہی نہیں کہ وہ دشمن کے

ب وقتال کو ترک کر کے دشمن کے خیموں میں مالِ غنیمت جمع کرنے میں لگ جاتے،
لیے کہ اگر کوئی شخص ڈھیروں مال بھی لوٹ لیتا تو وہ سب کا سب تو اس کو ملنے والا
تھا بلکہ اس کو ملتا تو کل کے ۱/۵ میں سے بقیہ تمام شرکاء جنگ کے مساوی ہی اس لئے
نوں نے ایک ایسے عمل کو ترک کر کے (تعاقب وقتال) جس کا اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم
تھا ایک ایسے عمل کو اختیار کیا جو ان کے لئے کسی طرح بھی نافع نہیں تھا۔ یہ مالِ غنیمت
یل قتال کے بعد ان کے ہاتھ آنا ہی تھا اور ان کا مقررہ حصہ ان میں سے ہر ایک کو
ہی تھا۔

یہ دو غلطیاں جن میں سے اول الذکر اپنی علین میں درحقیقت حکم خداوندی کی خلاف ورزی
مسلمانوں کی فتح کے متبدل بہ ہزیمت ہو جانے کا باعث ہوئیں۔

اندازوں کے دستہ کا معاملہ

تیر اندازوں کے اس دستہ کا معاملہ جسے رسول اللہؐ نے اپنی فوج کے بائیں رخ پر کوہ احد کے ایک درہ پر مامور کیا تھا کہ اس رُخ سے دشمن کو حملہ آور ہونے نہ دیں۔ بعض پہلوؤں سے علیحدہ
، غور کا متقاضی ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا رسول اللہ نے ایک بیدار مغز
ی جنرل کی طرح اس خطرہ کا ادراک فرمالیا تھا کہ جبل احد کے اس درّہ سے
ن حملہ آور ہو سکتا ہے چنانچہ اس رخ سے امکانی حملہ کے دفاع کے لئے حضرت
بداللہ بن جُبیر کی سرکردگی میں ۵۰ تیر اندازوں کے ایک دستہ کو اس دہلنہ پر متعین
ر دیا تھا جو میدان احد پر کھلتا تھا تاکہ اس کی طرف سے حملہ کی کوشش کی صورت میں
آوروں کو پسپا کیا جا سکے۔ اور انھیں اس جگہ جمے رہنے کی ہدایت ان الفاظ میں
تھی کہ اگر وہ یہ دیکھیں کہ احد کی چیلیں اور گدھ مسلمانوں کی لاشوں کا گوشت
رچ کر کھا رہے ہیں، تو بھی اس دستہ کے سپاہی اس درّہ سے نہ ہٹیں۔ اس
ف سے آنے والے حملہ آور کھلے میدان میں ہوتے اور درہ کے مسلمان محافظ

درہ میں محفوظ ہوتے اور ان سے دشمن دو بدو اور دست بدست جنگ کی نوبت اسی وقت
آ سکتی تھی جب دشمن سپاہی کھلے میدان کے کافی حصے کو عبور کرکے درّہ کے دہانے
تک آجاتے۔ لیکن یہ اس لئے محال تھا کہ جب تک وہ کھلے میدان میں ہوتے مسلمان
تیر اندازوں کی زد میں ہوتے اور کثیر جانی نقصان اٹھائے بغیر درّہ کے دہانہ تک پہنچ
ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ (حضرت) خالد بن ولید نے دو دفعہ اس رخ سے حملہ آور ہونے
کی فی الواقعی کوشش کی بھی لیکن تیر اندازوں کی درّہ کے اندر سے ناوک افگنی کے باعث
دونوں دفعہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔

جنگ مغلوبہ کے آغاز کے کچھ عرصہ بعد درہ پر متعین دستہ کے سپاہیوں نے یہ
دل خوش کن منظر دیکھا کہ دشمن کی عددی کثرت اور بہتر طور پر مسلح ہونے کے باوجود مسلمان
اس پر بھاری پڑ رہے ہیں۔ پھر دشمن قلب، میمنہ اور میسرہ تینوں محاذوں پر پیچھے ہٹنے
لگا اور مسلمانوں نے نصرتِ الٰہی کے اس مظاہرہ سے نیا حوصلہ پا کر دشمن فوج پر دباؤ بڑھایا
تھا تا آنکہ دشمن لشکر پیچھے ہٹتے ہٹتے اپنے پڑاؤ کے خیموں کے قریب پہنچ گیا اور اس
پسپائی کو دیکھ کر خیموں کے مٹھی بھر محافظ اور مکہ سے جو عورتیں لشکر کفار کا دل بڑھانے
کے لئے لشکر کے ساتھ آئی تھیں ان سب کے دل بھی ڈوب گئے اور نہایت افراتفری کے
عالم میں یہ سب بھاگ کھڑے ہوئے جس سے دشمن کے سپاہیوں کے حوصلے مزید پست
ہو گئے اور ان کی صفیں بھی ٹوٹ گئیں اور انھوں نے مقاومت ترک کرکے مکمل پسپائی اختیار
کرلی۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا مسلمانوں نے اس صورت حال سے پورا فائدہ نہیں
اٹھایا اور نہ صرف جنگ کے تقاضوں کو نظر انداز کرکے بلکہ سورۂ محمد اور سورۂ انفال
میں ایسے موقعوں کے لئے اللہ کی دی ہوئی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے
ہوئے تعاقب اور قتال سے ہاتھ روک کر وہ پیچھے لوٹ آئے اور دشمن کے خیموں میں
سے جو محافظوں اور مکینوں سے خالی ہو چکے تھے غنیمت کا مال جمع کرنا شروع کر دیا۔

جب یہ منظر درہ پر متعین دستہ کے سپاہیوں نے دیکھا تو انھوں نے سمجھا کہ جنگ کفار کی شکست اور مسلمانوں کی فتح پر منتج ہو کر ختم ہو گئی اور خود بھی غنیمت کا مال حاصل کرنے کے شوق میں درّہ کو چھوڑ کر دشمن کے خیموں کی طرف جانے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کے سردار حضرت عبداللہ بن جُبیر نے ان کو روکنے کی بہت کوشش کی اور انھیں رسول اللہؐ کی ہدایت کی یاد دلائی لیکن انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہؐ کی ہدایت کا مطلب یہ تھا کہ اگر مسلمانوں پر دشمن کا دباؤ شدید سے شدید بھی ہو جائے تو ہم یہاں سے نہ ہٹیں لیکن اب جبکہ جنگ ہی ختم ہو گئی ہے اس ہدایت کی پابندی کا محل بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اس عذر کے ساتھ ۴۵ افراد اپنے دستہ سے علیحدہ ہو کر دشمن کے کیمپوں کی طرف چلے گئے اور خود بھی دشمن کے خیموں سے مال و متاع جمع کرنے میں لگ گئے اور درّہ پر حضرت عبداللہ بن جُبیر کے ساتھ صرف پانچ اصحاب رہ گئے۔ اس وقت (حضرت) خالد بن ولید جو برابر ایسے موقعہ کی تاک میں تھے درّہ پر حملہ آور ہوئے اور پانچ محافظین کی قلیل تعداد کو شہید کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ درّہ میں سے گزر کر مسلمانوں کے داہنے رخ سے ان پر حملہ آور ہو گئے ادھر پسپا ہوتے ہوئے دشمن نے جب یہ دیکھا کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جا رہا ہے تو ان کے سردار ابوسفیان نے انھیں بھاگنے سے روکا، ان کی دوبارہ صف بندی کی اور منظم ہو کر مسلمانوں پر، جن کی صفیں بکھر چکی تھیں اور جن کی غالب تعداد خیموں سے مال جمع کرنے میں مشغول تھی، ٹوٹ پڑے۔ اس طرح مسلمان منتشر اور غیر منظم حالت میں دو طرف سے صف بستہ دشمن کے منظم حملہ کی زد میں آ گئے۔

تیر اندازوں کے اس عمل کا جہاں تک تعلق ہے کہ انھوں نے بھی درّہ کو چھوڑنے کے بعد پسپا ہوتے ہوئے دشمن کا تعاقب اور قتال نہیں کیا اور مال غنیمت کے جمع کرنے میں لگ گئے تو اس میں اس دستہ کے افراد اور مسلمان لشکر کے دوسرے سپاہی جن سے یہی غلطی سرزد ہوئی دونوں برابر ہیں لیکن اس تیر انداز دستہ سے ایک اور پہلو سے بھی

غلطی ہوئی تھی اور وہ تھی رسول اللہؐ کی واضح اور مستحکم ہدایت کی خلاف ورزی اور ا
سالار دستہ کی حکم عدولی۔ یہ بات بھی اصول جنگ کے خلاف ہے اور فوجی ڈسپلن
منافی۔ وہ تیرانداز اپنے سالار دستہ حضرت عبداللہ بن جبیر کے ماتحت تھے جو اس و
کمانڈر اعلیٰ آنحضور صلعم کی نیابت فرمار ہے تھے۔ میدان جنگ میں ہائی کمان کے اح
کی تعبیر کا حق سپاہیوں کو نہیں ہوتا بلکہ موقع پر موجود فوجی افسر کو ہوتا ہے اور اس
احکام کی بلاچوں وچرا تعمیل سپاہیوں پر واجب ہوتی ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے ا
تیراندازوں سے ایک غلطی تو یہ ہوئی کہ اپنے افسر کے منشار کے علی الرغم انھوں نے ا
طور پر ہائی کمانڈ کی ہدایت کی ایک من پسند تغیر کر ڈالی اور موقع پر موجود اپنے سالار
منع کرنے کے باوجود اپنی تعبیر کے مطابق عمل کر ڈالا۔ یہ ڈسپلن کی سنگین خلاف ورز
تھی۔ مزید برآں مسلمان کی حیثیت میں بھی رسول اللہؐ کی کامل اطاعت ان پر لازم تھ
اس سے بھی انھوں نے انحراف کیا اور خصوصاً اس حالت میں جبکہ ایسی ہی صورت حا
کے بارے میں اس جنگ سے پہلے ان کو واضح ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن ک
ذریعہ سورہ انفال ہی میں ان الفاظ میں دی جاچکی تھی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝	اے ایمان لانے والو، جب کسی (دشمن) گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو، تمھیں کامیابی نصیب ہوگی۔ اور اللہ اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر اختیار

کرو۔ یقیناً اللہ صبر اختیار کرنے
والوں کے ساتھ ہے۔

(۸ : ۴۵-۴۶)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ عالم الغیب اللہ علیم وخبیر نے آئندہ ہونے والے غزوۂ احد میں تیر اندازوں کے دستہ کے تعلق سے پیدا ہونے والی صورت حال کے کامل علم کے ساتھ اس وقت جو طرز عمل انھیں اختیار کرنا چاہیئے اس بارے میں کھلی ہدایت انھیں دے دی تھی اور فوجی ڈسپلن کے قاعدے سے ہٹ کر اس آیت کی رو سے رسول خداؐ کے اُمتی ہونے کے ناطے حکم رسول کی مکمل اطاعت ان پر لازم تھی۔ اس آیت میں "آپس میں جھگڑو نہیں" کے الفاظ کھلے طور پر اس دستہ کے سپاہیوں کا اپنے سالار حضرت عبداللہ بن جبیر سے رسول اللہؐ کی بحیثیت کمانڈر اِن چیف دی ہوئی ہدایت کی تعبیر میں اپنے کمانڈر سے اختلاف کرنے کے بارے میں وارد ہوئے ہیں۔ اور اس بات کو غزوۂ احد پر تبصرہ کرتے ہوئے سورۂ آل عمران میں دہرایا گیا جس کو میں ابھی ایک دوسرے سیاق میں نقل کروں گا۔ پہلے میں یہاں بعض مسلمانوں کے ایک خاص طرز فکر کی طرف اشارہ کر دوں۔ بعض حضرات اس بات کو حُبّ واحترام صحابہ کے منافی اور صحابہ کے مقام ارفع سے فروتر سمجھتے ہیں کہ ان سے طمع مالِ غنیمت کو منسوب کیا جائے اور خصوصاً تیر اندازوں کے دستہ کے افراد کو اس سے مبرّا قرار دیتے ہوئے ان کے عمل کو ہدایت رسول کی نیک نیتی کے ساتھ تعبیری غلطی پر محمول کرتے ہیں[۱]۔ اس بارے میں عرض ہے کہ غزوۂ احد کی جو تفصیلات

۱۔ پاکستان کے معروف عالمِ دین ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دہلی ہی میں اپنی ایک تقریر کے دوران یہ بات بہت زور دے کر اور بڑی تاکید کے ساتھ کہی تھی۔ راقم الحروف خود اس محفل میں موجود تھا۔

تواتر کے ساتھ تمام کتب مغازی میں موجود ہیں۔ ان سب میں مسلمانوں کا یہی عمل بلا اختلاف مذکور ہے۔ اور اس کی سب سے مستحکم شہادت خود قرآن میں بالکل واضح الفاظ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ سورہ آل عمران میں فرماتا ہے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ج حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ط مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ج ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ج وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ط وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید و نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ اس نے تو پورا کر ہی دیا تھا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جوں ہی وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبت تمھارے دلوں میں تھی (مالِ غنیمت) تو تم حکم عدولی کر بیٹھے اس لیے کہ تم میں سے کچھ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت (کی کامیابی) کے خواہشمند تھے۔ تب اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا۔ حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمھیں معاف کر دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ مومنوں پر بڑا فضل فرمانے والے ہیں۔

(۳: ۱۵۲)

اس بات کو اسی سورہ میں کچھ آگے مزید ان الفاظ میں فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى

تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ

الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ

پھر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے تھے پر اللہ نے انھیں معاف کر دیا جو بہت درگذر کرنے والا اور بردبار ہے (۳: ۱۵۵)

پھر اسی بات کو کچھ اور آگے آیت ۱۶۵ میں تکرار کیا گیا کہ "اے نبی اِن سے کہدو کہ یہ مصیبت تمھاری اپنی لائی ہوئی ہے ....."

قرآن کی اس شہادت کے بعد اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ احترامِ صحابہؓ کے عذر سے اس حقیقت سے گریز کیا جائے اور تیر اندازوں کے دستہ کے طرزِ عمل کی قرآن کے علی الرغم صفائی پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ مولانا مودودی مرحوم نے سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۱ (کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے... الخ) کی تفسیر کے ذیل میں حاشیہ ۱۱۴ میں تحریر فرمایا ہے کہ تیر اندازوں کے دستہ نے مالِ غنیمت کی کشش سے اپنا مقامِ تعیناتی ترک کر دیا تو "جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لے آئے تو آپؐ نے ان لوگوں کو بلا کر اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انھوں نے جواب میں کچھ عذر پیش کیے جو نہایت کمزور تھے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا: بل ظننتم انا نغل ولا نقسم لکم (اصل یہ ہے کہ تم کو ہم پر اطمینان نہ تھا، تم نے یہ گمان کیا کہ ہم تمھارے ساتھ خیانت کریں گے اور تم کو حصہ نہیں دیں گے) اس آیت کا اشارہ اسی معاملہ کی طرف ہے..."[۱]

۱۔ مولانا مودودی مرحوم نے اپنے معمول کے خلاف یہاں وہ حوالہ نہیں دیا ہے جہاں سے انھوں نے یہ روایت لی ہے۔ راقم الحروف کو اعتراف ہے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اب رہی یہ بات کہ آخر صحابہ کرامؓ سے، جن کے بارے میں تمام مسلمانوں کا یہ مسلمہ عقیدہ ہے کہ ان کے بعد ان سے زیادہ صاحب ایمان اور افضلیت کا حامل کوئی نہیں ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ آخر یہ کمزوری کیوں ظاہر ہوئی تو اس کی وضاحت کے لئے عرض ہے کہ یہ سمجھنا کہ صحابہؓ میں سے ہر ایک کلمہ پڑھتے ہی راسخ الایمان، راسخ العمل اور اعلیٰ اسلامی کردار کا حامل ہوجاتا تھا محض غلو، خوش عقیدگی ہے۔ ان سابقون الاولون میں جہاں کچھ ایسے تھے جو ایمان لانے سے قبل بھی نیک طینت، شائستہ اطوار اور مضبوط کردار کے مالک تھے تو کچھ ایسے بھی تھے جو عرب کی معروف جاہلیت میں گلے گلے غرق تھے اور خصوصاً جنگوں میں حصہ لینے اور مال غنیمت حاصل کرنے کا شوق تو عربوں کا خاصہ تھا چنانچہ دورِ جاہلیت کے شعری ادب میں عربوں کے اس خاص مزاج کی عکاسی کرنے والے شعر بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ ایک شاعر مال غنیمت کے اپنے شوق کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

فلئن بقیت لا احلن بغزوۃٍ
تحوی الغنائم اویموت کریمۃٍ

(اگر میں زندہ رہا تو ایک ایسی مہم پر جاؤں گا جس میں
غنیمت کا مال خوب ہاتھ آئے یا میں ایک شریف انسان
کی سی موت مرجاؤں۔)

سبعہ معلقہ کا مشہور شاعر عمرو بن کلثوم تو اس بارے میں عرب کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

کہ وہ بھی باوجود کوشش کے اس روایت کے ماٰخذ کو پا نہیں سکا گو اس پر وثوق ہے کہ مولانا مرحوم نے شافی تحقیق کے بغیر یہ روایت نہیں کی ہوگی۔

رتوں تک کے شوق کا تذکرہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

اخذن بعولتھن عھدا | اذا لاقوا کتائب معلمینا
لکے یستلن افراسا و بیضا | و اسری فی الحبال مقرینا

(عورتوں نے اپنے شوہروں سے عہد لیا ہے کہ جب نشان لگائے ہوئے لشکروں سے مقابلہ ہو تو گھوڑے اور صیقل شدہ چمکتی ہوئی تلواریں لے کر واپس ہوں اور رسیوں میں بندھے ہوئے قیدی بھی ساتھ لائیں)

خود سورۂ انفال میں جو غزوۂ بدر کے متصل بعد نازل ہوئی اللہ تعالیٰ نے صحاب رسولؐ کے ایمان کے اس وقت تک پختہ نہ ہونے کا ذکر ان الفاظ میں لیا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ	اے نبی مومنوں کو جنگ پر ابھارو
عَلَى الْقِتَالِ ۚ إِن يَكُن مِّنكُمْ	اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں
عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا	تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر
مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُم	سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں
مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ	سے ہزار کافروں پر بھاری پڑیں گے
كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ	کیونکہ وہ لوگ ایسے ہیں جو فہم سے
الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ	عاری ہیں۔ اچھا اب اللہ نے تمھارا
أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا ۚ فَإِن يَكُن	بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ
مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا	ابھی تم میں کمزوری ہے پس اگر تم
مِائَتَيْنِ ۚ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ	میں سو آدمی صابر ہوں تو دو سو پر
يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ	اور ہزار ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے

وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝	حکم سے غالب آئیں گے۔ اللہ ان کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔

(۸ : ۶۵-۶۶)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جس کمزوری کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کوئی جسمانی کمزوری نہیں بلکہ ایمان اور کردار کی کمزوری مراد ہے اور ایمان و کردار کی یہ کمزوریاں آنحضورؐ کے فیضِ تربیت اور فیضانِ نظر سے رفتہ رفتہ ہی ختم ہوئیں۔ لہٰذا اس بات کو مان لینے سے کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں سے استقامت کی کمی اور ایک مخصوص رخ سے کردار کی کمزوری کا مظاہرہ ہوا اور جس کے باعث سامنے نظر آتی فتح ہزیمت میں تبدیل ہو گئی نہ تو عظمت صحابہ پر حرف اور نہ ہی اس کے اظہار سے اہانتِ صحابہ کا ارتکاب لازم آتا ہے۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کی تربیت کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ اس کمزوری کے مظاہرہ پر مسلمانوں کو ہلکی سی ایک چوٹ لگ جائے تاکہ آئندہ کے لئے انھیں سبق ہو، ورنہ وہ قادر مطلق تو بہر حال اس پر قادر تھا کہ مسلمانوں کے اس غلط عمل کے باوجود مسلمانوں کا نقصان نہ ہونے دیتا اور ان ہی کو فتحیاب کرتا۔ چنانچہ میدانِ جنگ کی عملی تنبیہ کے بعد ان الفاظ میں مسلمانوں کا حوصلہ بڑھایا گیا:

اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُہٗ ط وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ ج وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ	دل شکستہ اور غمگین نہ ہو۔ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت تو تمھیں ضرور چوٹ لگی ہے لیکن اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمھارے فریق مخالف کو بھی لگ چکی ہے[۱]۔ یہ تو زمانے کے

۱۔ جنگ بدر کی طرف اشارہ ہے۔

شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۙ نشیب و فراز ہیں جنھیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں....

(۳ : ۱۳۹ - ۱۴۰)

اور پھر زمانے نے شہادت دے دی کہ غزوۂ احد کے بعد کے دور نبوی میں اور دور نبوی کے بعد بھی ایک عرصہ تک کبھی مسلمانوں کی طرف سے ایسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں ہوا اور انھوں نے ہر ایسے موقعہ پر صبر و استقلال اور دنیوی مال و منال سے بے رغبتی، ڈسپلن کی پابندی اور رفعتِ کردار کا ایسا شاندار مظاہرہ کیا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

••

اعلان

قارئین کے لئے یہ اطلاع ضروری ہے کہ شدید گرانی کی وجہ سے بدل اشتراک میں معمولی سا اضافہ کیا جارہا ہے۔

از راہِ کرم اب نئے سال کا بدل اشتراک ۴۵ روپے ارسال کریں۔

نوازش ہوگی

(ادارہ)

قرآنِ کریم غیروں کی نظر میں

محمد سعید الرحمٰن شمس مدیر النصرۃ الاسلام کشمیر

ہر انسان اپنی مستعار زندگی سے بھرپور فائدہ اٹھائے، خاطر خواہ لطف اند
ہو اور حقیقت میں ایک کامیاب اور پرمسرت زندگی بسر کرے، یقیناً یہ سبھوں کا مشتر
حق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں لازوال خوشیاں اور حقیقی
مسرت وشادمانی کس طرح حاصل کرے۔ جواب یہ ہے کہ جب اسے واقعی زندگ
گذارنے، زندگی کو سنوارنے کا صحیح اور فطری طریقہ معلوم ہو جائے۔ انسانی زندگ
کے حسین، دلکش اور خوبصورت خط وخال جس سے ظاہری و باطنی جمال میں نکھار پید
ہو اور جس کی بدولت آدمی کی زندگی میں ایک غیر معمولی کشش اور جاذبیت پیدا ہو
اس کی پوری تفصیلات اور کامل ہدایات پیغامِ ربانی، صحیفۂ یزدانی، یعنی
"قرآن مجید" میں موجود ہے۔ قرآن کریم منزل من اللہ، کلام اللہ، صحیفہ مقدس
کتاب فطرت اور کتاب حکمت ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ "شفاء للناس" اور
اور "ذکر للعالمین" ہے۔ اس کی حکمت لازوال، اس کا پیغام دائمی، ابدی اور عالمگیر ہے۔
آیئے اس تناظر میں غور فرمایئے۔ ان غیر مسلم اسکالرس (Scallers) مفکرین،
دانشوروں اور علماء کے خیالات، تاثرات اور احساسات جنھوں نے بنظرِ غائر اور

معروضی نقطۂ نظر سے قرآن کریم کا مطالعہ اور study کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ بلاشبہ قرآن کریم آسمانی کتاب اور پیغمبر اسلامؐ کا ایک زندہ جاوید علمی اعجاز ہے جو بہانگِ دہل پوری انسانیت کو دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہے۔

مشہور مورخ و مفکر ایڈورڈ گبن قرآن مجید کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"قرآن مجید کو مسلمانوں کا ایک عام مذہبی، تمدنی، ملکی، تجارتی اور قومی قانون اور دیوانی اور فوجداری وغیرہ کا ضابطہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہر ایک امر پر حاوی ہے۔ مذہبی عبادات سے لے کر رات دن کے کاروبار، روحانی نجات سے لے کر صحت جسمانی، جماعت کے حقوق، حقوق افراد، اخلاق سے جرائم اور دنیوی سزا سے دینی سزا و آخر تک تمام احکام و قوانین قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اسی سبب سے قرآن اور بائبل دو مختلف چیزیں ہیں۔ بائبل میں دینیات کا کوئی قاعدہ اور ضابطہ نہیں ہے بلکہ اس میں قصص میں جن سے عبادات اور پرہیزگاری کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں۔ نہ قرآن اناجیل سے عنقا ہے کہ اس کو ہم صرف مذہبی دالیوں اور افعال کی اصلاح ہی کا معیار قرار دیں، بلکہ بخلاف اس کے قرآن میں سیاسی اصول بھی موجود ہیں۔ انھیں اصول پر حکمت کی بنیاد پڑی۔ انھیں سے ملکی قوانین اخذ کیے جاتے ہیں اور روزمرہ کے جانی و مالی مقدمات کے فیصلے ہوتے رہتے ہیں۔"

جارج سیل کی شہادت:

"قرآن کریم بے شبہ عربی زبان کی بہترین اور مستند ترین کتاب ہے اور جیسا کہ راسخ الاعتقاد مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے اور خود یہ کتاب

انھیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ کسی انسان کا قلم ایسی معجزانہ کتاب نہیں لکھ سکتا۔ یہ ایک مستقل معجزہ ہے جو مُردوں کو زندہ کرنے کے معجزے سے بہت بلند پایہ ہے اور تنہا یہ صحیفہ دنیا کو اپنے آسمانی ہونے کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے آنحضرت صلعم نے عرب کے نہایت فصیح اللسان ادبار کو ڈنکے کی چوٹ چیلنج دیا تھا کہ ان میں سے کوئی شخص ایک آیت ہی ایسی پیش کردے جو قرآن کریم کی آیت سے لگا کھاسکے، اس وقت ملک عرب میں ہزاروں فصحار و بلغار موجود تھے۔ عرب کے سب سے زیادہ فصیح و بلیغ شاعر لبید نے کعبہ پر اپنی نظم لٹکائی تھی جب اس کے پاس ہی قرآن کریم کی دوسری آیت لٹکائی گئی تو خود لبید شاعر (جو بُت پرست تھا) اس آیت کے ابتدائی الفاظ پڑھ کر انگشت بدنداں رہ گیا اور بے ساختہ تعریفی کلمات اس کی زبان سے نکل گئے، لبید فی الفور اس مذہب پر ایمان لایا جس کی تعلیم اس آیت کے الفاظ دہرار ہے تھے۔

قرآن پاک قریش کی زبان میں ہے جو جملہ اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہے۔ انتہادرجہ کی پاکیزہ اور لطیف زبان میں نازل کیا گیا ہے۔ وہ (قرآن شریف) فصیح ترین زبان کا نمونہ ہے بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کوئی انسان اس کی مثال نہیں لاسکتا اور اسی واسطے اس کو ایک لازوال معجزہ قرار دیا ہے جو مردوں کو زندہ کر دینے سے بڑھ کر ہے اور تمام دنیا کو اپنا ربانی الاصل ہونے کا ثبوت دینے کو اکیلا کافی ہے۔ قرآن کا طرز تحریر عموماً خوش آئند اور رواں ہے بالخصوص اس جگہ جہاں پیغمبرانہ اشعار اور توریتی جملوں کو نقل کرتا ہے۔ وہ مختصر اور بعض مقامات پر مبہم ہے اور مشرقی ڈھنگ کے مطابق پُر حیرت صفتوں

سے مرصع اور روشن اور پر معنی جملوں سے مزین ہے لہذا اکثر مقامات میں جہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اوصاف کا بیان آتا ہے نہایت عالی مرتبہ اور رفیع الشان ہے۔"

وسیوڈمونیتسن آف فرانس کی شہادت:

"قرآن شریف کے مضامین سے جو برق کی طرح تڑپا دینے والے ہیں اس کتاب کے حسن کا جلوہ نظر آتا ہے اور مسٹر گوئٹے کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ جس قدر ہم اس کے قریب پہنچتے ہیں تو وہ اور زیادہ ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور بتدریج فریفتہ کر لیتی ہے پھر متعجب کرتی ہے اور آخر کار فرحت آمیز تحیر میں ڈال دیتی ہے اس لئے ہم بے اختیار اس عجیب و غریب کتاب کی ماہیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔"

یان جاک آسو فلاسفر کی شہادت:

"بعض تھوڑی سی عربی سیکھ کر (جیسے ڈاکٹر منکا نا وغیرہ) قرآن شریف کا معاذ اللہ تمسخر اڑاتے ہیں اور اگر اپنی خوش قسمتی سے کبھی ان کو یہ موقعہ حاصل ہوتا کہ آنحضرت صلعم اپنی فصیح زبان اور موثر لہجہ میں قرآن شریف کی کوئی سورۃ پڑھ رہے ہیں جس کا دلوں پر خاص اثر ہوتا ہے اور جب کسی آیت کے متعلق یہ احتمال ہوتا ہے کہ سامعین اس کے حقیقی مفہوم تک رسائی نہیں کر سکیں گے تو اپنی اعجازی قوت بیانیہ سے اس کی توضیح فرما دیتے ہیں تو یقیناً ہر شخص بے ساختہ سجدہ میں گر پڑتا اور سب سے پہلے اس کے منہ سے یہ آواز نکلتی کہ پیارے نبی، پیارے نبی، رسول خدا علیک الصلوٰۃ والسلام میرا ہاتھ پکڑ لیجیے اور مجھے اپنے پیروؤں میں شامل کرنے کی عزت اور افتخار سے مشرف کرنے میں دریغ نہ فرمائیے۔"

جے جے بول:

"تمام اہل علم اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کریم اپنی خوبیوں کے لحاظ سے ایک حیرت انگیز کتاب ہے اور گذشتہ سالوں میں میں نے غور سے جو اس کا مطالعہ کیا ہے تو اس کی بلاغت الفاظ کی شان و شوکت اور روانی سے حیران رہ گیا ہوں۔"

مہاتما گاندھی کی شہادت:

"مجھے قرآن کو الٰہی کتاب تسلیم کرنے میں ذرہ بھر تامل نہیں ہے۔"

پادری ریورانڈ ارمیکوبل کی شہادت:

"میرا ایمان ہے کہ اگر الہام دنیا میں کوئی شی ہے اور الہام کا وجود ممکن ہے تو قرآن شریف ضرور الہامی کتاب ہے۔"

پنڈت جمپوپتی ایم اے کی شہادت:

"ان کے (آنحضرت صلعم) دل کی آواز قرآن کی آیات ہیں۔ حضرت کی اولوالعزمیوں کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے حضرت کی شعلہ بیانیوں سے ان کے زندہ پیغام کو اخذ کرنا ضروری ہے۔"

پرنسپل رام دیو ایم اے کی شہادت:

"قرآن کی بھاشا بہت سُندر ہے اس میں فصاحت و بلاغت بھری ہوئی ہے۔"

مزک مورخ جرمنی کی شہادت:

"قرآن کی عبارت کیسی فصیح و بلیغ اور مضامین کیسے عالی ولطیف

ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک امین ناصح نصیحت کر رہا ہے اور ایک فلسفی حکمتِ الہٰی بیان کر رہا ہے۔"

پروفیسر دوارکا داس کی شہادت :

"قرآن ایسا جامع اور روح افزا پیغام ہے کہ ہندو دھرم اور مسیحیت کی کتابیں اس کے مقابلہ میں بمشکل کوئی کتاب پیش کر سکتی ہیں۔"

سر لیونارڈ کی شہادت :

"اگر کسی کتاب کی عظمت و تقدس کا اندازہ ان نتائج و اثرات سے کیا جائے جو وہ بہترین اور قابل ترین انسانی دماغوں پر نقش کرتی ہے تو یقیناً قرآن کریم کو دنیا کی بہترین و تقدس ترین کتابوں میں بلند و ممتاز جگہ ملے گی۔"

جرمن مشہور علامہ "گوئٹے" کی شہادت :

"جس قدر ہم اس کتاب کے قریب پہونچتے ہیں یعنی اس پر زیادہ غور کرتے ہیں وہ اسی قدر زیادہ دور کھنچی چلی جاتی ہے یعنی زیادہ اعلیٰ معلوم ہوتی ہے وہ بتدریج فریفتہ کرتی ہے پھر متعجب کرتی ہے، فرحت آمیز تحیر میں ڈال دیتی ہے اور آخر کار اپنا احترام کرا کے چھوڑتی ہے اس طرح یہ کتاب نظروں میں زبردست اثر ڈالتی ہے۔"

ڈاکٹر ایڈگر الفنس کی شہادت :

"قرآن شریف اللہ کا کلام ہے، اس کے کلام ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن نے خود دعویٰ کیا ہے کہ مجھ جیسا کلام انسان سے

ممکن نہیں اور واقعی اس وقت سے لے کر آج تک کوئی کلام قرآن جیسا بڑے بڑے شاعروں سے اور فصیح خطیبوں سے نہیں ادا ہو سکا۔ عرب کے بہت سے فصحاء اور نہایت باکمال شعراء قرآن کی اس تحدّی اور چیلنج کو سن کر اس پر ایمان لے آئیں۔ منجملہ شاعر لبید بھی ہے جس کی عمر کا بڑا حصہ جاہلیت میں گذرا اور اسلام میں بھی یہ ان سات شاعروں میں ہے جن کے قصیدے بے بدل مانے گئے اور ان قصیدوں کو کعبہ شریف میں لٹکایا گیا۔ جب عرب کے ایسے ایسے بڑے زبان داں اور شعراء کثیر تعداد میں قرآن کریم کو کلام الٰہی ماننے لگے تو یہ کے بے نظیر کلام الٰہی ہونے کا کافی ثبوت ہے اور جب وہ بے نظیر ثابت ہو گیا اور اتنے زمانہ تک جو ڈیڑھ ہزار سال کے لگ بھگ ہے کوئی اس جیسا کلام نہ لا سکا۔ تو قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ ثابت ہو گیا۔"

مسٹر کامس کارلائل کی شہادت:

"میرے نزدیک قرآن میں سچائی کا جوہر اس کے تمام معنیٰ میں موجود ہے جس کو اس نے وحشی نظر میں بیش بہا کر دیا تھا۔ سب سے آخر یہ کہا جا سکتا ہے یہ کتاب یعنی قرآن سب سے اول اور سب سے آخر جو عمدگیاں ہیں وہ اپنے اندر رکھتا ہے اور ہر قسم کے اوصاف کا بانی ہے بلکہ دراصل ہر قسم کے وصف کی بنا صرف اسی سے ہو سکتی ہے۔"

مسٹر ڈاسٹین کی شہادت:

"پس جب سنا میں نے قرآن کریم رمضان کے مہینے میں تو میں نے دیکھا کہ یہ کتاب فصاحتِ عظیم اور بلاغتِ رفیع اور اعجاز سے مملو اور وہ واقعہ

جو کہ تورات میں دو جزو میں مذکور ہے قرآن کی ایک دو آیتیں اس کو مکمل کر دیتی ہیں اور یہی وہ حد اعجاز ہے کہ جس کے مقابلہ میں طاقت بشری سے یہ بات خارج ہے کہ وہ ایک آیت بھی پیش کر سکے۔ قرآن شریف کی یہی دو آیتیں لے لیجئے "وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ الخ" اسی ہی واقعہ کو جو قرآن کی دو آیتوں میں مذکور ہے تورات کی دو فصلوں میں ذکر کیا گیا ہے۔"

مسٹر جان ڈیون پورٹ کی شہادت:

"منجملہ ان بہت سی اعلیٰ خوبیوں کے جو قرآن کے لئے واجب طور پر باعث فخر و ناز ہو سکتی ہیں۔ دو خوبیاں نہایت بیّن ہیں یعنی اول تو اس کا وہ مؤدبانہ اور ہیبت و رعب سے بھرا طرز بیان جو ہر ایک مقام پر جہاں خدا تعالیٰ کا ذکر یا اس کی ذات کی طرف اشارہ ہے اختیار کیا گیا ہے اور جس میں خداوند عالم کے ان جذبوں اور اخلاقی نقصوں سے منسوب نہیں کیا جو انسان میں پائے جاتے ہیں۔ دوسرے اس کا ان خیالات و الفاظ اور قصوں سے مبرا ہونا جو فحش و خلاف اخلاق اور نامہذب ہوں حالانکہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ یہ عیوب توریت و غیرہ کتب مقدسہ یہود میں، بکثرت پائے جاتے ہیں۔ فی الحقیقت قرآن ان سخت عیوب سے مبرا ہے کہ اس میں خفیف سے خفیف ترمیم کی بھی ضرورت نہیں اور اول سے آخر تک پڑھ جاؤ تو اس میں کوئی بھی ایسا لفظ نہ پاؤ گے جو پڑھنے والے چہرے پر شرم و حیا کے آثار پیدا کرے۔ قرآن میں ذات باری کی تعریف نہایت مشرح اور صاف ہے اور جو مذہب اس نے اپنی ان خوبیوں کے ساتھ قائم کیا ہے، وہ وحدانیت الٰہی کا

نہایت پختہ اور شدید یقین ہے اور بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کو فلسفیانہ طور پر ایسا مسبب الاسباب مان لیا جائے جو اس عالم کو مقررہ قوانین پر چلا کر خود اسی شان وعظمت کے ساتھ الگ ہے کہ اس تک کوئی شئی نہیں پہنچ سکتی۔ قرآن کی رو سے وہ ہر وقت حاضر وناظر اور اس کی قدرت کاملہ ہمیشہ اس عالم میں عامل ومتصرف ہے۔ علاوہ ازیں اسلام ایسا مذہب ہے جس کے اصول میں کوئی امر متنازعہ فیہ نہیں اور چونکہ اس میں ایسا کوئی معمہ نہیں ہے جو سمجھ میں نہ آئے اور نہ زبردستی قبول کرنا پڑے۔ اس لئے وہ لوگوں کے خیالات کو ایک سیدھی سادی اور ایسی پرستش پر قائم رکھتا ہے جو تغیر پذیر نہیں ہے۔"

پاپولر انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:

"قرآن کی زبان بلحاظ لغت عرب نہایت فصیح ہے۔ اس کی انشائی خوبیوں نے اسے اب تک بے مثل و بے نظیر ثابت کیا ہے۔ علاوہ ازیں احکام اس قدر مطابق عقل وحکمت واقع ہوئے ہیں کہ اگر انسان انھیں چشم بصیرت سے دیکھے تو وہ ایک پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے لیے متکفیل ہو سکتے ہیں۔"

اخبار نیر ایسٹ لندن ۱۹۲۲ء کا تبصرہ ہے:

"قرآن ایک محیر العقول اور معجز نما صحیفہ ہے"

جنم ساکھی بھائی بالا ص۱۴۱ پر مرقوم ہے:

توریت و زبور انجیل ترے رَن ڈھٹے وید — رہے قرآن کتاب کل جگ میں پروار

ترجمہ: تورات، زبور اور انجیل کو ہم نے بغور دیکھا اور ویدوں کو بھی۔ مگر دنیا کے لئے جو ہدایت کامل کا موجب بن سکتی ہے وہ قرآن شریف ہے۔

جنم ساکھی کلاں بھائی بالا نوشتہ شری گورو انگد جی صـ۲۲۲ کی عبارت ہے:

"تے حرف قرآن دے تئے سیپارے تیہ — تس وچہ بند نصیحتاں سن سن کر یقین"

ترجمہ: عربی کے حروف تہجی تیس[۳۰] ہیں اور قرآن شریف کے تیس سیپارے ہیں۔ قرآن شریف لاانتہا نصیحتوں کا مجموعہ ہے سنو اور یقین کرو اور ایمان لاؤ۔"

ادی گرنتھ صـ۸۶۳ پر مرقوم ہے:

تپ ذن پوجا ست سنجم جب ڈکا ہے جیو — نادھود ہوتلک چڑھاوے دن سوچ ہنوئی
کل پردان کتیب قرآن ... — پوتھی پنڈت ہے پوران ....

ترجمہ: پوجا پاٹ کام نہیں دے سکتا۔ چھوت چھات بھی بیکار ہے جنیو اشنان، ماتھے پہ تلک لگانا کچھ کام نہ آئے گا۔ اس زمانہ میں اگر کوئی کتاب کام آوے تو وہ قرآن ہے جس کے آگے پوتھی پران کچھ بھی نہیں ہے۔

الفرڈ گیلام (Alfred quillaume) جو لندن یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے، اپنی کتاب "Islam" میں قرآن حکیم پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"The Quran is one of the world's classics which cannot be translated without grave luss It has a rhythem of peculiar beauty and a caderce that charms the ear. Many christian Arass speak of its style with warm admiration and most Arabists

ackrow ledge its excellerice. When it is read aloud or recited. It has almost hyprotic effect."

یعنی قرآن کریم دنیا کے شستہ اور فصیح ترین نسخوں میں سے ہے جس کا ترجمہ صحیح مفہوم اور اسرار و رموز کھوئے بغیر نہیں کیا جاسکتا اس کی روانی میں عجیب اور نادر جمال ہے اس میں وہ لحن اور ترتیل ہے جو کانوں کو مسحور کرتی ہے۔ عرب کے بہت سے عیسائی بھی اس کے اسلوب بیان کی نہایت مدح سرائی کرتے ہیں اور عربی زبان کے بیشتر محقق اس کی فضیلت اور برتری کا اعتراف کرتے ہیں۔ جب قرآن کریم اونچی آواز میں یا ترتیل سے پڑھا جاتا ہے تو اس کا اثر مسحور کرنے والا ہوتا ہے۔

سنٹرل کلچرل اسلامک پریس کی طرف سے جو کتاب شائع کی گئی ہے اور جس کا نام "Introduduction to Islam" ہے۔ اس کے صفحہ ۲۲ پر قرآن کریم کے تعلق سے مرقوم ہے:

"The Quran is addressed to all humanity. Without distinction of race, requin or time, further it seeks to quide men in all walks of like. Spiritual, tern poral, indi-vidual and collective. It curtains directions for the conduct of the head of a state, as well as a simple commoner, of the rich as

well of the poor, for peace as well as for war, for spiritual culture as for commerce and material well being. The Quran seeks primarity to develop the-personality of the indititdual."

یعنی قرآن کریم کا پیغام بلا امتیاز نسل، خط اور زبان ساری انسانیت کے لئے ہے اس کے علاوہ یہ انسان کو زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ رُوحانی دنیوی، انفرادی یا مجموعی ہو، رہنمائی مہیا کرتا ہے۔ قرآن کریم میں سربراہ مملکت اور ایک عام انسان، امیر اور غریب، امن اور جنگ، روحانی، تمدنی، تجارتی اور مادّی فلاح و بہبود کے لئے ارشادات ہیں۔ قرآن مجید بنیادی طور پر فرد کی شخصیت کو اُبھارنے کی کوشش کرتا ہے۔

آگے چل کر اسی صفحہ پر لکھا ہے:

"The Quran speaks of the best rules relating to social life, commerce, marriage inhertance, peral law, international law and so or; But the Quran is not a book in the ordinary sense; it is a collection of the words of god,

revealed, from time to time, during twenty-three years to this messenger sent among human beings."

یعنی، قرآن حکیم سماجی زندگی، تجارت، نکاح، وراثت، تعزیری قانون وغیرہ کے متعلق بہترین قواعد کا ذکر کرتا ہے، لیکن قرآن کریم کسی معمولی کتاب کے مانند نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ان الفاظ مبارک کا مجموعہ ہے جو بنی نوع انسان کی طرف بھیجے گئے۔ اس کے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر تیئیس ۲۳ سال کے دوران نازل فرمائے گئے۔

اسی طرح مشہور اہل قلم اور سائنسداں موریس بوکائے کی تازہ ترین اور مقبول عام تالیف "The Bible The Quran and Scienc" اپنے موضوع پر منفرد کتاب ہے جس میں مصنف نے قرآن کریم کے تعلق سے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب لائق مطالعہ اور قابل استفادہ ہے مصنف تعارف کے ذیل میں لکھتا ہے:

"قرآن وحی کا وہ اظہار ہے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پہونچی جس کو فوراً قلمبند کر لیا گیا اور اہل ایمان نے حفظ کر لیا۔"

ہے قولِ محمدؐ قولِ خدا فرمان نہ بدلا جائے گا
بدلے گا زمانہ لاکھ مگر قرآن نہ بدلا جائے گا

جع وحوالہ جات

۱۔ سیرۃ النبیؐ جلد چہارم — از علامہ سید سلیمان ندویؒ

۲۔ عجائبات القرآن — از حکیم ملک حسن علی مرحوم

۳۔ فلاح دین و دنیا — از مفتی شوکت علی

۴۔ پیغمبر انقلابؐ — از مولانا وحید الدین خاں

۵۔ زندہ نبی کی زندہ تعلیم — از محمد علی صاحب

۶۔ حضرت رحمۃ اللعالمین کا فیض عام — از جناب حبیب اللہ صاحب گانی

۷۔ بائیبل، قرآن اور سائنس — از موریس بوکائے

۸۔ ماہنامہ الرسالہ دہلی — بابت ماہ مارچ ۱۹۸۲ء

۹ ,, نصرۃ الاسلام کشمیر — بابت ماہ نومبر ۱۹۸۴ء

۱۰ ,, ,, ,, — بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء

۱۱۔ روزنامہ علمبردار بنگلور — ۱۳ مئی ۱۹۸۶ء

ابو حیان توحیدی

حیات و خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

(۱)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی ایم، اے شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کسی بھی دور کے شاعر، ادیب یا فن کار کے فن سے بحسن و خوبی واقف ہو
کے لئے ضروری ہے کہ اس دور کی سیاسی، معاشرتی اور سماجی زندگی پر بھی
نظر ڈال لی جائے۔ کوئی بھی فنکار یا ادیب اپنے آپ کو زمانے کے اجتماعی و
رجحانات، تہذیبی و ثقافتی انقلابات، وقت کی سیاسی نزاکتوں اور مروجہ تع
تخریبی قوتوں سے الگ ہو کر اپنی شاہراہ متعین نہیں کر سکتا اور نہ ہی اس کی
زمانے کے اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔ ایک انصاف پسند ناقد اور حقیق
ترجمہ نگار کے لئے ناگزیر ہے کہ کسی بھی فنکار کے فن کو جانچتے وقت اس وقت
سیاسی و اجتماعی حالات کو لازماً سامنے رکھے۔

اگر تاریخ اسلام کا سرسری مطالعہ کیا جائے اور مختلف اسلامی حکومتوں
ہونے والی علمی، سائنسی، سیاسی، فکری، تہذیبی و ثقافتی ترقیوں کا جائزہ
جائے تو عہد عباسی کو دیگر اسلامی حکومتوں کے مقابلہ میں عہد زریں سے مو

سکتا ہے۔ تاریخ اسلام میں پہلی بار مختلف عقلی ونقلی علوم وفنون کی باقاعدہ تدوین و ترتیب اور تصنیف وتالیف کا کام بڑے پیمانہ پر شروع ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی ساری دماغی ترقیاں، علمی وسائنسی کارنامے، ادبی وفنی تخلیقات، تاریخی وفقہی انکشافات اور گرانقدر اور بیش قیمت ذخائر جو آج امت مسلمہ کے لئے باعث فخر وافتخار ہیں عہد عباسی کی یادگار ہیں۔

ابو حیان توحیدی عباسی عہد حکومت کے تیسرے دور کی پیداوار ہے۔ بنو عباس کی حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ پوری مملکت میں امن وامان کی جگہ اضطراب و انتشار اور سکون و اطمینان کی جگہ بد امنی ولاقانونیت نے لے لی تھی۔ ملک کے عرض و طول میں بغاوتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، طرح طرح کے فتنے جنم لے رہے تھے۔ حکام، وزراء، گورنر اور دیگر عہدیداران حکومت لہو ولعب، عیش وتعیش عافیت کوشی و آرام طلبی اور تفریح ودل بستگی کے جملہ انواع واقسام کے رسیا ہو چکے تھے۔ امور سلطنت کی دیکھ بھال اور نظم حکومت کی درستگی کے علاوہ ان کو ہر چیز سے دلچسپی تھی۔ دنیا بھر کی برائیاں جنم لے چکی تھیں۔ گانے بجانے کا رواج اس قدر پروان چڑھا کہ دار الحکومت میں دنیا جہان کی عمدہ گانے والی لونڈیاں اور عورتیں موجود تھیں۔ ملک کی مالیات کا بڑا حصہ اس طرح کی لغویات پر صرف ہونے لگا۔ غریب ومحنت کش عوام دن بدن طرح طرح کے خراج اور ٹیکس کے بوجھ تلے دبتے چلے گئے، جس کے نتیجے میں عوام کے اندر بے اطمینانی اور عدم اعتماد کا رجحان پروان چڑھنے لگا۔

چوتھی صدی ہجری کے نصف میں عباسی حکومت کے حالات اور بھی خراب ہو گئے۔ صوبوں پر مرکز کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی، قوت نافذہ نام کی کوئی چیز باقی نہ رہ گئی، امور حکومت میں عجمیوں کا اثر ورسوخ بڑھتا گیا۔ مختلف خلفاء کے زمانے میں الگ الگ

غیر عرب قوموں کو آگے بڑھایا گیا۔ پھر نوبت یہاں پہنچ گئی کہ صوبوں کے گورنروں
اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ واسط اور بصرہ میں بریدی، یمامہ اور بحرین میں قرامطہ
مصر و شام میں اخشیدی، مغرب و افریقیہ میں فاطمی، خراسان میں سامانی، طبرستان
اور جرجان میں دیلمی، موصل اور دیار بکر و ربیعہ میں حمدانی اور ایران، رسی، اصبہان
طبرستان، جرجان اور جبل کرمان کے بعض علاقوں پر آل بویہی خاندان کی حکومت تھی
عباسی حکمران کے ہاتھ میں بغداد کے سوا اور کوئی علاقہ باقی نہ بچا اور بغداد پر بھی حقیقی
معنوں میں عباسی خلیفہ کی حکومت نہیں تھی بلکہ وہ صرف نام کا خلیفہ تھا۔ حکومت
اصل کرتا دھرتا بویہی خاندان کے افراد ہی تھے۔ وزراء، قضاۃ، گورنر اور فوجی کمانڈر بویہی
خاندان کے افراد ہی ہوا کرتے تھے۔ ۳۶۷ھ میں ان کا اثر و رسوخ اپنی انتہا کو پہنچ
اور خطبہ میں عباسی خلیفہ کے ساتھ بویہی حکمراں کا نام بھی پڑھا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ عباسی
کی حیثیت صرف دینی پیشوا کی رہ گئی اور حکومت پر اغیار کا قبضہ ہو گیا۔ وسیع و عریض عباسی
حکومت مختلف چھوٹے چھوٹے صوبوں اور علاقوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی جس کے سبب ہر علاقے
میں الگ الگ دربار وجود میں آنے لگے اور ہر ایک دربار سے علماء، ادباء اور شعراء کی ایک
جماعت منسلک ہو گئی جن کی تخلیقات و تصنیفات کا زیادہ تر حصہ علاقائی اور مقامی خوبیوں
اظہار و بیان پر مشتمل تھا۔ علاقے و حکومت کے اختلافات کے ساتھ ساتھ مذہب و مسلک
میں اختلاف کی شروعات ہوئی۔ قدریہ، شیعہ، حنابلہ، زردشت، حنفی، شافعی، مالکی
وغیرہ متعدد فرقے وجود میں آ گئے۔ پھر ان فرقوں کے درمیان باہمی مجادلے اور مناظرے
میں شدت آ گئی۔ علم کلام اور فلسفہ کو فروغ ملا۔ امراء و سلاطین نے بھی ان فلسفیانہ
موشگافیوں اور مناظروں میں دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ امراء و سلاطین اپنے حرص
اور نفس کے خلاف کوئی بھی بات برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ لہٰذا حقیقت پسند
اور چند علماء و حکماء کے ایک طبقے نے عوام کے خوف اور امراء کی جہالت کی بدولت

روپوشی اختیار کرلی۔ ارباب حل وعقد اور فلاسفہ کے اسی روپوش طبقے سے ابوحیان کا بھی تعلق تھا۔[۳]

ابوحیان توحیدی

چوتھی صدی ہجری میں دنیائے عربی ادب کے نامور ادبار اور شہرۂ آفاق انشار پردازوں میں ابوحیان کا نام سر فہرست آتا ہے لیکن یہ عربی ادب کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنی وفات کے بعد ایک طویل عرصے تک لوگوں کی عدم توجہی اور ناقدری کی بدولت گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بیشتر گرانقدر علمی وادبی تصنیفات زمانے کی نذر ہوگئیں۔ چنانچہ یاقوت الحموی اس کی متنوع شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:

ترجمہ: "وہ بزم صوفیار کا صدر، طبقۂ ادبار کا سردار، گروہ فلاسفہ کا ادیب، فرقہ معتزلہ کا دانشور، محققین کا سرخیل، فن بلاغت کا امام، سامانیوں کا گل سرسبد، اہل زبان کا پیشوا، ذہانت، ذکاوت، فصاحت، زبان دانی اور نادر الکلامی میں یکتائے روزگار، مختلف علوم وفنون کی درایت وروایت کی رعایت کے ساتھ حصول کا ملکہ حاصل تھا، لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کی زندگی کا دائرہ بہت محدود تھا، وہ زمانے کی ستم ظریفیوں کی شکایت کرتا اور اپنی تصنیفات میں اپنی محرومیوں کا رونا روتا۔"[۴]

نام ونسب

ترجمہ نگاروں کے درمیان آپ کے اصل نام کے سلسلے میں کچھ اختلاف ہے۔ مورخین کی اکثریت کا خیال ہے کہ آپ کا نام "علی بن محمد بن العباس التوحیدی" ہے۔ لیکن ساتویں صدی ہجری کے مورخ "معین الدین ابو القاسم الجنید الشیرازی" اپنی کتاب

"مسند الاسناد عن حفظ الاوتاد" میں آپ کا اصل نام "ابوحیان احمد بن عباس الصوفی التوحیدی" بتاتے ہیں اور موصوف اپنی رائے میں منفرد ہیں۔[5]

ابوحیان کی خودنوشت تحریروں اور کتابوں سے آپ کے اصل نام اور حسب ونسب کا کوئی واضح اشارہ نہیں ملتا۔ بلکہ آپ کی تصنیفات وتخلیقات سے صرف آپ کی کنیت اور لقب کا پتہ چلتا ہے۔ "ابوحیان" آپ کی کنیت اور "توحیدی" لقب تھا۔ اس کی صراحت آپ کی کتاب "البصائر والذخائر" اور "الامتاع والموانسة" میں موجود ہے۔ آپ کی زندگی ہی میں آپ کی کنیت اور لقب آپ کے اصل نام پر غالب آگیا تھا۔

لقب اور کنیت آپ کے لقب کے سلسلے میں دو طرح کے اقوال ملتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کے آباواجداد میں سے کوئی ایسی کھجور بیچا کرتا تھا جسے "التوحید" کہتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کا لقب "التوحیدی" پڑگیا۔[6] ابن حجر العسقلانی کا خیال ہے کہ آپ کی نسبت "التوحید" کی طرف کرنے کا محرک دین اسلام ہے۔ کیونکہ معتزلہ اپنے آپ کو اہل توحید کہا کرتے تھے، جس کی وجہ سے آپ کا لقب "التوحیدی" پڑگیا۔[7] لیکن ان دونوں تاویلات کے پیچھے کوئی ٹھوس اور محکم دلیل نہیں ہے اور نہ ان دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر فضیلت دی جاسکتی ہے۔ اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ آپ کے آباواجداد میں سے کوئی بغداد میں کھجور فروخت کیا کرتا تھا۔ اور دوسری تاویل میں بھی احتمال کی گنجائش ہے۔

اس کی وجہ جو بھی رہی ہو، یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے کہ ابوحیان نے اپنی کتابوں میں بے شمار لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، ہر خاص و عام سے بحث کی ہے، مختلف بادشاہوں، صوفیاء اور حکماء کے حالات پر نہایت تفصیل سے لکھا ہے، لیکن اپنے حسب ونسب، اپنے خاندان اور اپنے آباء واجداد اور قریبی رشتہ داروں کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔

وطن
ابوحیان توحیدی کے وطن کے بارے میں مختلف روایتیں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر ذکی مبارک نے اپنی کتاب میں نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ابوحیان فارسی الاصل تھے۔[8] یاقوت حموی کا خیال ہے کہ وہ شیراز کے رہنے والے تھے۔ لیکن محمد کرد علی کا خیال ہے کہ آپ عربی النسل تھے۔[9] اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ فارسی زبان سے ناواقف تھے۔ اگر آپ ایران میں پیدا ہوتے تو فارسی زبان سے بخوبی واقف ہوتے۔ السندوبی نے المقابسات کے مقدمے میں لکھا ہے "گوکہ مسئلہ اختلافی ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ایرانی النسل تھے"۔ بہرحال مورخین کی اکثریت آپ کے ایرانی الاصل ہونے کے حق میں ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد کرد علی کی رائے بھی اپنی جگہ اس وجہ سے باوزن ہے کہ ایرانی مورخین نے بھی تقریباً آپ کے وطن کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے اور تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ دلیل بھی اپنے ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آپ ایرانی زبان یعنی فارسی سے ناواقف تھے کیونکہ آپ کی تصنیفات و تالیفات کا جو علمی، ادبی اور تحقیقی سرمایہ ہم تک پہنچا ہے وہ سب کا سب عربی زبان میں ہے۔

تاریخ پیدائش
ڈاکٹر ذکی مبارک کا خیال[10] ہے کہ آپ کی تاریخ پیدائش اور مقام ولادت کے سلسلے میں کوئی قطعی تاریخی ثبوت نہیں ملتا بلکہ آپ ایک ایسے گمنام ماحول کے پروردہ دانشور ہیں جس کے اندر شہرت و ناموری اور جاہ و منزلت کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ توحیدی کی تاریخ پیدائش ۳۱۰ھ ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۴۰۰ھ میں ابوحیان نے قاضی ابوسہل محمد کو ایک خط لکھا جس میں اس بات کی صراحت تھی کہ اس کی عمر اب نوے سال کی ہے[11]۔ مورخین کا اندازہ ہے کہ آپ کی تاریخ پیدائش ۳۱۰ھ سے ۳۲۰ھ کے درمیان ہے۔ المقابسات کے مقدمہ میں

بر ہوں کہیں

السندوبی نے اس بات پر زور دیا ہے کہ آپ کی پیدائش ۳۱۲ھ میں ہوئی۔

تاریخ وفات آپ کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی۔ صاحب روضات الجنۃ بیان کرتے ہیں کہ "انھوں نے شیراز کی معتبر تاریخوں میں سے کسی تاریخ میں یہ دیکھا کہ ابوحیان توحیدی کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی ہے[12]۔ احمد بن ابوالخیر زرکوب شیرازی اپنے والد کے واسطے سے بیان کرتے ہیں "ابوحیان کو شیخ کبیر کے سامنے مقام عفیف کی وادیوں میں دفن کیا گیا۔ آپ کی قبر پر ایک تختی آویزاں تھی جس پر "ابوحیان توحیدی بغدادی" کندہ تھا۔ پھر میں نے مزید چھان بین کی تو ایک اور تختی ملی جس پر یہ لکھا ہوا تھا کہ "یہ ابوحیان توحیدی کی قبر ہے جن کی وفات ۳۶۰ھ میں ہوئی۔"

ایک دوسری روایت کے مطابق آپ کی وفات ۳۸۰ھ میں۔ بغیۃ الوعاۃ[13] میں امام سیوطی نے اسی خیال کی تائید کی ہے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ آپ کی وفات ۴۰۰ھ میں ہوئی۔ ساتویں صدی ہجری کے مورخ ابو العباس احمد بن ابی الخیر زرکوب الشیرازی اور معین الدین ابو القاسم الجنید الشیرازی نے بالترتیب اپنی کتابوں شیراز نامہ اور شد الازار عن حط الاوزار میں ابوحیان کی تاریخ وفات ۴۱۴ھ بتائی ہے[14]۔ امام حجر العسقلانی اس کی وفات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "ابوحیان پر جب سکرات کا عالم طاری ہوا تو حاضرین نے ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ اللہ کا ذکر کرو۔ کیونکہ یہ وقت خدا سے ڈرنے کا ہے، یہی وہ گھڑی ہے جس کے لئے انسان تیاری کرتا ہے۔ اور ابوحیان کے سامنے ذکر کرنے لگے اور توحیدی کو بھی خدا کی یاد دلانے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر ابوحیان نے سر اوپر اٹھایا اور کہا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی فوجی افسر یا پولیس والے کے پاس جا رہا ہوں؟ بلکہ میں تو اس رب کے حضور جا رہا ہوں جو عفو و درگذر کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے[15]۔"

زندگی کے ابتدائی حالات

ابوحیان توحیدی عرب دنیا کا ایسا مظلوم لیکن بے مثال دریکتائے روزگار ادیب اور دانشور ہے جس کے ساتھ تاریخ وادب کی کتابوں نے ایک طویل عرصے تک غفلت برتی۔ ابتدائی دور کے مورخین نے اس کے حق میں کچھ زیادہ امانت و دیانت کا ثبوت نہ دیا۔ ان کے وطن، خاندان، تاریخ پیدائش و وفات اور حسب ونسب کے بیان سے اغماض برتا تاکہ آپ کی متنوع شخصیت کے درخشاں پہلو لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ لیکن بعد کے مورخین نے عربی ادب و فلسفہ کے اس درِیتیم کو گمنامی کے کثیف بادلوں میں ہمیشہ کے لیئے روپوش ہونے سے بچالیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی ابتدائی زندگی کے حالات، ایام طفولیت کی تفصیلات اور عہد شباب کی مصروفیات کا کوئی قطعی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ زندگی کے ان مراحل میں آپ کی کیا سرگرمیاں تھیں۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ آپ عہد طفولیت میں دوسرے بچوں سے مختلف تھے، بچپن ہی سے نہایت ذکی الحس تھے، گردوپیش میں رونما ہونے والے حالات وحوادث کا گہرائی اور باریکی سے مطالعہ کرتے، جو کچھ سنتے یا دیکھتے اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ ہر چھوٹی بڑی چیز کا باریک بینی سے جائزہ لیتے۔ آپ دوسرے بچوں کے مقابلے میں نہایت لاغر اور ضعیف تھے لیکن ذکاوت و ذہانت، حکمت و فراست، حلم و بردباری اور عقل و دانش مندی میں ممتاز اور منفرد تھے، علم وادب اور فلسفہ وتصوف سے ابتداہی میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ پھر بھی آپ کی تیس سال سے قبل کے حالات زندگی کے بارے میں تاریخ وادب کی مستند کتابوں سے کچھ زیادہ تفصیلات کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن تیس سال کے بعد سے آپ کے علمی کارناموں اور تحقیقی کاوشوں کے واضح اشارات ملتے ہیں۔ اور یہیں سے ان کے حالات زندگی،

ان کے اساتذہ، ان کی تصنیفات وتالیفات کے قطعی تاریخی ثبوت بھی ملتے ہیں۔

عقیدہ ومذہب ابو حیان توحیدی کے دین ومذہب اور عقیدہ ومسلک کے سلسلے میں مورخین اور ترجمہ نگاروں کے درمیان شدید اختلاف رہا ہے۔ تاریخ میں مختلف روایتیں ملتی ہیں کوئی تو آپ کو زندیق، دہریہ، کذاب، ملحد اور بے دین گردانتا ہے کوئی آپ پر وضع حدیث کا الزام عائد کرتا ہے اور کوئی آپ پر وضع حدیث کا الزام عائد کرتا ہے اور کوئی آپ کو موحد اور صحیح العقیدہ بتاتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف ائمہ نے الگ الگ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

پہلا قول "ابوالحسین احمد بن زکریا بن فارس" کا ہے جو ابن فارس کے نام سے مشہور ہیں۔ جن کی وفات مورخین کے مختلف اقوال کے مطابق ۳۷۰، ۳۹۱ یا ۳۵۵ھ میں ہوئی۔ آپ ابوحیان کے معاصر تھے۔ ان کا ابوحیان سے مشاہدہ اور سماع ثابت ہے۔ طبقات الشافعیہ میں ــــ ابوحیان کے سوانح کے تحت ــــ ذہبی نے ابن جوزی کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ ابن فارس نے کتاب الفریدہ والخریدہ میں لکھا ہے:

"ابوحیان ایک جھوٹا، بے دین، حد قذف سے بھاگا ہوا اور علانیہ بہتان کا مرتکب شخص تھا۔ اس نے شریعت کے نہایت اہم اور بنیادی مسائل پر اعتراضات کئے اور ان کی صحت وثقاہت پر شک وشبہ کا اظہار کیا۔ وزیر صاحب بن عباد کو اس کے گمراہ کن عقیدے اور غیر دینی افکار ونظریات نیز غیر اسلامی سرگرمیوں اور کاروائیوں کی خبر ہوگئی۔ اس نے اس کو قتل کرنے کے ارادے سے دربار میں حاضر کرنے کا حکم صادر کیا۔ ابوحیان کو اس کی بھنک مل گئی وہ جان بچا کر

عباد کے دشمنوں سے جاملا، اس نے اپنی اختراپردازیوں سے ان کو بھی گمراہ کرنا شروع کردیا، ان کے عقیدے میں خرابی پیدا کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ لوگوں کو اس کی باطنی خرابیوں، لادینی نظریات، الحادی افکار اور ناقص عقیدے کا علم ہوگیا۔ چنانچہ انھوں نے اس کے گمراہ کن عقائد کی خبر وزیر تک پہنچادی۔ وزیر نے اسے دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا تو وہ روپوش ہوگیا اور اسی روپوشی کے عالم میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے کیونکہ اس نے اس دنیا میں ذلت و رسوائی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کیا۔"[16]

دوسرا قول ابوالفرج ابن جوزی کا ہے۔ جس کی تاریخ پیدائش ۵۱۰ھ اور تاریخ وفات ۵۹۷ھ ہے۔ ابوحیان کے ترجمہ کے تحت طبقات الشافعیہ للسبکی میں ابوالفرج بن الجوزی کا یہ قول موجود ہے "زنادق اسلام تین ہیں: ابن الراوندی، ابوحیان التوحیدی اور ابوالعلا المعری" اور ان میں اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابوحیان توحیدی تھا لیکن اس کی اسلام دشمنی کھلی ہوئی نہیں تھی۔[17]

"ذہبی" شمس الدین بن محمد بن احمد بن عثمان بن قائماز (۶۷۳ــــ۷۴۸ھ) کا کہنا ہے کہ ابوحیان اللہ تعالیٰ کا دشمن، خبیث اور سی العقیدہ شخص تھا۔[18]

احمد بن علی ابن حجر العسقلانی (المتوفی ۸۵۲ھ) نے ابن فارس، ابن جوزی اور ذہبی کے خیالات کی تائید کرتے ہوئے اس پر مزید وضع حدیث کی تہمت بھی لگائی ہے۔

عبدالرزاق محی الدین نے ان تمام روایات کی اسناد، عبارتوں اور زمانے کے تاریخی حقائق کے آئینے میں تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ابوحیان

پر الحاد ولادینیت، زندیقیت، کذب گوئی اور اسلام دشمنی کے جو الزامات عائد کئے گئے ہیں وہ سب کے سب محل نظر ہیں۔ ان الزامات کے پس پشت ابوحیان کی ذات سے دشمنی اور عداوت کا جذبہ کارفرما ہے یا پھر ان علمار کا اس کے فلسفیانہ نظریات اور متصوفانہ خیالات سے اختلاف کا عامل ہے۔ پھر دوسری بات یہ کہ ان نصوص اور عبارتوں کے مقابلے میں کچھ ایسی قدیم مستند روایتیں بھی ملتی ہیں جن سے ابوحیان توحیدی کے صحیح العقیدہ ہونے اور دین اسلام سے اس کے گہرے تعلق کے قطعی تاریخی ثبوت فراہم ہوتے ہیں۔

ابن النجار الحافظ البغدادی کا قول ہے کہ "ابوحیان بہت ساری اچھی کتابوں کا مصنف تھا جیسے البصائر و الذخائر وغیرہ۔ وہ ایک فقیر، صابر، مذہبی اور صحیح العقیدہ شخص تھا۔"[۲۰]

یاقوت الحموی نے لکھا ہے کہ ابوحیان توحیدی ایک خاموش طبع صوفی تھا، دین و مذہب کے معاملے میں وہ لوگوں کے درمیان ثقہ سمجھا جاتا تھا۔"[۲۱]

زرکوب شیرازی نے "شیراز نامہ" میں ابوحیان کے سوانح کے تحت لکھا ہے کہ وہ توحید پرست امام، یکتائے روزگار عالم، مختلف علوم و فنون کا بحر ذخار، الٰہی انکشافات و خدائی الہامات کے سلسلے میں بے نظیر اور توحید و عقائد سے متعلق مسائل کے بحث و مناظرے میں منفرد تھا۔"[۲۲]

امام ابن حجر العسقلانی ابویعلیٰ کے واسطے سے ذکر کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کتاب ملک المعانی میں ابوحیان کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ صوفیوں کا سردار، ادبار کا استاد، فلسفیوں کا امام اور عوام کے درمیان سب سے زیادہ زاہد، عبادت گذار اور محسن الاسلام شخص تھا۔"[۲۳]

وحید پرست

اس طرح ہم ان مختلف اقوال کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ابوحیان
توحیدی ایک ماہر فلسفی، آزاد مفکر، شب زندہ دار صوفی، عجیب و غریب عادات و اطوار کا
مالک اور مختلف صفات و خوبیوں کا حامل شخص تھا۔ اسے بہت سارے اوراد و وظائف
یاد تھے جن کے ذکر و ورد میں وہ مشغول رہتا۔ وہ ایک مستند راوی تھا جس کی روایت و
ترتیب کے اندر کسی غرابت یا نقص کا شبہ نہیں ہے۔ مختلف میدانوں میں اس کی اس قدر
شہرت و مقبولیت کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ فلسفہ و تصوف اور اس ضمن میں ہونے
والی تحقیقات و ایجادات سے اختلاف رکھنے والے لوگ اس کے مخالف ہو گئے
اور اس کے سب سے زیادہ سخت مخالف حنابلہ تھے جنھوں نے جذبۂ انتقام میں آکر
اس کے اوپر کفر، زندیقیت، الحاد و لادینیت تک کے الزامات عائد کر دئے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ابوحیان سچا موحد، مخلص مسلمان اور دین اسلام کا
بے باک ترجمان اور جانباز سپاہی تھا۔ اس نے اسلام کے عام بنیادی اصولوں کی
کبھی مخالفت نہیں کی۔ اس کے اندر خدمت اسلام کا شدید جذبہ تھا۔ جیسا کہ
اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے دین اسلام کے بنیادی اصولوں کی خلاف
ورزی کی، صحابہ اور سلف صالحین پر تنقیدیں کیں، عوام الناس کو ضلالت و گمراہی
کے رستے پر ڈال دیا اور اسلام دشمن سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تو اس
کی زندگی کے حالات اور تاریخی ان اعتراضات کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں۔

(باقی آئندہ)

تبصرہ

رسالہ برہان کا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر

از ڈاکٹر ماجد علی خاں ، جامعہ ملیہ اسلامیہ ، نئی دہلی ۲۵

تقریباً نصف صدی قبل رسالہ "برہان" ندوۃ المصنفین کے ترجمان کی حیثیت سے حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مرحوم کی زیر نگرانی اور اپنے دور کے معروف و جید عالم دین استاذی حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب مرحوم کے زیر ادارت وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کرنے کے ارادے سے نکلنا شروع ہوا تھا اور وہ تقاضہ یہ تھا کہ جدید دور میں جدید اسلوب کے ساتھ جدید دلائل و براہین قاطع کے ہتھیاروں سے اسلام پر ہونے والے حملوں کا جواب دیا جائے نیز مسلمانوں کے دینی و علمی سرمایہ کو محفوظ کیا جائے۔ چنانچہ اپنی پوری تاریخ میں "برہان" نے اپنے اس مشن کو پوری طرح نبھایا اور کامیابی کے ساتھ اپنے مقاصد کو حاصل کیا۔ افسوس ہے کہ آج نہ تو مفتی صاحب ہی رہے اور نہ ہی اکبر آبادی صاحب۔ "برہان" پھر بھی نکل رہا ہے جاری اور ساری ہے اور اپنے مقاصد کی تحصیل میں سرگرداں ہے۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے جناب عمید الرحمٰن صاحب عثمانی اب اس کے روح رواں ہیں۔

اُمید ہے کہ یہ رسالہ اسی شان سے نکلتا رہے گا جس شان سے اس کو مفتی صاحب مرحوم اور مولانا اکبر آبادی صاحب مرحوم چھوڑ گئے تھے۔

"برہان" کی تاریخ میں شاید پہلی بار اس کی خصوصی اشاعت ہوئی ہے اور وہ بھی اس شخصیت کی یاد میں جس نے نہ صرف اس رسالہ کی بلکہ اس ادارہ کی بھی، میری مراد ندوۃ المصنفین سے ہے، بنیاد ڈالی، جس سے ہزاروں سے تجاوز کر کے لاکھوں مسلمانوں کی دینی و علمی پیاس بجھی، "برہان" کا یہ خصوصی نمبر، یعنی مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نمبر، ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے جس میں مشاہیر اہلِ قلم نے حضرت مفتی صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ کتابت اور گیٹ اپ بھی بہت خوشنما ہے۔ مجھے امید ہے کہ قارئین اس سے خصوصی استفادہ کریں گے۔

(ماجد علی خاں)

بیان ملکیت و تفصیلات متعلقہ برہان دہلی

فارم چہارم ، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقام اشاعت	اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶
۲۔ وقفہ اشاعت	ماہانہ
۳۔ طابع کا نام	عمیدالرحمن عثمانی
قومیت	ہندوستانی
۴۔ ناشر کا نام	عمیدالرحمن عثمانی
سکونت	۱۴۳۶، اردو بازار، دہلی ۶
۵۔ ایڈیٹر کا نام	عمیدالرحمن عثمانی
قومیت	ہندوستانی
سکونت	۱۴۳۶، اردو بازار، دہلی ۶
۶۔ ملکیت	ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی ۶

میں عمیدالرحمن عثمانی ذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم ویقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) طابع و ناشر

سنہ ۱۹۵۴ء حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

سنہ ۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند اول
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

سنہ ۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت طبع جدید دلپذیر ترتیب، جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

سنہ ۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم صدیق اکبرؓ تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم۔ انقلاب روس اور روس انقلاب کے بعد

سنہ ۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

سنہ ۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب و رکوع

سنہ ۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ - ۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

سنہ ۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط۔ اسلامی کتب خانے، برصغیر
تاریخ ہند پر نئی روشنی

سنہ ۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں۔ معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک۔

سنہ ۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم۔ تاریخ ردہ، سرکشی ضلع بجنور۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

سنہ ۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

سنہ ۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

سنہ ۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم۔ رموز عشق۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

سنہ ۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعود اور ان کی فقہ

سنہ ۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

سنہ ۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

سنہ ۱۹۷۰ء حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

سنہ ۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

سنہ ۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر۔ انتخاب الترغیب والترہیب۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ -
تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخِ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراطِ مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات)
مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخِ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول - اسلام کا نظامِ حکومت - سرایہ - تاریخِ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے
اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخِ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" - تاریخِ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل)
تاریخِ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخِ ملت حصہ ہفتم "تاریخِ مصر و مغربِ اقصیٰ" تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد -
اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخِ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخِ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو
ازسرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخِ مشائخ چشت - قرآن اور تعمیرِ سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

جلد ۱۰۱ | شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ مطابق اپریل ۱۹۸۸ء | شمارہ ۴

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس چھتہ شیخ منگلو میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا۔

نظرات

فلسطینی عربوں پر وحشیانہ مظالم

ذرّہ ذرّہ ہے دہکتے ہوئے لاوے کا نقیب
شعلہ زن فتنۂ محشر ہے خدا خیر کرے

جیسا کہ آپ کو اخبارات و ریڈیو وغیرہ سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ برسہا برس سے اسرائیلی ظالم سرکار فلسطینی عربوں پر ظلم و ستم اور جبر و قہر کے پہاڑ توڑ رہی ہے معصوم بچوں، عورتوں، نوجوان مردوں اور بوڑھے اور ضعیف لوگوں کو گولیوں، خنجروں، لاٹھیوں اور سنگینوں سے زخمی اور ہلاک کیا جا رہا ہے، ان کو بلاوجہ جیلوں میں ٹھونسا جاتا ہے جہاں ان پر انتہائی غیر انسانی مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور ان کے ہاتھ پیر توڑے جا رہے ہیں، ان مظالم کی رپورٹیں امریکہ، برطانیہ اور خود اسرائیلی اخبارات میں بھی شائع ہو رہی ہیں۔ ہندوستان اور دوسرے بہت سے ملکوں کے ریڈیو اور ٹیلی ویژن ان دردناک مظالم کو نشر کر رہے ہیں۔ جن کو سن کر اور ٹی وی پر دیکھ کر کروڑوں انسانوں کے دلوں میں درد اور کسک پیدا ہو رہی ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر دنیا کے اخبارات، سیاسی رہنما اور مفکرین مجبور ہیں۔ کہ بے پناہ مظالم کے مقابلہ پر فلسطین میں رہنے والا ہر عرب مرد، ہر عورت، ہر بچّہ اور بوڑھا عزم و استقلال، پامردی اور جوش و جذبہ کا ایک کوہ گراں بن گیا ہے۔ اور ان مظالم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں ہے۔

تاریخ ان جیالے بہادر نڈر اور سرفروش لوگوں کو خراج عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہے قوموں کے عروج و زوال کے الٰہی فلسفہ اور خدائی قانونِ عدل

وانصاف کی روشنی میں یہ امید کی جا سکتی ہے کہ بے گناہ انسانوں پر ڈھائے جانے والے یہ خطرناک مظالم بہت جلد ایک ایسے انقلاب کو جنم دینے کا ذریعہ بنیں گے جو خوفناک آگ کی شکل میں نمودار ہوگا کہ اس کے شعلوں کی لپٹ سے ہر ظالم و جابر یہودی اور اس کے بے رحم حمایتی کسی صورت محفوظ نہ رہ سکیں گے ہاں ۔ ؟ اک ایسا انقلاب جو خاک دخوں میں ملا دے ستم کی تعمیریں" ۔

ہمیں اس پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیئے کہ ان غیر انسانی مظالم پر امن عالم کے ٹھیکیدار چپ ہیں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ جمہوریت کے دعویداروں کو سانپ سونگھ گیا ہے ۔ انسانی حقوق کے پاسبان خاموش ہیں، تہذیب و شرافت انگشت بدنداں اور عدل و انصاف سر بگریباں ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے اس نام نہاد دور ترقی اور عہد عروج و ارتقاء میں وحشت و بربریت کا یہ ننگا ناچ کیوں ناچا جا رہا ہے اور وہ بڑی طاقتیں جو دنیا کے سیاہ و سفید کی مالک بنی ہوئی ہیں اسرائیل سے کیوں نہیں پوچھتیں کہ وہ کیا کر رہا ہے ۔ ہٹلر اور نازیوں کے مظالم کا انتقام بے قصور عربوں سے کیوں لے رہا ہے ۔ ؟ کون ہے جو آتش و آہن کے اس سلسلہ کو بند کرا سکے ۔ ؟ کہاں ہے اقوام متحدہ، کہاں گیا اس کا حقوق انسانی کا منشور ؟ فلسطینی معصوم بچوں کی تڑپتی لاشیں، عورتوں کی دل ہلا دینے والی چیخیں اور نوجوانوں اور بوڑھوں کی وہ مظلوم آنکھیں جو بڑی حیرت سے ساری دنیا کی طرف، سارے انصاف پسند انسانیت دوست لوگوں کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھ رہی ہیں اور ان کی نمناک آنکھیں ان کے درد سے لبریز دل ان کے زخمی احساسات سوال کرتے ہیں ۔ آخر ان کو ایک با عزت شہری کی حیثیت سے زندہ رہنے کا حق خدا کی اس زمین پر کیوں نہیں ہے جہاں اُن کے آباء و اجداد پیدا ہوئے جہاں اُن کے گھر، ان کے کھیت اور ان کے کھلیان اور ان کے ایمان و یقین کے مرکز موجود ہیں ۔ آخر ان کو آزادی اور حق

خود اختیاری سے کیوں محروم رکھا جارہا ہے اور اس حق کے طلب کرنے پر ان کو گولیوں سے کیوں بھونا جارہا ہے۔ ؟؟؟

اسرائیل اور امریکہ کے دو معروف اخبارات ــــ یروشلم پوسٹ اور واشنگٹن پوسٹ" ــــ کے نمائندوں نے جو رپورٹیں اپنے اخباروں میں بھیجی ہیں ان میں گذشتہ مہینوں کے دوران پیش آنے والے واقعات کی جو تفصیلات شائع ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف عربوں پر انسانیت سوز اسرائیلی مظالم کا دردناک سلسلہ ہے اور دوسری طرف ان وحشیانہ مظالم نے یہودیوں کے ایک طبقہ کے "پتھریلے دلوں" میں درد کا تھوڑا بہت احساس پیدا کردیا ہے، چنانچہ مشہور یہودی تنظیم ــــ Peace now ــــ کی عملی سرگرمیاں بھی منظر عام پر آئی ہیں۔ یروشلم پوسٹ اور بعض مغربی اخبارات اور نیوز ایجنسیوں کی خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا تنظیم کی طرف سے گذشتہ ماہ ایک بہت بڑا جلسۂ عام کیا گیا جس میں پچاس ہزار لوگ شریک ہوئے، یروشلم پوسٹ کے نمائندہ کی رپورٹ کے مطابق مقررین کے پرجوش لہجے اور حاضرین کی گہری دلچسپی کو دیکھ کر صاف پتہ چل رہا تھا کہ عربوں کے جگر چھلنی کرنے والی ظالم اسرائیلی حکومت کی ناک کے نیچے اس کے سیاہ کارناموں پر نفرت اور ناراضگی غصے اور ملامت کا اظہار کرنے کے لیے ایک قابل ذکر گروہ پیدا ہوگیا ہے اس جلسہ کی یہ خصوصیت بھی اہم اور قابل ذکر ہے کہ فلسطینی عرب باشندے بڑی تعداد میں پی ایل او کے جھنڈے اٹھائے ہوئے اس میں شریک تھے۔

جلسہ کے مقررین نے فلسطینی عربوں پر کیے جانے والے مظالم کے خلاف پرزور احتجاج کیا اور حکومت اسرائیل کی ظالمانہ پالیسیوں کو خود یہودیوں کے لیے تباہ کن قرار دیا۔ ایک مقرر نے نہایت پرجوش لہجہ اور پرزور الفاظ میں کہا کہ

"ہم یہاں یہ سوال کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں کہ ہم نے ۱۹۸۲ء میں لبنان پر حملہ کیا تو اس سے ہمیں کیا ملا اور اب جو فلسطینیوں کے ہاتھ پیر توڑے جا رہے ہیں تو اس سے ہمیں کیا ملے گا۔"

اس جلسہ میں ایک فوجی جوان بڑے پرجوش انداز میں مائک پر آیا اور پرزور طریقہ پر بولتے ہوئے جب اس نے یہ الفاظ کہے۔ تو لوگ سناٹے میں آگئے کہ۔

"ہم لبنان میں گئے تو ہمیں وہاں گولیوں سے اپنے جسموں کے چھلنی ہونے کا خطرہ تھا لیکن غزہ کی پٹی اور مغربی اردن میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اس سے ہماری روحوں کے جھلس جانے کا اندیشہ ہے۔"

اسرائیلی پارلیمنٹ کے بعض ممبران نے بھی ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ یہودیوں میں دانشوروں کا ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو چکا ہے جو ان مظالم کے خلاف ہے اور ان کو ناپسند کرتا ہے۔ مگر اسرائیلی حکومت اور اس کے بدبخت وزیر اپنی روایتی سیاہ قلبی تاریک ضمیری اور تنگ ذہنی کی وجہ سے ہواؤں کے اس رخ کو پہچانتے اور حالات کے ان تیوروں، وقت کے تقاضوں اور لیل ونہار کی ان گردشوں کے ہجوم سے ابھرتی ہوئی لکیروں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کر پا رہے ہیں۔

خدا کرے کہ حالات کے کڑوے کسیلے گھونٹ ہمارے عرب بھائیوں اور تمام اسلامی حکومتوں کے سربراہوں کو اپنے اختلافات کی بساط سمیٹ لینے اور متحد ہو کر عملی اقدامات کرنے پر تیار و آمادہ کر سکیں اگرچہ کہ ان کی موجودہ حالت، بے حسی اور آپسی رسہ کشی اور غفلت و مدہوشی سے تو یہ المناک و تاسف انگیز احساس ہوتا ہے کہ ؎

یہ نشہ وہ نہیں جسے ترشی اتار دے

گجرات کے تین تعلیمی و تربیتی مراکز میں حاضری

جن کی بنیاد حضرت مفکر ملت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی نے رکھی تھی

(از عمید الرحمٰن عثمانی)

مفکر ملت حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے قیام جا
اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت (گجرات) کے زمانہ میں ان سے بہت سے علماء نے کسب فیض
جن سے تعلقات نہایت خوشگوار رہے، ان میں سر فہرست حضرت مولانا غلام محمد نو
صاحب کا اسم گرامی ہے، حضرت مفتی صاحب کے گجرات کے تلامذہ و متوسلین میں ان
نہایت گہرے عزیزانہ تعلقات آخری دم تک قائم رہے۔

وفات سے چند سال پہلے حضرت مولانا غلام محمد نور گت صاحب کی دعوت پر حض
مفتی صاحب نے گجرات کا دینی و علمی سفر فرمایا اور تین دینی و تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھ

(۱) بچوں کا گھر حمایت نگر، زرنہ ضلع سورت

(۲) بچوں کا گھر مدرسہ تجوید القرآن، گدود، ضلع سورت

(۳) بچوں کا گھر مدرسہ نور اسلام، نور نگر کیم ضلع سورت

مسلمان بچوں کی تعلیم و تربیت کے یہ تینوں مراکز چند سال گذرتے گذرتے عظیم
دینی ادارے بن گئے اور مولانا غلام محمد نور گت صاحب اور گجرات کے مخیّر و باحوصلہ اصحا
کی جدوجہد سے ان میں بڑی رونق پیدا ہو گئی، اور علم دین کے جو پودے حضرت مفتی صا

گائے تھے، تناور درخت بن کر پھل دینے لگے۔

الحمد ہی بچوں کے گھروں اور تعلیمی و تربیتی مرکزوں کے سلسلے میں علمی و دینی تقریبات ہوئیں جن میں بندہ بھی حضرت مولانا غلام محمد صاحب کی خصوصی دعوت پر شریک ہوا، اور میرے رفیق کار جناب فخر الدین کی معیت میں ہوا، چنانچہ مورخہ ۷ / مارچ ۱۹۸۸ء کو بمبئی سے سورت کے لئے روانگی ہوئی اور سب سے پہلے مدرسہ تجوید القرآن کدود میں حاضری ہوئی، سورت اسٹیشن سے بذریعہ کار کدود آئے، رات کو مدرسہ کا جلسہ ہوا جس میں اطراف و جوانب کے بہت سے مسلمان شریک تھے، اس جلسہ میں خاص طور سے مولانا سلمان ندوی صاحب کا بیان بہت پُر مغز اور بڑا اثر رہا۔

دوسرے دن صبح کو بچوں کا گھر مدرسہ تجوید القرآن میں جلسہ ہوا جس میں مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی اور مولانا سلمان صاحب ندوی کے بیانات ہوئے، دوپہر کا کھانا مولانا محمد خلیل صاحب کے دولت کدہ پر تھا، مولانا موصوف نے تواضع و خاطر داری کا پورا حق ادا کیا اور شام کو مولانا غلام محمد نور گت صاحب کے دولت کدے پر حاضری ہوئی، مغرب کی نماز جامعہ فلاح دارین ترکیسر میں ادا کی گئی، جہاں مولانا سلمان صاحب ندوی کا بیان ہوا۔

صبح کو بچوں کا گھر مدرسہ نور اسلام کیم میں مولانا احمد رضا بجنوری صاحب، مولانا سلمان ندوی صاحب اور مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب کے بیانات ہوئے۔ حضرت مولانا احمد رضا بجنوری صاحب کی صدارت میں یہ تمام پروگرام منعقد ہوئے۔

مولانا محمد سورتی صاحب نے ان تمام پروگراموں میں دلچسپی اور حصہ لیا اور ہماری رہنمائی کی۔

ان تعلیمی و تربیتی اداروں اور ان کے جلسوں میں عجیب کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روح ہر جگہ موجود تھی اور اپنے لگائے ہوئے

ان علمی و دینی پودوں کی سرسبزی و شادابی اور بار آوری پر بیحد مسرور تھی۔

ہم مولانا غلام محمد نور گت صاحب اور ان کے رفقا کے بیحد شکر گذار ہیں کہ انھوں نے ان جلسوں میں ہمیں دعوت دے کر نہ صرف عزت بخشی بلکہ اپنے اسلاف کی خدمات کے دیکھنے اور ان سے عبرت لینے کا موقع دیا۔

اللہ تعالیٰ ان اداروں کو تا دیر قائم رکھے اور ان کے مخلص خادموں کے ذریعہ دینی تعلیم و تربیت سے مسلمانوں کے بچوں کو فیضیاب کرے، آمین۔

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ایک شاگرد

مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رامپوری

(عہد شخصیت اور علمی خدمات)

۱۳۱۷ھ/ ۱۸۹۹ء ——— ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۸ء

از: ڈاکٹر ماجد علی خاں، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ جل شانہ، نے اس عالم میں موت و حیات کا رشتہ ایک ایسا رشتہ بنایا ہے جس سے ادنیٰ و اعلیٰ کوئی بھی مستثنیٰ نہیں۔ چاہے وہ انبیاء جیسے مقرب بارگاہ ہوں یا فرعون، ہامان و شدّاد جیسے منضوب و ضال ہوں سب کو موت کی آغوش میں بالآخر جانا ہی ہوتا ہے اور اس کے ذائقہ کو چکھنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے: کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ۔ (ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔) باقی رہنے والی صرف خداوند قدوس کی ذات ہے اس کے علاوہ ہر شے پر ازل سے ہی فنا کے انتظ کو ثبت کر دیا گیا ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّ یَبْقیٰ وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ۔

اس کے باوجود کچھ اموات ایسی ہوتی ہیں جن کو اس فانی دُنیا میں موت سمجھا جاتا ہے لیکن اللہ کے یہاں وہ حیات شمار کی جاتی ہیں: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (البقرۃ: ۱۵۴)
ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جاتے ہیں اُن کی نسبت یوں بھی

مت کہو کہ وہ (معمولی مردوں کی طرح) مردے ہیں بلکہ وہ تو (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں لیکن تم (ان حواس سے اس حیات کا) ادراک نہیں کرسکتے۔ اسی مفہوم میں عربی کے ایک شاعر نے کہا ہے:

موت التقی حیاۃ لا نفاد لہا
قد مات قوم وھم فی الناس احیاء

(ترجمہ) متقی اور پرہیزگار کی موت غیر فانی زندگی ہے۔ یہ لوگ بظاہر مر چکے ہیں حالانکہ عالم انسانیت میں دراصل زندہ یہی ہیں۔

حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ان ہی چند ہستیوں میں سے ایک تھے جو بظاہر تو اس عالم فانی سے گزر چکے ہیں لیکن ان کے

کارنامے اب بھی زندہ جاوید ہیں اور عالم انسانیت میں یہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آپ کی پیدائش رامپور میں ۴ ربیع الاول ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۸۹۹ء ہوئی اور وفات ۲۷ شوال ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۵ جون ۱۹۸۷ء بروز جمعرات ہوئی۔

حضرت مولانا کا تعلق پٹھان قوم سے تھا۔ حسن اتفاق کہیے یا قسمت کی ستم ظریفی راقم السطور کا تعلق بھی اسی قوم سے ہے۔ میرے ان دو متضاد الفاظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس قوم میں بعض خصائص متضاد ہوتے ہیں۔ جہاں پٹھان اپنی جرأت، خودداری، دلیری، بہادری، اعلیٰ ظرفی اور بات کی پختگی کے لیے مشہور ہیں اور ان کے اندر یہ صفات ملتی ہیں وہاں اگر اس قوم کا جلا نہ ہوا ہو اور اصلاح کی منازل تک اس کی رسائی نہ ہو سکے تو پھر یہ غضب اور شہوت میں ڈوب کر انسانی حدود کو پار کرنے میں بھی نہیں ہچکچاتی۔ جس کی مثال موجودہ دور میں کراچی کے پختون دمہاجر فسادات اور رامپور شہر میں آیسی قتل و غارت ہے اور ماضی میں پٹھان ریاستوں کے حکمرانوں وامراء کا ظلم و تشدد اور نادر شاہ کا دہلی میں قتل عام ہے۔

اسی وجہ سے ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ ایک صاحب نے ایک پٹھان سے کہا "میاں پٹھانوں میں کوئی پیغمبر ہی نہیں ہوا۔" پٹھان صاحب نے جلّا کر جواب دیا "تم جھوٹ بولتے ہو کیا (حضرت) عیسیٰ خاں اور (حضرت) موسیٰ خاں کا نام نہیں سنا؟" دراصل یہ اسلام کی خوبی ہے کہ ان متضاد صفات کی حامل قوم بھی اس کے دامن سے وابستہ ہو کر حضرت سرور کائنات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عامّہ اور فیض تامّہ سے مستفیض ہوئی۔

رامپور ایک ایسا شہر ہے جس کی گود میں سیکڑوں صاحب علم شخصیتوں، شعراء، ادباء، صوفیا اور علماء نے پرورش پائی اور اس کے آب و گل سے استفادہ کیا۔ اسی زمین کے بطن سے مولانا محمد علی اور شوکت علی جیسے جلیل القدر مجاہدین آزادی نکلے اگر رامپور کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالی جائے تو ایسی اعلیٰ شخصیتیں کم ہی ملیں گی۔ جنھوں نے اس شہر کے ۲ تاریخی دوروں کو اچھی طرح دیکھا و پرکھا ہو اور اپنی زندگی کے بڑے حصّوں کو دونوں دوروں میں گزارہ ہو۔ ایسے علماء میں اگر حضرت مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا نام لیا جائے تو بیجا نہیں ہوگا۔ حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب کا شمار نہ صرف ایسے علماء میں کیا جاتا ہے بلکہ ایسے صوفیاء میں بھی جنھوں نے اپنی زندگی کے بڑے حصّوں کو رامپور کے دو اہم تاریخی ادوار میں گزارا ہو۔ میری مراد رامپور کے ایک اُس دور سے ہے جو اس کا ریاستی دور تھا اور دوسرے اُس دور سے ہے جو ۱۹۴۷ء کی آزادیٔ ہند کے بعد کا یہ پھر یوں کہا جائے کہ ۱۹۵۰ء کے بعد کا دور ہے جب کہ ریاست کا خاتمہ ہوا اور رامپور ہندوستان کے نقشہ میں ایک ڈسٹرکٹ یا ضلع کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔

حضرت مولانا کے علمی و دیگر کارناموں پر روشنی ڈالنے سے قبل میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس شہر کے ان دو دوروں کے متعلق بھی سرسری طور پر کچھ نہ کچھ لکھ دیا جائے۔

رامپور کا ریاستی دور:

رامپور کا ریاستی دور جہاں ایک طرف شاہی دبدبہ اور پٹھانی شان و شوکت کا دور تھا تو وہاں یہ دور درباری خوشامد اور جی حضوری کا بھی دور تھا۔ ویسے عام طور پر رامپور کو ایسے حکمراں ملے جنھوں نے علماء اور مذہبی پیشواؤں کی قدر و منزلت کی۔ ریاست میں ایک اعلیٰ دینی ادارہ، مدرسہ عالیہ بھی قائم کیا گیا جس کی شہرت اندرون ملک سے نکل کر بیرون ہند تک پھیل گئی۔ بڑے بڑے علماء، اس کی مسند درس پر بیٹھنا اپنے لیے باعث عزت سمجھتے تھے۔ مدرسہ عالیہ کے تمام اخراجات ریاست کی طرف سے ہی پورے ہوتے تھے۔ بالخصوص ۱۸۵۷ء کے بعد رامپور میں کافی بڑی تعداد میں اہل علم و حرفہ آ گئے تھے۔ یہاں کے نوابین ان کی امداد بڑی فراخدلی سے کرتے تھے۔ اس ریاست نے ایسے حکمرانوں کو جنم دیا جنھوں نے غالب، داغ، امیر مینائی جیسے شعراء اور حکیم اجمل خاں صاحب جیسے اطباء، اور اہلِ علم کی مہمان نوازی کی۔ البتہ یہ دور جاگیردارانہ نظام پر قائم تھا۔ اگر اس دور میں نوابین کی نظر عنایت سے راتوں رات ایک غریب و بے آسرا شخص جاگیردار، زمیندار یا مستاجر بن جاتا تھا تو ۲۴ گھنٹوں کے اندر اندر شہر کے بڑے بڑے اور چنیدہ مستاجروں سے گاؤوں کو ضبط کر کے روٹیوں کا محتاج بھی کر دیا جاتا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ افراد کی ترقی و تنزلی حکمرانوں کی اشارۂ چشم و ابرو کی مرہون منت تھی۔ اصلاحی و علمی اور ٹھوس کام کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بعض وہ علماء، اُدباء، اور اہل حرفا جوان باتوں کو جھیل نہ سکتے تھے۔ ریاستوں کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں جا بسے تھے۔

رامپور کے ریاستی دور کی بعض اہم خصوصیات بھی ہیں جن کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہاں پر اُس دور میں بے روزگاری عام طور پر نہیں تھی۔ لوگ نسبتاً خوشحال تھے۔ نوابین نے رامپور میں بہترین عمارات بنوا کر اس کو مغربی یو پی کا ایک منفرد شہر بنا دیا تھا۔ نواب

مد علی خاں صاحب کا بنوایا ہوا قلعہ اور اس کے اندر کی حامد منزل نیز دوسری عمارات
لامی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسی طرح نواب رضا علی خاں صاحب کے دور میں
کثیر تعداد میں عمارتیں بنیں، سڑکیں چوڑی ہوئیں، شہر کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا۔
شہر کے باغات لکھنؤ کے باغات کے ہم پلّہ تھے۔ خسرو باغ اور بے نظیر باغ کے
میان کی سڑک جس کو عام طور پر ٹھنڈی سڑک کہا جاتا تھا، کی مثال دور دور
ملنا مشکل تھی۔ نواب رضا علی صاحب نے آزادیٔ ہند سے قبل رامپور میں
نے کارخانے قائم کروادیے تھے کہ یہ شہر چھوٹا سا کانپور کہلایا جانے لگا۔ یہ
کی دوربینی کی اہم مثال ہے۔ اگر وہ تمام کارخانے آج بھی اسی طرح قائم
ہتے تو یہ شہر انڈسٹریز میں یو۔ پی کے بہت سے صنعتی شہروں سے آگے ہوتا۔

اگر نواب حامد علی خاں صاحب رامپور کے اکبر تھے تو نواب رضا علی خاں
حب کو رامپور کا شاہجہاں کہنا بے جا نہیں ہوگا۔ ریاستی دور کی سب سے بڑی
وصیت یہ تھی کہ رامپور میں فیملی سسٹم پوری طرح محفوظ تھا۔ گھر اور خاندان کے
ں کا چھوٹے ادب و احترام کرتے اور گھریلو خاندانی روایات کو زندہ رکھتے۔ علماء
عام طور پر احترام تھا اور صوفیاء کی توقیر و عزّت کی جاتی۔

مپور کا حال، آزادی کے بعد:

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی کے چند سال بعد ریاستوں کا خاتمہ ہوا اور اس میں
مپور سرِ فہرست رہا۔ اب رامپور ریاست کے بجائے اتر پردیش گورنمنٹ کا ایک
ع بن گیا جس کا افسرِ اعلیٰ و منتظم ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یا ضلع کلکٹر ہو گیا۔

ریاست کے خاتمہ پر سب سے بُرا اثر فوج اور پولیس کے ملازمین پر پڑا۔ ہزاروں
تعداد میں ریاست کے دور کے فوجی اور پولیس والے ملازمت سے سبکدوش
دیے گئے۔ اس کے نتیجہ میں بیروزگاری عام ہو گئی۔ جو کسر رہ گئی تھی زمینداری کے

خاتمہ نے اس کو بھی پورا کر دیا۔ رامپور کے زمیندار پٹھان کاشتکاری کو عیب سمجھتے
تھے۔ چنانچہ زمینداری، جاگیرداری اور مستاجری کے خاتمہ سے بڑے بڑے صاحب
حیثیت پٹھان روٹیوں کے محتاج ہو گئے۔ غربت اور افلاس نے ان کے دروازوں
پر دستک دینا شروع کر دی۔ تعلیمی اعتبار سے بھی ان لوگوں کے پاس اعلیٰ ڈگریاں
نہیں تھیں لہٰذا ان میں سے بہت سے لوگوں نے معمولی ملازمتوں پر گزر اوقات
کرنے پر قناعت کی۔ اس طرح اس چھوٹی سی ریاست کی خوشحالی پامال کر دی گئی
غربت کے نتیجے میں جرائم میں اضافہ ہوا۔

رامپور کے پٹھان مزاج کے اعتبار سے بہت گرم واقع ہوئے ہیں۔ جرائم
کے اضافے میں مزاج کی اس گرمی کا بھی کافی اثر ہے۔ اس کے علاوہ آزادی کے
غلط تصور نے بھی لاقانونیت میں اضافہ کیا ہے۔ عام لوگ آزادی کو غیر ملکی حکومت
سے آزادی کی جگہ آزادیٔ قانون (یعنی قانون سے چھٹی) تصور کرنے لگے ہیں، چنانچہ عام
طور پر قانون کا احترام دل سے اٹھ گیا ہے۔ پھر قانون نافذ کرنے والے ادارے
بڑی حد تک خود قانون شکن بن بیٹھے ہیں۔ غرض ان تمام اسباب کی وجہ سے رامپور
میں بالخصوص اور اس ملک میں بالعموم آزادی کے بعد لاقانونیت کا دور دورہ ہوا
اس شہر میں آپسی قتل و غارت کی جو فضا اب پیدا ہو گئی ہے یا پیدا کر دی گئی ہے
اس کی مثال ہندوستان کے دوسرے شہروں میں مشکل سے ہی ملے گی۔ معمولی
معمولی بات پر پستول کی گولی یا چاقو کی نوک سینے کے اندر ہوتی ہے۔ مجھے خوب
یاد ہے کہ بچپن میں ایک قتل محض ساڑھے دس آنے (موجودہ تقریباً ۶۵ پیسے)
لین دین کی تکرار پر ہوا تھا۔

ریاست کے خاتمہ کے بعد اس شہر سے فیملی سسٹم کا بھی آہستہ آہستہ خاتمہ ہونا
شروع ہو گیا۔ گھر اور خاندان کے بزرگوں کی عزت و احترام آہستہ آہستہ ختم ہونا شروع

ہو گیا البتہ اگر کسی کے خاندان میں کوئی شرابی، جواری اور بدمعاش قسم کا آدمی ہے
و اس کا احترام محض عزت بچانے کے ڈر سے ضرور ہوتا رہا فیملی سسٹم کے خاتمہ
کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ عام لوگوں نے روزگار کی خاطر باہر کا سفر کرنا شروع کردیا۔
اور پھر تیل کی دولت کی وجہ سے خلیج ممالک میں ملازمتوں کی بوچھار ہے ان خاندانوں
کے ذہنوں میں احساس برتری پیدا کر دیا۔ جو غربت و افلاس میں گرفتار تھے اور "نودولتیہ"
کا ایک جدید طبقہ وجود میں آ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عزت اور احترام کی وجہ مال اور
عہدہ بن گیا۔ رامپور کا مثالی معاشرہ تقریباً تباہ ہو گیا۔ جو لوگ باہر نہ جا سکے انھوں نے
مقامی طور پر غیر قانونی دھندے شروع کر کے دولت بٹورنے کی ریس میں شوق و ذوق
سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے جوا، سٹہ اور شراب بنانے و بیچنے جیسے
مخرب اخلاق کاروبار غیر قانونی طور پر محلوں میں عام ہو گئے، پولیس کی بھی جیبیں
گرم ہوئیں۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے کہ عام اخلاقی سطح اور گر گئی۔

حضرت مولانا وجیہہ الدینؒ کی اہم کرامت:

یہ تھے وہ حالات جن کا سابقہ حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحبؒ کو ا
لیکن ان تمام حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مولاناؒ نے اپنے دینی، علمی اور اصلاحی
کام کو جاری رکھا۔ صوفیاء کے اندر ایک اصطلاح ہے: "الاستقامۃ فوق
الکرامۃ" (یعنی دین پر استقامت کرامت کے اوپر فوقیت رکھتی ہے) حضرت
مولاناؒ نے رامپور کے ریاستی دور اور آزادی کے بعد کے دور، دونوں دوروں جس بے مثال
استقامت سے دین کی خدمت کی ہے وہ یقیناً حضرت مولانا کی ایک اہم کرامت ہے۔
ان کی اس بے لوث خدمت کی وجہ سے دونوں دوروں میں ان کی عزت اس شہر
کے اشراف و اشرار میں سے ہر فرد کے دل میں یکساں طور پر رہی۔ یہاں تک کہ علم و
تقویٰ میں ان کا نام رامپور میں ضرب المثل بن گیا۔ گھروں اور خاندانوں میں ان کے

نام کی مثالیں دی جانے لگیں۔ مجھے خود اپنا واقعہ یاد ہے کہ جب میں نے علی گڑھ
دینیات کی تعلیمات شروع کیں تو والد صاحب مرحوم نے فرمایا کہ علی گڑھ میں دینیا
پڑھ کر تم مولوی وجیہہ الدین صاحب تو بن نہیں جاؤ گے۔ اگر کوئی شخص بہت زی
عبادت اور نماز روزہ کی طرف راغب ہوتا تو لوگ کہتے کہ وہ تو مولوی وجیہہ الد
صاحب بننے کی فکر میں ہے۔ واعظین اور خطیب حضرات، حضرت مولاناؒ کے ط
پر وعظ و خطبہ کہنا اپنے لیے باعث فخر سمجھنے لگے۔ غرض حضرت مولانا وجیہہ الدین
خاں صاحب نے دونوں دوروں میں اپنی علمیت اور تقویٰ کا سکہ رامپور کے عوام
دلوں پر بٹھا دیا اور اپنے وعظوں، علمی مجالس، جمعہ کے خطبوں اور درس و تدریس
ذریعہ دونوں دوروں اس شہر کے مسلمانوں کی نیز ملک کے دور دراز علاقوں کے مسلم
کی اصلاح فرماتے رہے۔

شہر کے بڑے و چھوٹے، ہندو و مسلمان، امیر و غریب، حکمراں و رعایا، زمیند
و کاشتکار، سرمایہ دار اور مزدور سب کے سب مولانا کی یکساں طور پر عزت کرتے ا
ان کی شخصیت کو رامپور کے لیے باعث فخر جانتے۔ میری کوتاہ نظر میں اس شہر کی مختصر
میں کوئی ایسی شخصیت بحیثیت عالم دین نہیں ابھری جس نے عوام و خواص دونوں
اس طرح گردیدہ بنا لیا ہو جس طرح کہ حضرت مولاناؒ کے لوگ گردیدہ تھے۔

رامپور کے اس دور میں جو کہ آزادی ہند کے بعد شروع ہوا، مولاناؒ نے جس ط
رامپور کے عوام و خواص کی دینی و اخلاقی رہنمائی کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے
آپ نے اپنے مواعظ اور خطبات کے ذریعہ عوام کو احساس کمتری سے نکالا، ا
اندر خود اعتمادی پیدا کی اور برائیوں سے دور کرنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ میں
تحریر کیا ہے یہ وہ دور ہے جس میں فیملی سسٹم تک اثر انداز ہوا ہے، عام طور پر
بڑوں کا احترام دلوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ اس پرفتن دور میں جب کہ الیکشنوں

مخالف امیدوار کی سات پیڑھیوں تک کے حالات اگل دیے جاتے ہیں، جہاں بڑے بڑوں کی ٹوپیاں اچھالنا معمولی بات سمجھا جاتا ہے۔ مولاناؒ نے اپنے بے مثال عمل و کردار کے ذریعہ اہلِ رامپور کے دلوں کو جیت لیا۔

اخلاق:

جو لوگ حضرت مولاناؒ سے ملتے رہے ہیں ان کو معلوم ہے کہ مولاناؒ کے مزاج میں ایسی شگفتگی تھی جس کا ان لوگوں کو اندازہ لگانا مشکل ہے جو مولانا کے قریب نہیں آئے تھے۔ اپنے ہم عمر لوگوں کی عزّت اور چھوٹوں سے محبّت حضرت مولاناؒ کی مجلس کا ایک عام دستور تھا۔ اس کی وجہ سے رامپور کے عوام مولانا کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ چھوٹوں سے محبت کے ایک دو ذاتی واقعات ان سطور میں تحریر کرتا ہوں:

اپنی کسی ضرورت سے حضرت مولانا دہلی تشریف لائے۔ جمعہ کی نماز میں جامعہ ملیہ کی مسجد میں حضرت مولاناؒ کو دیکھ کر راقم السطور بہت خوش ہوا اور بعد نماز غریب خانہ پر چلنے کی درخواست کی۔ حضرت مولانا نے بہت خندہ پیشانی سے درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔ وہاں پر جامعہ کے کئی دوسرے حضرات بھی جمع ہو گئے۔ حضرت مولانا نے اُن سے کہا: ڈاکٹر صاحب میرے محلہ دار بھی ہیں۔ (یہ بات میرے لیے نئی نہیں تھی) پھر خود ہی اپنے مخصوص انداز میں تشریح کی اور فرمایا ان کے دادا اور میرے والد... پڑوسی تھے اور بچپن میں میں بھی ان کے دادا کے مکان کے قریب محلہ کٹرہ جلال الدین خاں کے اُس حصہ میں رہتا تھا جو کہ اب قلعہ میں آچکا ہے۔ ہم لوگ صبح کو فجر کے بعد ٹہلنے نکل جاتے تھے جب واپس آتے تو اکثر ان کے دادا مکان کے باہری حصے میں بیٹھے ہوئے ملتے تھے اور ہم سے پوچھتے تھے۔ بچوں چائے پیو گے۔ ہم لوگ ان کی چائے کو اس وجہ سے پسند کرتے تھے کہ وہ

خالص دودھ میں پتّی اور قند ڈال کر چائے بنواتے تھے اور ہمیں پلاتے تھے
رامپور میں جب قلعہ کی تعمیر ہوئی تو حضرت مولاناؒ محلہ کرٹھ سے محلہ انگوری با
منتقل ہو گئے اور ہمارا خاندان بدریا ملّا ظریف۔ لیکن وہاں پر بھی مولانا
اس طرح نسبت رہی کہ محلہ بدریا ملا ظریف حضرت مولاناؒ کے خاندان کے
ایک صاحب ملا ظریف خاں صاحب کے نام پر آباد تھا۔[1]

چھوٹوں پر شفقت کے سلسلہ میں ایک دوسرا ذاتی واقعہ بھی نقل کرتا ہو
راقم السطور کی ایک بھتیجی کا نکاح حضرت مولاناؒ نے ہی پڑھایا تھا۔ راقم السطور
وکیل کی حیثیت سے آیا تو حضرت مولاناؒ نے ازراہ شفقت فرمایا: "آپ ہی نکاح
پڑھادیں"۔ (نوٹ: عوام کی معلومات کی غرض سے تحریر ہے کہ ولی کی طرح
وکیل بھی خود نکاح پڑھا سکتا ہے۔) لیکن احقر نے بہت ہی ادب سے درخو
کی کہ مولانا نکاح تو آپ ہی پڑھائیں گے۔ اس کے بعد برصغیر ہند و پاک کی ایک
جماعت کے سربراہ جو کہ اس وقت حیات تھے ان کی ایک تحریر کے بار
میں مولاناؒ فرمانے لگے۔ دیکھیے انھوں نے یہ لکھا ہے حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف
ہے۔ یہ میں اس وجہ سے نقل کر رہا ہوں کہ حضرت مولانا جب کبھی بھی ان حضرات
کے مسلک یا رائے کا ذکر کرتے جن کا مسلک یا رائے حضرت مولاناؒ سے مختلف ہو
ان لوگوں کے نام کو بہت مناسب الفاظ میں لیتے لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنی ر
بھی پر زور الفاظ میں ذکر کردیتے۔ میں نے مولانا کی زبان سے اپنے مخالفین کے
بھی سخت الفاظ نہیں سنے۔

---

[1] مولانا سردار شاہ خاں، حالات مشائخ، ص ۲۲۶؛ وجیہہ الدین احمد خاں
صاحب، فیوضات وزیریہ، ص ۵۰

حضرت مولاناؒ کے اخلاق کے سلسلے میں ایک اور ذاتی واقعہ تحریر ہے۔
یہ واقعات پرائیوٹ ہیں لیکن ان سے مولاناؒ کے اخلاق وکردار پر روشنی پڑتی
اسی وجہ سے ان کو نقل کر رہا ہوں۔ راقم السطور ویسٹ انڈیز میں ملازمت
دوران ایک مرتبہ ویسٹ انڈیز سے چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ بعد مغرب حضرت
ناؒ سے ملنے کی غرض سے مدرسہ فرقانیہ حاضر ہوا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت
ذکر ہوتا ہوگا۔ معمول کے مطابق اس وقت حلقۂ ذکر ہو رہا تھا اور اس جگہ
ت ہی ہلکی روشنی تھی یا اندھیرا تھا جس میں ایک دوسرے کو دیکھا نہ جا سکتا تھا۔
ایک کونہ میں بیٹھ گیا۔ لیکن حضرت مولاناؒ کو آہٹ محسوس ہوگئی۔ فوراً دریافت
کون ہے؟ میں نے عرض کیا۔ ماجد۔ فرمایا، کیا امجد خاں صاحب کے لڑکے؟ میں نے
جی ہاں۔ یہ سنتے ہی حلقۂ ذکر بند کروا دیا گیا۔ نیز تیز روشنی کروائی اور چائے
رہ سے تواضع کی۔ اس طرح کے اور بھی متعدد ذاتی واقعات ہیں جن کو طول کی وجہ
ے ذکر نہیں کر رہا ہوں۔

جب حضرت مولاناؒ کے یہ اخلاق اپنے چھوٹوں کے ساتھ تھے تو دوسرے
وں کے ساتھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے معاملات واخلاق کا اندازہ بخوبی
یا جا سکتا ہے۔ اس ماحول میں ان اخلاق کا حامل وہی شخص ہو سکتا ہے جس کو
للہ تعالیٰ نے اپنی ولایت کے لیے منتخب کیا ہو۔

راست گوئی و بے باکی:

مومن کی ایک پہچان اس کی راست گوئی اور صاف گوئی ہے جب کہ منافق کی
ک پہچان اس کی کذب بیانی ہے۔ حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خان صاحب
مۃ اللہ علیہ اپنی راست گوئی اور صاف گوئی کے لیے مشہور تھے۔
آپ کی راست گوئی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ حضرت مولاناؒ شکار کے

بہت شوقین تھے۔ ایک مرتبہ شکار کو تشریف لے گئے۔ ساتھ میں اور صاحباد
بھی تھے۔ شیر کا شکار تھا۔ حضرت مولاناؒ وقت پر شیر کی تاک میں بیٹھ گئے۔ اتفاق
شکاریوں میں سے (یعنی ساتھیوں میں سے) ایک صاحب ایک جھاڑی میں کسی
ضرورت سے گئے ہوئے تھے۔ جھاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے حضرت مولاناؒ نے
کہ جھاڑی میں شیر ہے چنانچہ بندوق داغ دی۔ گولی اُس شخص کے لگ گئی اور بع
میں انتقال کر گیا۔ یہ شکار نینی تال کے ترائی کے علاقہ میں کھیلنے گئے تھے۔ حضرت
مولاناؒ پر قتل کا مقدمہ قائم ہو گیا۔ بیان کے لیے جب پیشی ہوئی تو آپ نے صاف صاف
فرمادیا کہ ہاں میری بندوق کی گولی ان کے لگی تھی البتہ میں نے ان کو مارنے کے ارادے
سے بندوق نہیں چلائی تھی بلکہ شکار کے ارادے سے چلائی تھی۔ عدالت نے
حضرت مولاناؒ کو اس راست گوئی پر بری کر دیا۔ بعد میں حضرت مولاناؒ نے ان صاحب
کے خاندان کے لوگوں کو خوں بہا کے طور پر کھیتی کی زمینیں دیں۔

حضرت مولاناؒ کی بے باکی کے سلسلہ میں "حالات مشائخ" میں تحریر کردہ ایک
واقعہ قابلِ توجہ ہے جس کو یہاں ہو بہو نقل کیا جاتا ہے:۔

"سنہ ۱۹۶۵ء میں جب کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ
ہو رہی تھی، رامپور کے قلعہ کے میدان میں ایک عظیم اجتماع ہوا جس میں
شرکاء کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار بیان کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اتنا
بڑا... اجتماع غالباً رامپور کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوا ہو گا۔ اس جلسہ
میں ریاست کے سابق نواب رضا علی خاں اور سابق چیف منسٹر رامپور
بشیر حسین زیدی بھی شریک جلسہ تھے۔ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں
کو اس ملک کی ہندو اکثریت کے ساتھ حکومت وقت بھی مشکوک نظروں
سے دیکھ رہی تھی۔ کیونکہ ہندوستان و پاکستان کے مسلمانوں کا جو آپس میں

تعلق ہے وہ اسلام ہی کا نہیں بلکہ خون اور رشتے کا بھی ہے۔ اگر کسی کا باپ وہاں ہے تو کسی کا بیٹا یہاں کسی کا بھائی تو کسی کی بہن ....(وغیرہ) ....

اب ان حالات میں اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہم اس کے دشمن ہیں تو یہ بات بھی غلط اور واقعہ کے خلاف اور منافقت بھی اور پھر کوئی دل سے ماننے کو آمادہ نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ ہمارا پاکستان سے بہت گہرا تعلق ہے ہم اس کے دوست و ہمدرد ہیں تو ہم ملک کے باغی اور غدار قرار پائیں ——— ایسے نازک اور سنگین موقعہ پر آپ نے جو تقریر فرمائی بس وہ آپ ہی جیسے اولو العزم حضرات کا کام ہے مسلمانوں کی زبان سے تو بے ساختہ کلمات تحسین ادا ہو رہے تھے اور غیر مسلم بھی آپ کی حق گوئی اور قابلیت کے گن گا رہے تھے۔ آپ نے نہایت حق گوئی اور بے باکی کے ساتھ جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ہم نہ باغی ہیں اور نہ غدار اور نہ منافق۔ اسلام منافقت کو پسند نہیں کرتا۔ وطن سے محبت کی اگر اہمیت ہے تو مسلمانوں کی، اسلام اور اہل اسلام سے بھی محبت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ پاکستان کے رہنے والے مسلمان ہوں یا ترکی کے، انڈونیشیا کے ہوں یا ملیشیا کے، مراکش کے ہوں یا عراق کے، سعودی عرب کے ہوں یا مصر کے، شام کے ہوں یا الجزائر کے یا تونس کے ہوں یا اردن کے، ہم بحمد اللہ تعالیٰ مسلمان ہیں اور مسلمانوں سے ہمارا تعلق صرف خون اور رشتہ کا یا نام کا نہیں بلکہ اسلامی کا ہے۔ سچا مسلمان کبھی منافقت کو پسند نہیں کرتا۔ ہم اسلام کے پیرو کار ہیں اور اس کے حامی و مددگار۔ اسلام حقانیت کا علمبردار ہے۔ اگر وطن سے محبت اسلام اور اسلامیت میں خلل انداز نہ ہو تو اسلام وطن سے ایسی

محبت کی مخالفت بھی نہیں کرتا ہے۔ ہندوستان و پاکستان ایشیا کے ممالک میں سے دو ملک ہیں۔ پہلے یہ دونوں ایک تھے۔ جغرافیائی حیثیت سے اب یہ دو الگ الگ ملک ہیں۔ ان دونوں ملکوں کے سربراہوں کو چاہیے کہ لڑائی کے بجائے گفت و شنید کے ذریعے اپنے متنازعہ مسائل خود حل کریں۔ یوروپ، روس اور امریکہ کے دست نگر اور محتاج نہ بنیں۔ قرآن عظیم میں ہے کہ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ۔ صلح بہتر چیز ہے۔"[1]

حضرت مولاناؒ کی یہ بیباکانہ تقریر آج بھی اسی طرح مفید ہے جس طرح کہ ۱۹۶۵ء میں تھی۔

علمی مقام:

مولانا ایک بلند پایہ محدث، مفسر اور فقیہہ تھے۔ علم حدیث میں آپ نہ صرف ایک بہت بڑے محدث اور علامۃ العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے بلکہ خود بھی اونچے درجہ کے محدث تھے۔ آپ نے شوال ۱۳۲۹ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور ۲۸ رجب ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں حدیث شریف کی تعلیم حاصل کر کے سند فراغت حاصل کی[2]۔ یہ سند بہت مشہور ہے رامپور میں بھی آپ نے کتب، حدیث کی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کی تھی چنانچہ آپ کو حضرت حافظ شاہ وزیر احمد صاحب محدث رامپوریؒ اور ان سے شیخ حضرت مولانا شاہ وزیر محمد خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اجازت حدیث حاصل ہے[3]۔

---

[1] مولانا سردار شاہ خاں، حالات مشائخ رامپور، ص ۳۴۲، ۳۴۴

[2] مولانا سردار شاہ خاں صاحب قادری وجیہی، حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۳۰

[3] ایضاً، ص ۲۳۰۔

حضرت مولاناؒ اپنے تلامذہ کو حضرت مولانا حافظ شاہ وزیر احمد صاحبؒ محدث رامپوری کے توسط سے مندرجہ ذیل سند بھی مرحمت فرماتے تھے: حضرت مولانا حافظ شاہ وجیہہ الدین احمد خاں صاحب عن حضرت مولانا حافظ شاہ وزیر احمد صاحب محدث رامپوریؒ عن حضرت مولانا سید محمد شاہ صاحب، محدث رامپوریؒ عن حضرت مولانا سید حسن شاہ صاحب محدث رامپوریؒ عن حضرت مولانا شاہ سید عالم علی صاحب نگینوی محدث مرادآبادیؒ عن حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلویؒ عن حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ عن سراج المحدثین حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ[1] حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ سے یہ سلسلۂ حدیث سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب نے طویل عرصہ تک مختلف مدارس میں درس حدیث دیا۔ ایک مرتبہ راقم السطور سے خود فرمایا کہ میں نے ساٹھ (۶۰) سال سے زیادہ درس حدیث دیا ہے۔ یہ مدت قمری (ہجری) سنہ کے اعتبار سے فرمائی تھی۔ کتاب "حالات مشائخ" سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ریاست دادوں ضلع علی گڑھ کے مدرسہ حافظیہ سعیدیہ سے ہی مسلم شریف پڑھانا شروع کردی تھی[2] یہ ملازمت غالباً ۱۳۴۳ھ سے شروع کی تھی اس طرح ساٹھ سال کی مدت ۱۴۰۳ھ میں مکمل ہو جاتی ہے۔ حضرت مولاناؒ نے مجھ سے مندرجہ بالا مدت ۱۴۰۳ھ کے بعد ہی کسی تاریخ میں بتائی ہے۔ مولانا کا درس بخاری ایک خاص انداز کا

---

[1] مولانا سردار شاہ خاں صاحب قادری وجیہی، حالات مشائخ، رامپور، ص ۲۳۰

[2] ایضاً، ص ۲۳۵-

ہوتا تھا جس میں آپ اکابر محدث کے طرز پر احادیث کی شرح کے ساتھ ساتھ ضرورت پڑنے پر حنفی نقطۂ نظر کی بھی وضاحت کرتے تھے۔ راقم السطور کو اتفاقاً کئی بار مدرسہ فرقانیہ میں مولانا کے درس بخاری میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

اصول حدیث پر ایک کتاب "حدیثی اصول" مولانا کی اس فن میں گہری بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ اردو میں اصول حدیث پر یہ کتاب ایک منفرد حیثیت کی مالک ہے جس میں جگہ جگہ مولانا نے اصول حدیث کے سلسلہ میں ائمہ کے اختلافات سے بھی بحث کی ہے۔ مثلاً حدیث مرسل کے مقبول و نا قابلِ قبول ہونے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر مرسل کی عادت ثقات اور غیر ثقات کل کے حذف کرنے کی ہے تو باتفاق ائمہ مجتہدین قابل قبول نہیں، اور اگر محض ثقات راوی کو حذف کرتا ہے، تب بھی جمہور محدثین توقف کے قائل ہیں۔ اس لیے احتمال ہے کہ شاید محذوف راوی ضعیف ہو۔ اور یہی امام احمدؒ کا ایک قول ہے۔ شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "کہ اگر حدیث مرسل کی تائید کسی دوسری حدیث سے ہو جائے خواہ وہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو مرسل مانی جائے گی، ورنہ توقف کیا جائے گا" لیکن امام احمدؒ کا قول ثانی اور امام مالکؒ اور امام اعظمؒ بلکہ جملہ کوفیین کا مذہب یہ ہے کہ بغیر کسی تائید کے بھی مرسل قابل قبول ہے۔ یہی مذہب اشبہ بالحق ہے چونکہ جمہور کا یہ احتمال کہ ممکن ہے محذوف راوی ضعیف ہو، اس وقت قابل اعتبار ہو سکتا ہے کہ ہم ثقہ راوی کی مرسل میں قید نہ لگائے ہوں۔

لہ مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، حدیثی اصول، رامپور، ص ۳۰-۳۱

ظاہر ہے کہ ثقہ وہی ہوگا جو غیر ثقہ کو نہ چھپائے۔ مرسل کی ثقاہت خود محذوف کی ثقاہت کی دلیل ہے۔" لہ

حدیث میں ناسخ و منسوخ کی بحث کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"...... یہ تفصیل تعارض سے متعلق مذہب شافعیؒ کی بنا پر تھی اب ہم حنفیہ کے مطابق تفصیل بیان کرتے ہیں۔ حنفیہ کا قول ہے کہ اول نسخ ہے پھر ترجیح پھر توفیق پھر توقف۔

اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ حنفیہ نے توفیق کو مذہب شافعی کے مطابق کیوں مقدم نہیں کیا، اس لیے توفیق کی صورت میں دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے گا، اور نسخ کی صورت میں صرف ایک پر۔

حضرت استاذی مولانا شاہ محمد انور صاحب مدظلہ العالی نے اس طرح جواب دیا ہے کہ: "ہمارے امام کا قول حق ہے، اس لیے کہ نسخ سے مراد وہ نسخ ہے جو بطریقہ نقل ثابت ہوا اور جہاں ہم کو نقل مجبور کرتی ہے کہ ایک حدیث ناسخ ہے اور دوسری منسوخ، پھر بھی توفیق کی طرف رجوع کرنا تو ایسا ہے کہ جیسے ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ درحقیقت اسلام یہودیت اور نصرانیت کا ناسخ ہے پھر بھی ہم توفیق کے طالب بن کر فروعات میں اتحاد تلاش کریں۔" ۲

اصح الاسانید پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بعض اسانید کے متعلق اصح الاسانید ہونے کا قول کہا گیا ہے۔ احمد بن حنبلؒ اور اسحاق بن راہویہؒ سند — "زہری عن سالم بن عبداللہؓ

لہ مولانا وجیہ الدین احمد خاں، حدیثی اصول، رامپور، ص ۳۰، ۳۱

۲ ایضاً، ص ۵۲

بن عمر عن ابیہ" کو اصح الاسانید کہتے ہیں۔ علی المدینیؒ سند ــــ "محمد بن سیرین عن عبیدۃ بن عمر عن علی" کو اصح کہتے ہیں۔ یحییٰ بن معینؒ اور امام نسائیؒ سند ــــ "ابراہیم النخعی عن علقمہ عن ابن مسعود" کو اصح کہتے ہیں۔ بخاریؒ سند ــــ "مالک عن نافع عن ابن عمر" کو اصح کہتے ہیں۔ ابوبکر بن شیبہؒ سند ــــ "زہری عن علی بن الحسن عن ابیہ عن علی" کو اصح کہتے ہیں۔

لیکن قول مختار یہ ہے کہ کسی خاص سند پر مطلقاً اصحیّت کا اطلاق کرنا اور جملہ اسانید کو ہر طرح اس کو کم کر دینا مناسب نہیں۔ اور یہ جس کی تفصیل ہم ائمہ کرام مذکورین سے بعض اسانید کی اصحیّت کے متعلق نقل کر چکے ہیں، بعض امورات کو مدّ نظر رکھ کر اصحیّت جزئیہ کا حکم لگایا گیا ہے ہاں جس کی اصحیّت کے متعلق ائمہ سے صراحت آچکی ہے وہ ضرور ...... ان طرق سے اعلیٰ ہیں جن پر کسی نے آج تک اصحیّت کی بالخصوص تصریح نہیں کی ......"[1]

اس طرح اس کتاب میں مولاناؒ نے بڑی خوبی سے اصول حدیث میں اختلا[ف] ائمہ کو بھی جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب غالباً ۱۳۴۴ھ میں لکھی گئی تھی کیونکہ مولانا [...] محبوب علی صاحب (پرنسپل جامع العلوم فرقانیہ، رامپور) کے مطابق یہ کتاب تصن[یف] کرنے کے تقریباً ۵۸ سال بعد[2] پہلی بار ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ (مطابق ستمبر ۱۹۸۲ء) میں طبع ہوئی۔ کتاب کا یہی اڈیشن اس وقت ہمارے پاس ہے۔

---

[1] ایضاً، ص ۷۹، ۸۰

[2] ملاحظہ ہو: "تعارف" کتاب ہذا، ص ۲

مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحبؒ نہ صرف ایک بلند پایہ محدث تھے بلکہ ایک
مفسر بھی تھے۔ اپنے مواعظ و تقاریر میں قرآنی آیات کی ایسی جچتی ہوئی تفسیر فرماتے
جس سے آپ کی جلالت علم کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ "جس زمانے میں آپ کا ریاست
دادوں ضلع علی گڑھ میں قیام تھا اور وہاں پر مدرسہ حافظیہ سعیدیہ میں مسند نشین درس
تھے تو اس زمانہ میں رئیس اعظم دادوں نواب ابوبکر خاں صاحب نے ایک روز
آپ سے آیت کریمہ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ کی تشریح کرنے کی درخواست
کی۔ آپ نے اس پر کافی دیر تک تقریر فرمائی۔ دوسرے روز نواب صاحب موصوف
نے پھر یہی آیت کریمہ پیش کی۔ آپ نے پھر اس موضوع پر بڑی طولانی تقریر کی۔ تیسرے
روز پھر نواب صاحب موصوف نے اسی آیت کریمہ کو تقریر کا موضوع قرار دیا۔ آپ نے
تیسرے روز ایسی جامع اور بصیرت افروز تقریر فرمائی جس سے نواب صاحب موصوف
کا قلب مطمئن ہو گیا۔"[۱]

اصول تفسیر کے موضوع پر مولانا کی ایک تصنیف "مقدمۃ القرآن یعنی تفسیر
کا اصول" کے نام سے ہے۔ اس میں مولانا نے فہم قرآن، تفسیر قرآن کے طریقے، اسرائیلیات
اور قرآن، ترتیب سور اور سائنس اور قرآن جیسے مضامین سے بحث کی ہے۔ فہم قرآن
کے سلسلے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:-

"قرآن عظیم کو چند مقامات پر "کتابٌ مُّبین"، یعنی کھلی ہوئی کتاب
کہا گیا ہے، اس لفظ سے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ "قرآن کو ہر شخص
سمجھ سکتا ہے اور اس میں کسی دوسرے کی اعانت درکار نہیں ہے۔" اس
غلط فہمی سے بہت سے نتائج بد پیدا ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ ہم بھی

۱۔ مولانا سردار خاں صاحب، حالات مشائخ رامپور، ص ۴۰ ۲

اس بات کے قائل ہیں کہ فی الواقع "قرآن کھلی ہوئی کتاب ہے"۔ لیکن اس کے مراتب ہیں۔ جو شخص علوم عربیہ اور لسان عرب سے واقف نہیں وہ کسی ایک جملہ کا مطلب کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ کیا کوئی صاحب عقل یہ کہہ سکتا ہے کہ غیر عربی داں "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ" کا ترجمہ سمجھ سکتا ہے؟ اگر نہیں سمجھ سکتا، اور یقیناً نہیں سمجھ سکتا تو اس کے حق میں قرآن کھلی ہوئی کتاب کہاں ہوئی؟ اس لیے مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ عربی زبان سے جو واقف ہے؛ اس کے لیے قرآن عظیم کھلی ہوئی کتاب ہے اور جو اس سے واقف نہیں؛ اس کے لیے کھلی ہوئی کتاب نہیں۔ اگر کوئی شخص عربی زبان سے واقف ہے لیکن تاریخ اسلام اس کے پیش نظر نہیں تو تاریخی واقعات میں اُس کا فیصلہ کرنا کہ فلاں بیان واقعہ کی ابتدا ہے، یا انتہا، یا درمیان؛ اس کے لیے ناممکن ہے۔ [۱]

دوسری طرف مفسر کے لیے عربی زبان کے علاوہ دیگر علوم میں مہارت کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"۔۔۔۔۔۔ اگر کسی نے ظاہری عربی دانی کی بنا پر کسی سورت کی ایک تفسیر کر دی لیکن قوی حدیث اس کے خلاف ہے تو کیا صحیح حدیث مفید رہے گی یا اس کی ذاتی رائے؟ بعض مقامات پر حضورؐ سے کوئی روایت دستیاب نہیں ہوئی ہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے آیات فرقانیہ کی تفسیریں منقول ہوئی ہیں۔ ایسے مقامات پر اقوال صحابہؓ اور اعمال صحابہؓ سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر

---

[۱] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، مقدمۃ القرآن یعنی تفسیری اصول، رامپور، ص ۲۷

صحابہ رض علیہم الرضوان کے اقوال مختلف ہوتے ہیں، وہاں ایک قول کو ترجیح دینے کے لیے قوت اجتہاد اور ملکۂ استنباط کی ضرورت ہے جو ہر مسلمان میں نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر عالم میں بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اہم ضرورت ہے کہ مفسّر اصولِ تفسیر سے واقف ہو یا کسی کا مقلّد ہو۔۔۔"[1]

اسرائیلیات اور قرآن کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے تحریر کیا ہے:

"۔۔۔۔۔۔ ہاں بنی اسرائیل میں سے ارباب علم جب اسلام میں داخل ہو گئے اور ان کی بات قابل پذیرائی ہو گئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

حدّثوا عن بنی اسرائیل — بنی اسرائیل سے واقعات نقل کرو

ولا حرج — اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے علماء اہل اسلام کا فیصلہ یہ قرار پایا کہ پہلے قرآن وحدیث اور مسلّمہ کلیات و اصول پر نظر کی جائے اس کے بعد اسرائیلیات پر نظر کی جائے۔ اگر سابقہ یقینیات کے خلاف نہ ہوں تو مان لیا جائے ورنہ نظر انداز کر دینا ضروری ہے"[2]

مولانا دیگر مستند اور جیّد مفسّرین کی طرح اسرائیلیات میں سے ہر قسم کی روایات نقل کرنے کے مخالف تھے البتہ وہ قابل اعتبار روایات جو کہ کسی قرآنی واقعہ کی تاریخی تشریح کرتی ہیں بشرطیکہ شریعت کے اصول کے منافی نہ ہوں قبول کر لینے میں مضائقہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مزید تحریر کرتے ہیں!۔

---

[1] ایضاً۔ ص ۲۸

[2] ایضاً۔ ص ۵۰

"...... الغرض اسرائیلیات سے مفر بھی نہیں، اور ہر چیز کو معتبر سمجھ لینا بھی درست نہیں۔ اس امتیاز کے لیے استعداد علمی اور فراہمی معلومات دینیہ کی بے حد ضرورت ہے"۔ [1]

سائنس اور قرآن کے موضوع پر مولانا نے اپنی اس کتاب میں اچھی بحث کی ہے فلسفیانہ خیالات اور سائنسی تحقیقات کو اسی حد تک گوارا کیا جا سکتا ہے جب تک کہ وہ شریعت کے تحت ہوں۔ چونکہ انسانی تحقیقات بدلتی رہتی ہیں اس لیے اگر کوئی تحقیق شریعت سے متضاد ہوگی تو اسلام میں وہ قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ اس ضمن میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"...... دوسری بات اسلام میں یہ ضروری ہے کہ علمی تحقیقات کو قطعی اور یقینی عقائد پر ترجیح نہ دی جائے۔ طریقۂ سلامتی یہ ہے کہ جہاں عقل پورا فیصلہ نہ کر سکے اور پورا علم نہ ہو سکے، وہاں خاموشی اختیار کر کے یہ کہہ دے کہ "اللہ جانے"، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے من العلم ان تقول لما لا تعلم "اللہ اعلم"۔ یہ علم کی بات ہے کہ جو نہ جانتا ہو اس کے متعلق یہ کہہ دے کہ "واللہ اعلم"

بڑے بڑے اکابر اسلام نے اسی حدیث پر نظر کرتے ہوئے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے۔ حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ سے سوال کیا گیا کہ "دہر کیا چیز ہے؟" آپ نے جواب میں فرمایا کہ "لا ادری" (میں نہیں جانتا) حضرت امام مالکؒ سے چالیس مسئلے دریافت کیے گئے۔ ۴ کا جواب دیا اور ۳۶ میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ یہ حضرات اپنے زمانے میں دین کے

---

[1] ایضاً ص ۵۲

ایسے چراغ تھے جن کی روشنی اب تک باقی ہے۔ کیا ایسے حالات میں اس وقت کے کم مایہ مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر چیز کے فیصلہ کے لیے تیار رہو اور بعض اوقات قطعی اور یقینی امور کا اس لیے انکار کردے کہ ماحول اور وقت اس کے خلاف ہے ؎

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ساز

الغرض مدعا یہ ہے کہ عوام تو سنی سنائی باتوں کے لیے ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے فلسفی تحقیقات پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ مسلمان کو غور کرنا چاہیئے۔ فلسفہ قدیم ہو یا جدید ہمارے یقینی مسائل کی کس قدر موافقت کرتا ہے اور کہاں کہاں مخالفت۔ موافق ہونے کی صورت میں تو "چشم ما روشن و دل ما شاد"۔ مخالفت کی صورت میں یہ کہنا ضروری ہے کہ انسانی علم بہت محدود ہے اور عقل کو ہر مقام پر دوڑانا عاقل کا کام نہیں۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن [1]

مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب اور تصوف:

حضرت مولاناؒ سلسلہ قادریہ نقشبندیہ مجددیہ میں ایک صاحب نسبت شیخ تھے ویسے تو مولاناؒ کو بتوصل حضرت مجدد الف ثانی سلاسل ربعہ یعنی چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ اور نقشبندیہ میں اجازت حاصل تھی لیکن آپ ذکر و اشغال قادریہ مجددیہ سلسلہ کے کراتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ تک حضرت مولاناؒ کا شجرہ اس طرح ہے: حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب از شاہ ممتاز

---

[1] ایضاً، ص ۵۷

حسینؒ از مولانا شاہ وزیر محمد خاں صاحبؒ از شاہ خواجہ خان محمد خاں صاحبؒ از شاہ احمد علی خاں صاحبؒ از شاہ سلطان امام الدین خاں صاحبؒ از شاہ درگاہی محبوب الٰہیؒ از حافظ شاہ سید جمال اللہ صاحبؒ از شاہ قطب الدین سید محمد اشرف حیدر حسینیؒ از خواجہ محمد زبیر مجددی سرہندیؒ از خواجہ محمد نقشبند مجددی سرہندیؒ از خواجہ محمد معصوم مجددی سرہندیؒ از امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندیؒ الخ (نوٹ: حضرت مجدد الف ثانیؒ سے اوپر اس سلسلے و دیگر سلاسل کے شجرے معروف ہیں وہ کسی بھی ایسی کتاب سے دیکھے جا سکتے ہیں جس میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سلاسل کی تفصیل ہو۔ حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحبؒ نے بھی اپنی تصنیف "فیوضات وزیریہ" میں یہ تفاصیل لکھی ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۲۷۹ تا ص ۳۰۴)

تصوف کے موضوع پر حضرت مولاناؒ کی ایک کتاب "فیوضات وزیریہ" ہے اس میں آپ نے تصوف کی اصطلاحات و دیگر امور بہت سہل انداز میں سمجھائے ہیں۔ بیعت کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"ایک بیعت" علی الاسلام" ہے۔ غیر مسلم نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مبارک اور مقدس ہاتھوں پر یا کسی اور بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں۔

دوسری "بیعت علی الہجرت" ہے۔ جو انصار نے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست مبارک پر کی تھی، کہ ہم اپنے شہر مدینہ میں آپ کو لے جا کر آرام سے رکھیں گے، اور جس طرح اپنے بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طریقہ سے آپ کی بھی حفاظت کریں گے، اور جو مہاجرین جائیں گے، ان کی جانی و مالی خدمت سے دریغ نہیں کریں گے۔

تیسری "بیعت علی الجہاد" ہے۔ مختلف مواقع پر جب غزوات اور جہاد کی ضرورت پیش آتی تھی تو حضور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لیا کرتے تھے، کہ ہم مر جائیں گے مگر راہ فرار اختیار نہیں کریں گے۔

چوتھی "بیعت علی الخلافت" ہے۔ جو حضور سید الاولین والآخرین رحمۃ اللعالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم یعنی سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سیدنا حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سیدنا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ، کے مبارک ہاتھوں پر بیعتیں کی گئیں۔ اور اسی طرح دوسرے حق پرست خلفاء کے ہاتھوں پر بھی بیعتیں ہوتی رہیں۔

پانچویں "بیعت علی الخیر" ہے۔ مسلم شریف میں حدیث مبارک ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم نے فرمایا، نہ جہاد تھا، نہ ہجرت تھی نہ اسلام میں داخلی تھی لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بیعت لی اور ارشاد فرمایا، "کہو ہم خیر کے کام کریں گے۔"

مشائخ کرام میں جو بیعت رائج ہے وہ یہی "بیعت علی الخیر" ہے بیعت ایک معاہدہ ہے بندہ اور خدائے تعالیٰ کے درمیان ۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ حضرات صوفیہ "بیعت علی الخیر" لے کر اپنے متوسلین کو انھیں

اوراد و وظائف کی تلقین فرماتے ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات پر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو تلقین فرمائے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔" [۱]

اپنی اس کتاب میں حضرت مولاناؒ نے گاہ بگاہ متقدمین مشائخ کے کلام کو بطور سند پیش کیا ہے۔ سلوک اور اس کی اہمیت نیز سیر و سلوک کی قسموں پر بحث کرتے ہوئے حضرت امام ربانی مجدد الفِ ثانی کی تحریر بطور تائید پیش کی ہے:

"۔۔۔۔۔۔ اور سیر آفاقی کے تمام ہونے کے بعد سیر انفسی میں جس سے مراد سفر در وطن ہے، آرام دیتے ہیں۔

هَنِيْئًا لِّاَرْبَابِ النَّعِيْمِ نَعِيْمُهَا

اس دولت عظمیٰ تک پہنچنا سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے وابستہ ہے۔ جب تک اپنے آپ کو پورے طور پر شریعت میں گم نہ کر دیں، اور اوامر کے بجالانے اور نواہی کے رک جانے سے آراستہ نہ ہو جائیں، اس دولت کی بو جان و دماغ میں نہیں پہنچتی۔ باوجود شریعت کی مخالفت کے اگرچہ بال برابر ہی ہو، اگر بالفرض احوال و مواجید حاصل ہو جائیں وہ سب استدراج میں داخل ہیں، آخر اس کو رسوا و خوار کریں گے۔

محبوب رب العالمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تابعداری کے بغیر خلاصی ممکن نہیں۔" (مکتوب نمبر ۸۷، دفتر اول حصہ اول)" [۲]

---

[۱] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، فیوضات وزیریہ، رامپور، ص ۲۹، ۱۰۰، ۱۰۱

[۲] مولانا وجیہہ الدین احمد خاں، ایضاً، ص ۱۱۸، ۱۱۹

مولانا نے تصوف کے دقیق مسائل کو بھی بڑے سہل انداز میں بیان فرمایا ہے
س سے ایک عام فہم مسلمان بھی استفادہ کر سکتا ہے۔ لطائف کی تشریح کرتے
ئے تحریر فرماتے ہیں:

"لطائف خمسہ کی اصلاح کے لیے حضرات نقشبندیہ تدریجی طور پر ہر ایک لطیفہ کا ذکر اور اس کی اصلاح کراتے ہیں۔

غوث زماں قطب عالم مروج شریعت مصطفےٰ قیم طریقہ، مجتبےٰ سلطان الاولیاء، قطب ارشاد حضرت حافظ شاہ جمال اللہ قدس سرہٗ الاقدس کے یہاں لطیفہ قلب کی اصلاح کے ساتھ ساتھ باقی تمام لطائف کی اصلاح ہو جاتی ہے، اور یہی حدیث شریف کے مطابق ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

اِنّ فی الجسد لمضغۃً اذا صلحت صلح الجسد کلّہ واذا فسدت فسد الجسد کلّہ الا وھی القلب"

فرمان گرامی کا مطلب یہ ہے کہ: جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے تو پورا جسم درست ہو جائے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جائے، آگاہ ہو جاؤ وہ دل ہے" ...." [1]

موضوع سماع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسی شخص کا اشعار سننا جس سے ذوق و شوق میں اضافہ ہو سماع کہلاتا ہے۔ اشعار پڑھنے کے طریقے کبھی متعدد ہوتے ہیں، اور کبھی ایک کبھی یہ پڑھنے والے مزامیر کا استعمال کرتے ہیں اور کبھی بلا مزامیر۔

---

[1] ایضاً، ص ۱۲۳

عام طور پر متعدد افراد مع مزامیر یہ کام کرتے ہیں (اور) اسی کو سماع اور قوالی کہتے ہیں۔ ایک شخص اچھی آواز اور اچھے ترنم سے اشعار پڑھے اور وہ پوری طرح باشرع ہو، اشعار بھی لغو اور بیہودہ نہ ہوں، نیز اس کے ساتھ مزامیر بھی نہ ہوں تو اس میں کسی کے نزدیک کوئی حرج نہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اشعار مسجد میں پڑھوائے ہیں، بلکہ ان کے لیے منبر بھی بچھوایا ہے، خود بھی حضورؐ نے سنے ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بھی سنوائے ہیں۔ حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اشعار میں ثنائے باری تعالیٰ، نعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، تعریف اسلام اور مدح قرآن ہوتی تھی ....

....

....

ہاں ایک یا چند افراد مزامیر کے ساتھ اشعار پڑھیں تو جمہور علمائے کرامؒ کے نزدیک یہ ممنوع ہے ....

....

حنفیہ کا منصب ہے کہ وہ جمہور احنافؒ کا قول دیکھیں۔ جمہور احنافؒ نے مزامیر کے ساتھ اشعار پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

حضرات صوفیہ کرام میں بھی اختلاف ہے۔ حضرات چشتیہ اس کے جواز کی طرف عموماً رجحان رکھتے ہیں، لیکن جواز کے لیے جو شرائط مشائخ چشت کی کتابوں میں مذکور ہیں وہ اس زمانے میں عموماً مفقود ہیں۔

اس لیے تصوف اور چشتیت کی آڑ پکڑ کر قوالی کے نام کے ساتھ گانا سننا مزامیر کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں۔۔۔۔۔۔" [1]

"وحدۃ الوجود" اور "وحدۃ الشہود" تصوف کے دقیق ترین مسائل میں سے ہیں۔ عوام تو عوام بعض علماء کی بھی رسائی ان تک نہیں ہو پاتی۔ اس لیے اکابر صوفیا کا مسلک یہ ہے کہ ان مسائل کی تفصیلات میں عقل نہیں لڑائی جائے بلکہ سالک اگر کسی واصل باللہ شیخ کی رہنمائی میں سلوک طے کر رہا ہے تو اس حال پر پہنچنے پر اس کو خود بخود اس کی حقیقت کھل جائے گی۔ حضرت مولانا وجیہ الدین احمد خاں صاحب رح بھی اسی مسلک پر تھے۔ چنانچہ "وحدۃ الوجود" اور "وحدۃ الشہود" کا مختصر تعارفی مسطور تحریر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ہم لوگ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے مبارک سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی آخری تحقیق اس مسئلہ میں یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ اور اس کی مخلوق میں تباین ہے۔ بندہ خدا رسیدہ ہو سکتا ہے، حقیقۃً خدا نہیں ہو سکتا اور یہی قول جمہور حضرات علمائے کرام کا بھی ہے۔ عام طور پر حضراتِ علمائے کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ بندہ نہ ذاتِ خداوند قدوس کے ساتھ متحد ہے، اور نہ اس کا وجود اللہ تعالیٰ کے وجود سے متحد ہے، بلکہ اس کی حقیقت اور وجود اللہ تعالیٰ کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے حضرات مرشدین طریقہ عالیہ رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ جب کسی پر حال طاری ہوگا تو وہ خود سمجھ لے گا اور حال طاری نہ ہو تو بندہ کو

---

[1] ایضاً، ص ۱۳۰ تا ۱۳۲۔

ہمیشہ یہی اقرار کرنا چاہیئے کہ میں بندہ عاجز ہوں اور اللہ تعالیٰ قادر مطلق۔ میں جاہل ہوں اور اللہ تعالیٰ عَالِمُ الغیب وَالشہادۃ میں فانی ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا میری ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ اللہ تعالیٰ کی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا۔ اللہ تعالیٰ ازلی ہے اور ابدی کیسی چیز میں کسی وقت بھی کسی کا اللہ تعالیٰ محتاج نہیں۔ اور ہم بندگان قدم قدم پر ہر وقت اور ہر چیز میں اس کے محتاج ہیں۔

اور جو شخص عاجزی اور انکساری اختیار کرے گا اور تواضع سے کام لے گا تو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ وعم نوالہٗ اسے عروج اور بلندیاں مرحمت فرمائے گا۔ دنیا کی بلندیاں کسی شکل میں بھی ہوں، پانی کے بلبلے کی طرح ہیں ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

لہٰذا اہل سلسلہ اس مسئلہ میں جو کہ انتہائی دقیق و عمیق مسئلہ ہے، ہرگز نہ الجھیں اور نہ بحث و مباحثہ کریں۔ ورنہ ایمان کا خطرہ ہے[1]"۔

مولاناؒ نے اس کتاب میں تصوف اور صوفیا کے متعلق اکابر مشائخ کے اقوال اور خیالات نقل کیے ہیں بعد میں بطور محاکمہ اپنی رائے درج کرتے ہیں:

"ان الفاظ کی تشریح و توضیح میں تفاوت بظاہر معلوم ہوتا ہے، مگر یہ واضح رہے کہ مقصد و مدعا سب حضرات صوفیہ رحمۃ اللہ علیہم کا ایک ہی ہے۔ یعنی تصوف نام ہے، قولاً، فعلاً، حالاً ہر حال میں اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا، اور اسی پر ہمیشہ کاربند رہنے کا۔ جب حضرات

---

[1] ایضاً، ص ۱۳۴، ۱۳۵

صوفیہ بر حق رحمۃ اللہ علیہم کے نفوس مقدس و منور ہو جاتے ہیں، حجابات دور ہو جاتے ہیں اور ہر چیز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ اتباع کرنے لگتے ہیں تو ایسی حالت میں اللہ جل شانہ وعم نوالہٗ کا ان پر خاص کرم ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ.

(اے رسول) کہہ دیجیے کہ اگر خدا کو دوست رکھو گے، تو میری اتباع کرو، خدا تم سے محبت کرنے لگے گا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت حقیقت میں محبت الٰہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا صلہ ہی محبت خداوندی قرار دیا گیا ہے۔

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے:

فَاَوْفَرُ النَّاسِ حَظًّا مِّنْ مُتَابَعَةِ الرَّسُوْلِ اَوْفَرُهُمْ حَظًّا مِّنْ مَحَبَّةِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالصُّوْفِیَّةِ مِنْ بَیْنِ طَوَائِفِ الْاِسْلَامِ ظَفَرُوْا بِحُسْنِ الْمُتَابَعَةِ۔

ترجمہ: "پس جو شخص جتنا زائد متبع رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی قدر زائد وہ محبت الٰہی کا بھی حصہ دار ہے، اور تمام اسلامی گروہوں میں صوفیہ ہی نے سب سے زیادہ اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہے۔" (عوارف المعارف ص ۲۶)[1]

---

[1] ایضاً، ص ۱۵۰، ۱۵۱۔

اس طرح حضرت مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحبؒ نے اپنی کتاب "فیوضاتِ وزیریہ" میں اکابر مشائخ و صوفیاء کے طرز پر تصوف اور اس کے متعلقات کی وضاحت کی ہے اور اُسی تصوف کو راجح قرار دیا ہے جو شریعت کی پابندی کے ساتھ اور شریعت کے تحت ہو۔ غیر شرعی امور کو تصوف سے خارج قرار دیا ہے۔

حضرت مولاناؒ وجیہہ الدین احمد خاں صاحب نے زیادہ تصانیف نہیں چھوڑی ہیں کیونکہ انھوں نے اپنا وقت درس و تدریس اور وعظ و نصیحت میں زیادہ گزارا۔ اگر حضرت مولاناؒ تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ دیتے تو یقیناً اس دور کے ایک بڑے مصنف ہوتے۔ مندرجہ بالا سطور سے مولانا کی علمی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولاناؒ نے اس دور میں رامپور کے مسلمانوں کی بالخصوص اور عامۃ المسلمین کی بالعموم جس طرح خدمت کی اور دینی امور میں، رہنمائی کی وہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

علامہ ابن تیمیہؒ کے فقہی مناہج پر ایک نظر

ڈاکٹر ظفر الاسلام شعبۂ اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی، علی گڈھ

اسلام کے مفکرین اور مصلحین میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ (۲۶۶-۷۲۷ء)
کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کا شمار بجا طور پر ان ممتاز علماء و دانشوروں میں ہے،
جن کے افکار و خیالات نے پوری مسلم دنیا بالخصوص اہلِ دانش و بینش پر گہرے اثرات
مرتب کیے اور جن کی تالیفات و تصنیفات نے علمی دنیا میں تحقیق و جستجو کی نئی راہیں
ہموار کیں۔ علامہؒ کی شخصیت انتہائی جامع و ہمہ گیر تھی اور ان کی علمی خدمات،
فکری دینی اور مصلحانہ مساعی زندگی کی گوناگوں جہات میں جاری ہوئیں۔ تفسیر و
حدیث، فقہ و علم کلام، سماجیات و سیاسیات یہ تمام علوم ان کے مباحث کا
موضوع بنے اور اس سے اہم یہ کہ انھوں نے ہر ایک میدان میں سوچنے و سمجھنے اور
غور و فکر کرنے کا ایک نیا رُخ دیا۔ اُن کے تمام مباحث میں خواہ وہ علم کی کسی شاخ
سے متعلق ہوں اگر کوئی بنیادی نکتہ یا مرکزی خیال ملتا ہے تو وہ قرآن و سنت
سے رہنمائی کی طلب اور سلفِ صالحین کے طریقہ کی اتباع ہے۔ اسی بنیادی فکر
کی روشنی میں انھوں نے مختلف علوم و فنون بالخصوص اسلام کے اساسی علوم (تفسیر
و حدیث و فقہ) کی توسیع و ترقی کے اصول متعین کیے اور ساتھ ہی ساتھ قرآن و سنت
کی رہنمائی میں علوم اسلامیہ کی تطہیر کی کوشش کی۔ فقہ اسلامی کی تجدید و ترقی کے لیے

لے یہ مضمون شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر جامعہ سلفیہ، بنارس کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار (۲۲ر
۲۴ر نومبر ۱۹۸۷ء) میں پیش کیا گیا تھا کچھ حذف و اضافہ کے ساتھ یہاں دیا جا رہا ہے۔

انھوں نے جو فکری وعملی بنیادیں فراہم کیں وہ اس کوشش کا ایک حصہ تھا۔

علامہ ابن تیمیہ کے یہاں فقہ اسلامی کی توسیع وترقی کے جو اصول ومناہج ملتے ہیں ان میں اجتہادی فکر کی آبیاری، دلیل وحجت کی پابندی مسلکی وسعت پسندی اور فقہی موشگافیوں کے ذریعہ حیلہ جوئی وحیلہ تراشی کا سدباب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ابن تیمیہ کے خیال میں فقہ اسلامی کے ارتقاء میں جو چیز سب سے زیادہ موثر ثابت ہوئی ہے اور ہوسکتی ہے وہ اجتہادی فکر ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی نگارشات میں مختلف انداز میں اسے زندہ کرنے اور پروان چڑھانے پر زور دیا اور یہ حقیقت ذہن نشین کرائی کہ مسلکی شدت پسندی اور تقلید شخصی کی تنگنائیوں سے نکل کر اجتہاد کی شاہراہ پر چل کر ہی فقہ اسلامی کو ترقی سے ہمکنار کیا جاسکتا ہے۔ ان کے خیال میں اس کے لیے ضروری ہے کہ مسائل کے استنباط میں براہ راست کتاب وسنت سے رجوع کیا جائے اور آثار صحابہ وتابعین سے استفادہ کیا جائے۔ علامہ ابن تیمیہ نے یہ آواز اس وقت بلند کی یا اس کی جانب علماء وفقہاء کی توجہ اس دور میں مبذول کرائی جب فقہ کے میدان میں تقلید شخصی کا عام رواج تھا اور مسلکی عصبیت کا یہ عالم تھا کہ ہر فقیہ ومفتی اپنے امام کے مسلک یا اس کے نقطۂ نظر پر عمل آوری اپنے لیے لازم تصور کرتا تھا اور کسی بھی صورت میں اس کی خلاف ورزی گوارا نہیں کرتا تھا۔ اسی وجہ سے فقہاء کے یہاں عام دستور یہ تھا کہ پیش آمدہ مسائل کے استنباط میں براہ راست نصوص شرعیہ سے استدلال کرنے کے بجائے وہ فقہی کتابوں کو بنیاد بناتے تھے یا محض اپنے پیش رو فقہاء کی رائیں نقل کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔ اس کے برخلاف ابن تیمیہ نے استنباط مسائل کا جو طریقہ اختیار کیا اور رائج کیا وہ یہ تھا کہ پیش آمدہ مسئلہ میں شرعی نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لیے وہ پہلے کتاب اللہ وسنت رسول میں غور کرتے اور پھر متعلقہ مسئلہ کی بابت صحابہ وتابعین کے آثار (اگر دستیاب

ہوتے) نقل کرتے اور آخر میں اس ضمن میں ائمہ فقہ کی رایوں کو بھی پیش کرتے کسی مسئلہ میں کتاب وسنت سے صراحت نہ ملنے کی صورت میں اگر صحابہ وتابعین کے آثار واقوال یا فقہا کی آرار میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کا سوال آتا تو وہ لازمی طور پر اسی رائے کو قبول کرتے جو ان کی نظر میں قرآن وحدیث سے زیادہ قریب معلوم ہوتی خواہ وہ ان کے فقہی اسکول کے مسلک کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ نئے مسائل میں اظہار خیال کرتے وقت بھی وہ اسی طرز استدلال کو اختیار کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس زمانہ کے فقہار کے یہاں مسائل کی تشریح وتوضیح یا تفریع میں قرآن وسنت کا حوالہ نہیں ملتا۔ یقیناً نصوص شرعیہ سے استشہاد ان کے یہاں بھی پایا جاتا ہے لیکن ضمناً یا بالواسطہ وہ براہ راست ان نصوص سے استفادہ کرنے کے بجائے اپنے امام یا اپنے مسلک کے دیگر فقہار مجتہدین کے مباحث اور دلائل پیش کرتے تھے اور ان میں نصوص کی نقل پر اکتفا کرتے تھے جو ان ائمہ کی کتابوں میں مذکور ہوتے تھے جبکہ ابن تیمیہ نے فقہی مسائل پر قرآن وسنت کی روشنی میں نئے سرے سے غور کرنے کی دعوت دی اور خود بھی اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔ علامہ ابن تیمیہ کے فقہی منہاج میں نصوص شرعیہ کو جو اولیت واہمیت حاصل تھی اس کا مزید ثبوت ان کے اس موقف سے ملتا ہے کہ اگر کوئی فقیہ یا عالم کسی معاملہ میں اپنی فقہی بصیرت کی وجہ سے اپنے امام کے برخلاف کسی دوسرے امام کی رائے کو معمول بہ سمجھتا ہے اور اسے اختیار کرتا ہے اور ایسا نص سے کسی دلیل کے فراہم ہو جانے کی وجہ سے ہو تو گویا وہ اپنے ہی امام کے منشار کو پورا کر رہا ہے اس لیے کہ ائمہ فقہ میں سے ہر ایک کا یہی قول تھا کہ جب کسی مسئلہ میں نصوص سے کوئی وضاحت مل جائے تو اس کے قول کو اگر وہ نص سے معارض ہو ترک کر دیا جائے۔[۲]

یہی وجہ ہے کہ ابن تیمیہ فقہ اور دوسرے معاملات میں اشخاص ورجال کی پیروی

اپنے اوپر لازم نہیں کرتے تھے بلکہ قرآن وسنت اور آثار صحابہ کو اپنا مقتدی تسلیم کرتے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی تعلیم و تربیت حنبلی خاندان میں ہوئی تھی اور وہ مسلکاً حنبلی فقہ کے پیرو تھے لیکن دوسرے مذاہب پر اسے ترجیح دینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اسے نص سے قریب تر سمجھتے تھے جیسا کہ انھوں نے مجموعہ فتاویٰ میں اس کی وضاحت کی ہے[۳۳]

علامہ ابن تیمیہ کا دوسرا فقہی منہج جس کی وجہ سے فقہ اسلامی کو نئی آب و تاب ملی اور اس کی بنیادیں مضبوط ہوئیں وہ دلیل وحجت کا التزام تھا۔ ان کے فقہی مباحث کو موٹے طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک وہ جس میں وہ حنبلی مسلک کی مکمل اتباع کرتے ہیں۔ دوسرا وہ حصہ جس میں وہ دیگر مذاہب میں سے کسی ایک امام یا فقیہ کے قول کو اختیار کرتے ہیں۔ تیسرا وہ حصہ جس میں ان کی اپنی منفرد رائے ہوتی ہے۔ ان تمام مباحث میں اگر کوئی چیز مشترک نظر آتی ہے تو وہ دلیل وحجت کی پابندی ہے وہ بغیر دلیل کے نہ تو کسی سے اتفاق کرتے ہیں اور نہ اختلاف۔ انھوں نے جملہ فقہی مذاہب کی تفصیلات کا بغور مطالعہ کیا تھا اور ان سب کے طریق استنباط طرز استدلال اور امتیازی خصوصیات پر گہری نظر ڈالی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف مسائل میں ان مذاہب کے جداگانہ نقطہ نظر اور ان کے دلائل کی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھے اور اس طرح اختلاف کی صورت میں راجح ورجوع کے امتیاز میں انھیں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ کسی بھی مسئلہ میں کسی موقف کے ترک واختیار میں دلیل وحجت کی پابندی کو وہ اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ حنبلی فقہاء کے نقطۂ نظر کو بھی بغیر دلیل کے قبول نہیں کرتے تھے جن مسائل میں انھوں نے حنبلی مسلک سے اختلاف کیا ہے اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ وہ ان مسائل میں حنبلی فقہاء کے دلائل سے مطمئن نہ ہوسکے اس لیے وہ

پنے آپ کو ان سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابن تیمیہ شخصی تقلید
کے مخالف ہوتے ہوئے ہر اس شخص کی اتباع کے لیے تیار رہتے تھے جس نے اپنی
رائے کی تائید میں قوی تر دلیل پیش کی ہو کیے اس ضمن میں وہ حنبلی و غیر حنبلی فقہاء
میں کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے۔ درحقیقت وہ فقہ کے میدان میں رجال کی پیروی
سے زیادہ دلائل کی نوعیت پر نظر رکھتے تھے اور اسی اعتبار سے اپنا موقف اختیار
کرتے تھے۔ مسائل کے استنباط میں انھوں نے اپنے اوپر جو کچھ پابندی عاید کی تھی
وہ دلیل کی تھی ان کے پیش نظر ہمیشہ یہ اصول رہا کہ اس کا سر رشتہ نہ چھوٹنے
پائے۔ ابن تیمیہ کے اس منہج کو اختیار کرنے سے نہ صرف فقہ اسلامی کی بنیادیں
مزید مستحکم ہوتی ہیں بلکہ اس سے وسعت نظر بھی پیدا ہوتی ہے۔

ابن تیمیہ کے فقہی اصول و مناہج کا تیسرا اہم پہلو توسیع پسندی اور تعصب و
تنگ نظری سے دوری ہے۔ انھوں نے مسلکی شدّت پسندی کے خلاف سخت
جدوجہد کی اور مختلف پیرایہ میں اس نکتہ پر زور دیا کہ تمام ائمہ فقہ قابل عزت و
احترام ہیں اور ان میں سے کسی کی تنقیص یا مخالفت صحیح نہیں ہے۔ انھوں نے فقہاء
کے اس عام انداز فکر پر بھی ضرب کاری لگائی کہ حق یا صواب صرف انھیں کے مسلک
کے ساتھ مخصوص ہے۔ فقہ حنبلی سے منسلک ہونے کے باوجود انھوں نے دوسرے
مذاہب فقہ کے دروازے اپنے اوپر بند نہیں کیے۔ ان تمام کے فقہی لٹریچر کا نہ صرف
مطالعہ کیا بلکہ ان سے فائدہ بھی اٹھایا۔ اس میں شبہ کہ انھوں نے بیشتر مسائل میں
غیر حنبلی فقہاء سے اختلاف کیا ہے لیکن ان میں سے کسی کو ہدفِ ملامت و تنقید نہیں
بنایا۔ ان کی وسیع المشربی کا یہ عالم تھا کہ وہ ائمہ فقہ میں سے ہر ایک کو حق کا متلاشی
اور فقہی میدان کا مجاہد تصور کرتے تھے اور ان کی فروگذاشتوں و لغزشوں کو علم و
نیت پر محمول کرنے کے بجائے مجتہدانہ عمل سے تعبیر کرتے تھے۔ وہ یقیناً مذہب حنبلی کو

دوسرے مذاہب پر ترجیح دیتے تھے لیکن ایسا کسی مسلکی تعصب کی بنیاد پر نہیں تھا
بلکہ اس رائے کی بنا پر کہ حنبلی مسلک میں نص سے زیادہ قربت اور سلف صالحین کے
طریقہ سے زیادہ مناسبت معلوم ہوتی ہے۔[۵۵] ان کی وسیع النظری اور متعصبانہ طر
عمل کی مخالفت اس سے بھی بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے خود ان ائمہ فقہ کی
جانب سے دفاع کیا جو مسائل کے استنباط میں حدیث سے بے توجہی کے لیے
مورد الزام ٹھہرائے جا رہے تھے۔ انھوں نے ان ائمہ فقہ کے اقوال کے حوالہ سے
ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان میں سے ہر ایک نے نص کے تقابل اپنے قول کو ترک
کر دینے کی تلقین کی۔[۵۶] انھوں نے اس ضمن میں یہ مزید وضاحت کی کہ اگر کسی امام کا قو
حدیث سے معارض معلوم ہو تو اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں یا تو اس امام ک
متعلقہ حدیث کا علم نہ تھا یا اس کی صحت پر یقین نہ تھا یا علم کے باوجود اس نے ا
فتویٰ پر اس حدیث کو منطبق نہ سمجھا ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے نزدیک وہ حدی
منسوخ ہو چکی ہو۔[۵۷] خاص طور سے انہی نکات کی وضاحت اور ائمہ فقہ کی جان
سے مدافعت کے لیے ابن تیمیہ نے ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا جو "رفع الملام ع
الائمۃ الاعلام" کے نام سے معروف ہوا۔ اہم بات یہ ہے کہ ابن تیمیہ نے ان خی
و نگارشات کو اس زمانہ میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جب مختلف فقہی مذاہب
ترجمان اپنے اپنے مسلک کے احاطہ میں محدود و مقید تھے اور دیگر مذاہب فق
سے استفادہ اور ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی جانب وہ کم توجہ دیتے تھے۔
تیمیہ کا یہ منہج یقینی طور پر فقہ کے میدان میں وسعت نظر اور کشادہ قلبی پیدا کر
میں ممد و معاون ثابت ہوا اور ساتھ ہی ساتھ اس طرز فکر سے مختلف مذاہب
فقہ کے تقابلی مطالعہ کو فروغ ملا۔ بلا شبہ آج بھی مسلکی شدت پسندی کے اس
میں اس طرزِ فکر کو اپنا کر فقہی تعصب و تنگ نظری کی فضا کو دور کیا جا سکتا ہے۔

مختلف فیہ مسائل میں اختلاف کی شدّت کو کم کیا جاسکتا ہے۔

علامہ ابن تیمیہ کے فقہی اصولوں میں وسعتِ نظر اور مسلکی رواداری کو جو اہمیت و وقعت حاصل تھی اس کی مزید وضاحت اس سے ہوتی ہے کہ وہ استنباطِ مسائل کی صلاحیت رکھنے والوں کے لیے یہ ضروری تصور کرتے تھے کہ جب کسی مسئلہ میں کوئی ایسی رائے ان کے سامنے آئے جو نصوص سے زیادہ قریب معلوم ہو تو وہ اپنی سابق رائے میں تبدیلی پیدا کرلیں خواہ یہ تبدیلی ان کے اپنے امام کے موقف کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ ابن تیمیہ کے خیال میں قوی شہادت کی روشنی میں رائے یا موقف کی تبدیلی تذبذب یا غیر استقلالیت کی علامت نہیں بلکہ علم ویقین کی راہ میں سرگرداں رہنے کا ایک مظہر ہے[۸]۔ انھوں نے اپنے اس خیال کی تائید میں قولِ رسول ؐ کی اہمیت وعظمت کو واضح کیا اور فقیہانِ امت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ قولِ رسول ؐ کے بالمقابل کسی بھی امام یا فقیہ کے قول کو ترک کیا جاسکتا ہے[۹]۔ ابن تیمیہ نے نہ صرف یہ کہ اس احوال کی تبلیغ کی بلکہ اسے عملی طور پر بھی برتا۔ حنبلی مسلک کے پیرو ہونے کے باوجود انھوں نے ہمیشہ و ہر حال میں اپنے آپ کو امام احمد بن حنبل کا پابند نہیں گردانا بلکہ بعض مسائل میں ان سے اختلاف بھی کیا اور اس اختلاف کی بنیاد یہی تھی کہ وہ ان مسائل میں دوسرے کسی امام کے قول یا اپنی منفرد رائے کو نص سے زیادہ قریب سمجھتے تھے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابن تیمیہ کے نزدیک ہر کس و ناکس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی ایک مسلک کی تقلید چھوڑ کر مختلف مسائل میں مختلف مذاہبِ فقہ کے نقطہ نظر اختیار کرتا رہے۔ وہ فقہی مسائل میں موقف یا مسلک کی تبدیلی صرف انھیں لوگوں کے لیے رَوا تصور کرتے تھے جو استنباطِ مسائل کی صلاحیت رکھتے ہوں، مختلف اقوال میں موازنہ کرسکتے ہوں اور راجح ومرجوح میں امتیاز کے اہل ہوں۔ وہ اس طرز عمل کے سخت مخالف تھے کہ محض سہل پسندی کے نقطۂ نظر سے یا ذاتی فائدہ کی خاطر

ایک مسلک کو چھوڑ کر دوسرا اختیار کیا جائے۔ مثلاً کوئی حق شفعہ کے حصول کے لیے امام ابوحنیفہ رض کے مسلک پر عمل پیرا ہو لیکن جب خود اس کا پڑوسی اس سے حق شفعہ کا طالب ہو تو وہ کہے کہ یہ نص سے ثابت نہیں ہے[۱] ابن تیمیہ کی نظر میں فقہی مسلک کی وہ تبدیلی انتہائی مذموم و سخت ناپسندیدہ ہے جو شریعت کو کھیل بنا دینے کے مترادف ہو یا جس سے شرعی مدد و قیود کی عدم اہمیت ظاہر ہو۔

جہاں تک فقہ اسلامی کی تطہیر و تنقیح کا تعلق ہے ابن تیمیہ نے اس ضمن میں تشریع اسلامی کی غرض و غایت سمجھنے پر زور دیا اور یہ حقیقت بے نقاب کی کہ علم فقہ سے مقصود محض ضابطہ بندی یا قانونی خانہ پری کی سہولت بہم پہونچانا نہیں بلکہ شریعت مطہرہ کے اصل منشا کی سمجھ پیدا کرنا اور اس کی تکمیل کے لیے قانونی رہنمائی فراہم کرنا ہے اسی لیے انھوں نے ان حیلوں کے خاتمہ کے لیے زبردست جد و جہد کی جن سے مقصود شریعت کی پابندیوں سے بچنا اور اس کی مقرر کردہ حدود و قیود سے پہلو تہی کرنا تھا تاکہ کوئی آسانی یا فائدہ حاصل ہو سکے۔ ابن تیمیہ نے ان فقہی حیلوں کو شریعت کے منشا کے خلاف قرار دیا اور یہ واضح کیا کہ شریعت کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی سے مطلوب ایک ایسی زندگی کی تعمیر ہے جو قرآن و سنت کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی ہو اور ایک ایسے معاشرہ کو پروان چڑھانا ہے جہاں حق و عدل کا بول و بالا ہو۔ لیکن اگر فقہی موشگافیوں کے ذریعہ ایسی تدبیریں یا صورتیں ایجاد میں لائی جائیں جن کی وجہ سے کسی شرعی حکم کی تعمیل سے بچا جا سکے یا جو شریعت کی کسی پابندی کو توڑ کر منہی عنہ تک پہونچانے والی ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ اس سے شرعی حکم کا تقدس بھی مجروح ہوا اور وہ منشا بھی پورا نہیں ہوا جو اس حکم شریعت میں مضمر تھا۔ مثال کے طور پر حکم زکوٰۃ سے مقصود محض کسی ظاہری رسم کی ادائیگی نہیں بلکہ نادار و فقراء، مساکین و بے سہارا لوگوں کی اعانت و حاجت روائی ہے اگر کوئی شخص

شخص اپنے اوپر سے اس حکم کو ساقط کرنے کے لیے یہ حیلہ اختیار کرے کہ سال کے اختتام یا حولان حول سے پہلے اپنے مال کو کسی کے نام ہبہ کر دیا کرے تو ایسی صورت میں حکم زکوٰۃ کی تشریع کا مقصد کہاں پورا ہوا۔ علامہ ابن تیمیہ نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنے فقہی مباحث کے ذریعہ حیلہ سازی کی اس ذہنیت پر ضرب کاری لگائی ہے۔ اسی موضوع سے متعلق انھوں نے "اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل" کے نام سے ایک رسالہ بھی تحریر کیا جو ان کے مجموعہ فتاویٰ کی چوتھی جلد کا ایک حصہ ہے۔ اگرچہ اس رسالہ سے اصل مقصود اس حیلہ کا بطلان ہے جو طلاق ثلاثہ کے بعد مطلقہ کو دوبارہ عقد زوجیت میں لانے کے لیے اختیار کیا جاتا تھا لیکن انھوں نے اسی کے ذریعہ دوسرے بہت سے حیلوں کے تئیں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی جو اس وقت متعدد فقہی کتابوں کا حصہ بن چکے تھے اور عوام میں رائج تھے۔ ابن تیمیہ نے ان تمام فقہی حیلوں کو اس دلیل کے تحت بھی رد کیا ہے کہ اسلام نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان کے ذرائع کو بھی ممنوع گردانا ہے تاکہ محرکات کا سد باب ہو سکے اس ضمن میں انھوں نے اس حقیقت کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ اسلام میں مقصد کی بلندی و بہتری اور اس کے ذرائع حصول کی پاکیزگی دونوں ہی مطلوب ہے اس لیے اگر کسی فعل کا مقصد حرام چیز کا حصول ہو تو اس کے لیے ظاہری صورت خواہ کیسی ہی اختیار کی جائے اس پر فیصلہ نیت ہی کے اعتبار سے ہوگا۔[۱۱]

ان نکات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ ابن تیمیہ نے دیگر علوم کے ساتھ فقہ کی تطہیر کے اصول بھی واضح کیے اور اس علم کو اس نہج پر ترقی دینے کی کوشش کی کہ یہ شریعت اسلامی کی حقیقی غرض و غایت کی تکمیل میں ممد و معاون ثابت ہو سکے اور قرآن و سنت کے مقتضیات کا ترجمان بن سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی انداز فکر کی روشنی میں فقہ کے قدیم ماخذ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر فقہ اسلامی کے میدان میں

کوئی اصلاحی یا تجدیدی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی۔

علامہ ابن تیمیہ کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی تجدید و ترقی کے لیے انھوں نے نہ صرف اصول و مناہج کی وضاحت کی بلکہ اپنے فتووں اور فقہی تالیفات کے ذریعہ انھیں عملی صورت میں بھی پیش کیا اور علمی انداز میں انسانی زندگی کے گوناگوں مسائل پر فقہی نقطہ نظر سے اظہار خیال کیا۔ فتاویٰ کی مبسوط جلدوں اور مختلف رسائل میں جن مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں عقاید و عبادات کے علاوہ معاشرتی و معاشی زندگی کے بہت سے پہلو شامل ہیں۔ ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ ابن تیمیہ نے فقہ اسلامی کو معاشرتی و سماجی زندگی سے مربوط کرنے کی کوشش کی اور عصری مسائل کی فقہی تشریح و توضیح میں مجتہدانہ بصیرت سے کام لیا۔[12]

آخر میں یہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ ابن تیمیہ کے فقہی اصول و مناہج کی اہمیت و معنویت آج بھی اپنی جگہ پر قایم ہے۔ ان کی روشنی میں نہ صرف معاشرت و معیشت سے متعلق بہت سے عصری مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے بلکہ ان کی مدد سے عہد حاضر میں فقہ اسلامی کو جمود کی راہ سے ہٹا کر مجتہدانہ فکر کا عکاس بنایا جا سکتا ہے۔ آج مسلم معاشرہ کو متعدد ایسے مسائل درپیش ہیں جن کے بارے میں عوام علماء وقت کی اجتہادی کوششوں اور اجتماعی رایوں کے طالب ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام کی یہ طلب اجتہادی فکر کو زندہ کیے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح فقہی مسائل میں مختلف مکتبہ ہائے فکر کے اختلافات کی شدت میں تخفیف لانا بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ اس کے لیے بھی ابن تیمیہ کے مذکورہ اصول بہترین مشعل راہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ میری اپنی ناقص رائے میں فقہ اسلامی کے میدان میں اجتہادی کوششوں کا سلسلہ کسی بھی دور میں منقطع نہیں ہوا۔ یہ اور بات ہے

ان کوششوں کا دائرہ اور ان کا نہج ہمیشہ یکساں نہیں رہا بلکہ حالات کے تقاضے فقہا کی استعداد اور علمی سرگرمیوں کے اعتبار سے ان میں اختلاف رونما ہوتا رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نئے مسائل کے حل کے لیے آج بھی کسی نہ کسی حد تک انفرادی کوششیں جاری ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عام دلچسپی کے مسائل اور اجتماعی معاملات کے لیے یہ کوششیں بہت زیادہ کارگر ثابت نہیں ہورہی ہیں اور نہ ہی عوام کو پوری طرح مطمئن کر پارہی ہیں۔ اس لیے ان انفرادی کوششوں کو مزید موثر بنانے اور ان میں یگانگت وہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے علماء امت کی اجتماعی توجہ اور مشترکہ مساعی درکار ہیں۔ اس کے لیے ابن تیمیہ کے فقہی مناہج بلاشبہ رہنما اصول کا کام انجام دے سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اسلام کا نظام قانون جسے فقہ اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے ایک متحرک نظام ہے جو ہر زمانہ میں مختلف النوع مسائل کا حل فراہم کرتا رہا ہے یہ کوئی ساکن ومنجمد نظام قانون نہیں جو ایک بار مرتب ہوجانے کے بعد حالات کی تبدیلی اور نئے مسائل کے وقوع کی صورت میں توسیع وترقی اور وقت کے تقاضے کے مطابق نئی تشریح وترجمانی کی گنجائش نہ رکھتا ہو۔ آج بھی فقہ اسلامی کی اس روح کو تازگی بخشنے اور عصری مسائل کے حل میں اجتہادی فکر کو اجاگر کرنے کی اشد ضرورت ہے جس کا احساس ہر صاحب بصیرت وذی فہم کو ہے خدا کرے یہ احساس عملی اقدام کا قالب اختیار کرلے۔

(مراجع)

۱۔ ابن قیم، اعلام الموقعین، مطبعہ منیریہ، مصر، ۴/۲۲۵

۲۔ مجموعۃ فتاوی ابن تیمیہ، کردستان، مصر، ۱۳۲۶ھ، ۲/۳۸۴، اعلام الموقعین ۴/۲۰۷

۳۔ مجموعۃ فتاوی ابن تیمیہ، ۲/۱۹۹۔

(مراجع)

۴ مجموعۃ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/ ۳۸۴

۵ مجموعۃ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/ ۱۹۹

۶ مجموعۃ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/ ۳۸۴

۷ ابن تیمیہ، رفع الملام عن الائمۃ الاعلام، مکتبۃ القاہرہ (بدون تاریخ) ص۴

۸ مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/ ۳۷۸

۹ مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/ ۳۷۶-۳۷۷

۱۰ مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ، ۲/ ۲۰۰-۲۰۲

۱۱ فقہی حیلوں کے موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ابن تیمیہ کے مذکورہ رسالہ کے علاوہ ملاحظہ کریں اعلام الموقعین، ۳/ ۳۹۳-۳۹۵، تذکرہ ابوالکلام آزاد، نئی دلی، ۱۹۶۸ء ص ۸۵-۱۰۲

۱۲ اس مسئلہ پر تفصیل کے لیے دیکھیے محمد ابوزہرہ، ابن تیمیہ۔ حیاتہ، عصرہ و آراء ہ، اردو ترجمہ حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ از رئیس احمد جعفری مکتبہ سلفیہ لاہور، ۱۹۶۱ء ص ۵۳۹-۵۵۵، ۶۵۰-۶۶۶-

ابو حیان توحیدی

حیات و خدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

(۲)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شخصیت کے خدوخال التوحیدی نے ایک طویل عرصے تک اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا، زندگی کے آخری لمحات تک علم و ادب کی خدمت میں لگا رہا۔ وہ تمام ہی جسمانی عیوب و کمزوریوں سے پاک قدرے وجیہ شخصیت کا حامل ایک کامل انسان تھا۔ اس کے ارادوں میں جان نیتوں میں اخلاص، حوصلوں میں پختگی اور عزائم میں غیر معمولی بلندی تھی۔ وہ جس کام کو کر لینے کا ارادہ کر لیتا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر چھوڑتا۔ وہ اپنی لاغری و ناتوانی اور ضعف و کمزوری کے باوجود — صوفیہ کی ایک جماعت کے ساتھ عراق سے حجاز پیدل حج کے ارادہ سے نکلا۔ مقام "ادبہ" پہنچتے پہنچتے سارا کھانا ختم ہوگیا، چنانچہ فاقہ کے سبب ان کا برا حال تھا۔ لیکن اس بھوک کی کیفیت میں بھی ان لوگوں نے چار دنوں تک مسلسل سفر کیا یہاں تک کہ قادسیہ پہنچ کر ان کو کھانا نصیب ہوا۔ اس واقعے سے اس کی صبر و عزیمت اور قوت برداشت

کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔[۲۴]

جہاں تک آپ کی ظاہری شکل و صورت اور وضع قطع کا تعلق ہے تو آپ ایک صوفی صفت انسان تھے، چہرے کے اندر کوئی ایسی خوبصورتی و دلکشی نہ تھی کہ وہ لوگوں کی توجہ اور عنایتوں کا مرکز بن سکے۔ آپ کی ہر چیز میں سادگی، تواضع و انکساری کا عنصر نمایاں تھا۔ آپ کپڑے بھی نہایت معمولی اور بسا اوقات پیوند لگا ہوا استعمال کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ امراء و وزراء سے ملاقات کے وقت ان کو اپنی شخصیت سے مرعوب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ کے اوقات کا زیادہ تر حصہ صوفیاء کی مجلسوں میں گذرتا یا پھر حکماء و علماء کے ساتھ علمی مذاکروں میں صرف ہوتا۔

حرفت و پیشہ ابوحیان توحیدی ایک خوشخط کاتب اور کتابت کے مختلف فنون سے واقف تھے۔ فن خطاطی میں بھی مہارت تھی۔ ایک عرصہ تک ابوحیان بغداد میں کتابت کا کام کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بہت سارے قدیم رسالوں کی ازسرنو کتابت کی، ان رسائل کا شمار عربی زبان و ادب کے قدیم اور اہم ترین سرمایے میں ہوتا ہے۔ اس نے عربی خط کے اندر طرح طرح کی آرائش و زیبائش کے ذریعہ مزید حسن، خوبصورتی، کشش، جاذبیت اور زینت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ ابتدا میں کتابت ہی کے ذریعہ اپنی روزی کمایا کرتا تھا اور اسی فن کی بدولت وقت کے وزراء و حکام تک اس کی رسائی ممکن ہوئی آپ ان کے رسائل و خطوط کی عمدہ کتابت کرتے تھے جس کی آپ کو اچھی خاصی اجرت ملتی تھی۔ انھوں نے "زین بن رفاعہ" کے خطوط لکھے۔ وزیر ابن العارمی نے اس کے ذریعہ جاحظ کی کتاب "الحیوان" کی کتابت کروائی۔ لیکن ابوحیان

پنے کتابت کے پیشے سے مطمئن نہ تھا۔ وہ کسی ایسے کام کی تلاش میں تھا جس میں محنت کم ہو مگر فائدہ زیادہ ہو۔ چنانچہ اس نے کچھ دنوں تک دیوان البرید میں بھی کام کیا۔ بیزی، کاغذات اور دیگر اشیاء کی خرید و فروخت کی تجارت بھی شروع کی۔

اساتذہ

ابو حیان کی تعلیمی زندگی کا آغاز بغداد میں ہوا۔ انھوں نے اپنے دور کے جید، نامور اور ماہر فضلاء اور صاحبانِ کمال ادباء سے اکتسابِ علم کیا۔ ان میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں:

ابو سعید سیرافی

سیرافی ایک وسیع النظر عالم تھے، ان کو بیک وقت فلسفہ، ادب، تصوف، فقہ اور علم کلام میں کمال حاصل تھا، اس کے علم و معرفت کا چرچا پورے عالم اسلام میں تھا، وقت کے حکماء و فلاسفہ میں اس کا نمایاں مقام تھا، حکام و فرمانرواؤں کے نزدیک وہ ہر ممکن عزت و احترام کا مستحق تھا۔ یاقوت حموی اس کے بارے میں لکھتا ہے:

"اس نے پچاس سال تک جامع رصافہ بغداد کے مسند افتاء کو زینت بخشی اور ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق فتوے دیتا اور اس طویل عرصہ میں نہ تو اس کا کوئی فتویٰ غلط پایا گیا اور نہ ہی مسترد ہوا، نحو کے میدان میں بھی اچھی دسترس رکھتا تھا۔ زہد و تقویٰ میں بھی منفرد و ممتاز تھا۔ اس کے محبوب ترین شاگرد ابو حیان توحیدی کا بیان ہے: "وہ بڑے عابد و زاہد تھے، اس کا دن قرآن کی تلاوت اور خشوع و خضوع میں گذرتا، رات اوراد و وظائف میں بسر ہوتی۔ اس نے چالیس سال تک مسلسل پورے سال کا روزہ رکھا"۔[۲۴]

ابوسعید مدائنی کا بیان ہے کہ "سیرانی کی محفل میں جب حشر و نشر کا ذکر ہوتا تو میں نے دیکھا اس کے اوپر ایسی کیفیت طاری ہوتی کہ روتے روتے صبح کر دیتا۔"[۲۵] وہ علم نحو کا سب سے بڑا عالم تھا۔ اس نے سیبویہ کی "الکتاب" کی شرح لکھی۔ اس شرح میں نحو کے دقیق مسائل بڑے دلنشیں انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔[۲۶] ابو حیان نے فلسفہ، تصوف کے اسرار و رموز سے پوری واقفیت سیرانی سے حاصل کی۔ وہ اپنے استاد کو روئے زمین کا سب سے بڑا عالم بتاتا ہے۔[۲۷]

علی بن عیسیٰ الرمانی

ابوحیان توحیدی کی شخصیت کی تعمیر میں الرمانی کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ الرمانی معتزلی طریقہ فکر کا سب سے بڑا نمائندہ تھا۔ ابو توحیدی نے خاص طور سے علم کلام کی تعلیم حاصل کی۔ علم کلام کے ساتھ عربی زبان و ادب میں بھی وہ پوری مہارت رکھتا تھا، دیگر علوم و فنون کے علاوہ نحو اور منطق سے بھی خاص شغف تھا۔ نحو میں اس کا مرتبہ ابو علی و سیرافی سے کم نہیں۔ الرمانی کی علمی حیثیت کا اندازہ ابن خلکان کے اس بیان سے ہوتا ہے:

> "ایسا عالم سرزمین بغداد پھر پیدا نہ کر سکی جو بیک وقت فن نحو کا امام بھی تھا، علم کلام پر بھی عبور تھا، مخالفین اسلام کی کتابوں پر بھی اس کی نظر تھی، جو دقیق علمی مسئلوں کو حل کرنے میں غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ دینی بصیرت، عقیدے کی پختگی، فقہی تبحر اور عقیدے کی پاکیزگی بھی رکھتا تھا۔"[۲۸]

قاضی ابوحامد المروزی

ابوحامد کا شمار چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر علماء میں ہوتا ہے۔ ابوحیان توحیدی قاضی صاحب کے لائق شاگردوں میں تھے۔ اس کی کتاب

البصائر و الذخائر' زیادہ تر ابوحامد کے افادات پر مشتمل ہے۔ ابوحیان بذات خود اپنے استاد کا تعارف ان الفاظ میں کراتا:

"میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ وضع دار اور شریف آدمی نہیں دیکھا وہ علم و معرفت کے سمندر، سیرت و تاریخ میں ماہر اور معانی آفرینی میں کمال رکھتے تھے۔"

چوتھی صدی عیسوی کے شافعی فقہار میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ ابوتوحیدی نے فقہ شافعیہ کا درس انھیں سے حاصل کیا۔

ابوسلیمان محمد بن طاہر بن بہرام المنطقی السجستانی

ابوحیان توحیدی کے اساتذہ میں، ابوسعید کے بعد سجستانی کی شخصیت سب سے نمایاں ہے۔ آپ نے کسی بلند دنیوی منصب کو کبھی قبول نہیں کیا اور نہ ہی عیش و عشرت کی زندگی گزاری، ایک طویل عرصے تک سوکھی روٹی پر گذارا کیا۔ آپ اپنی صلاحیتوں اور قوتوں سے اتنا بھی نہ کما پاتے کہ مکان کا کرایہ ادا کرسکیں یا دو وقت کی روٹی کا انتظام۔ "حیوان الحکمۃ" ان کی مشہور تصنیف ہے۔ علم کلام و فلسفہ سے تعلق رکھنے والے باذوق طلبہ کی ایک جماعت آپ کی خدمت میں برابر حاضر رہتی۔ ابوحیان نے آپ سے علم فلسفہ و کلام کے علاوہ صبر و قناعت اور دعوت و عزیمت کا درس بھی لیا۔ توحیدی نے "المقابسات" میں سجستانی کے ملفوظات کا معتدبہ حصہ جمع کردیا ہے۔ سجستانی کی جانشینی کا شرف بھی توحیدی کو حاصل ہے۔

ان کے علاوہ قاضی ابوالفرج معانی بن زکریا الیزدانی اور ابوزکریا یحیی بن عدی

سے فلسفہ و منطق کے دقیق مسائل میں استفادہ کیا۔ اسی طرح ابوالحسن عامری سے فقہ و فلسفہ اور ابو نفیس سے ریاضی و علم ہیئت کی تعلیم حاصل کی۔ مختلف علوم و فنون میں اچھا ملکہ پیدا کر لیا یہاں تک کہ اپنے دور کے سب سے بڑے فلسفی سمجھے گئے۔[۲۹]

تلاشِ معاش

تعلیم سے فراغت کے بعد ابوحیان توحیدی نے تصنیف و تالیف کو اپنا مشغلہ اور امراء و حکام کی مدح و توصیف کو ذریعہ معاش بنالیا۔

مہلبی کے دربار میں

بنی بویہ کے وزراء میں مہلبی بڑا علم دوست وزیر تھا۔ اس کی کنیت ابومحمد اور نام حسن تھا۔ مشہور اموی جنرل مہلب بن ابی صفرہ کے خاندان سے تعلق ہونے کی وجہ سے مہلبی کے نام سے مشہور ہوا۔ مہلبی نے ادب کا بڑا ہی صاف ستھرا مذاق پایا تھا۔ یاقوت نے صابی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مہلبی کے دربار میں فن کاروں کی خصوصیت سے ادباء و شعراء کی بڑی قدر تھی۔[۳۰] اس نے اپنی چند سالہ وزارت ہی میں برامکہ کی یاد تازہ کردی تھی۔ اس کا عہد وزارت یادگار عہد تصور کیا جاتا ہے۔ علم کلام کی پرپیچ بحثوں اور فلسفیانہ موشگافیوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

ابوحیان توحیدی اس وقت کی علمی و ادبی دنیا میں اپنی تصنیفات و تالیفات کی بدولت مقبول ہو گیا۔ اس کا شمار عربی کے بلند پایہ ادیبوں میں ہونے لگا۔ ابوحیان کو توقع تھی کہ مہلبی کے دربار میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا لیکن علم و ادب کی بدقسمتی کو کیا کہیے کہ اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو پائی اور مہلبی کے دربار میں خلاف توقع اس کی وہ پذیرائی نہ ہو سکی جس کی اسے امید تھی۔ مہلبی اگرچہ ابوحیان کے علمی و دینی مرتبے سے بخوبی واقف تھا لیکن محض مذہبی و دینی تعصب کی بنا پر ابوحیان کو فوراً بغداد چھوڑ دینے کا حکم صادر کر دیا۔ امام شمس الدین ذہبی اس کی وجہ یہ بیان

کرتے ہیں کہ توحیدی کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ ملحد و زندیق ہے اس لئے مسلم معاشرے میں اس کا وجود مضر ہے[۱۳]۔ لیکن شاید اصل وجہ یہی کہ ابوحیان شعیت کا مخالف اور مہلبی اپنی شیعیت نوازی کی بنا پر بدنام تھا۔

ابن العمید کے حضور

مہلبی سے مایوس ہو کر ابوحیان نے کچھ دنوں تک گوشہ نشینی اختیار کرلی، ایک طویل عرصے تک گمنامی کی زندگی گذارتا رہا۔ اس زمانے میں وزیر ابن العمید کی ہر چہار جانب شہرت اور چرچا تھا۔ اس کا وجود سرزمین عجم کے لئے باعث فخر و ناز تھا۔ وہ عربی زبان کا اتنا بڑا صاحب طرز ادیب تھا کہ اس کا اسلوب نگارش بلاکسی رد و بدل کے دو سو سالوں تک باقی رہا۔ وہ فلسفہ و علم کلام سے متعلق مناظروں اور مجادلوں میں دلچسپی لیتا۔ عقیدہ و مذہب کے اعتبار سے وہ مذہب اعتزال کا پیرو تھا۔ اس کے ساتھ فنون لطیفہ، مصوری و موسیقی کا دلدادہ تھا اس لئے اس کا دربار برابر مختلف قسم کے اہل کمال اور اہل فن حضرات سے بھرا ہوا رہتا تھا۔ کتابوں سے تو جیسے اسے عشق تھا۔ مشہور زمانہ مورخ ابن مسکویہ اس کے عظیم الشان کتب خانے کا ناظم تھا۔ عجمی شان و شوکت، غیر عربی ثقافت و کلچر کا جو سماں اس کے دربار میں نظر آتا تھا اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ابوحیان توحیدی سفر کی کلفتوں و صعوبتوں اور راستے میں پیش آنے والی دشواریوں اور پریشانیوں کو برداشت کرتا ہوا ابن العمید کے پایۂ تخت "رے" پہنچا اور دربار تک رسائی حاصل کی لیکن بدقسمتی و محرومی نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ گو کہ اس کے جسم پر معمولی لباس تھا لیکن اسے اپنی غیرت و خودداری کا بہت خیال اور علمی تمکنت پر پورا اعتماد تھا۔ بھلا ابن العمید جیسے جلیل القدر وزیر اعظم کو اس کی کیا پرواہ چنانچہ اس نے ابوحیان کو دیکھتے ہی غرور سے اپنے کندھے کو جھٹک دیا اور

بڑی حقارت سے پیش آیا اور لائق اعتنا نہ سمجھا[۳۲] اور اس طرح ابوحیان کو یہاں سے بھی خائب و خاسر لوٹنا پڑا۔

صاحب ابن عباد کے در دولت پر

تاریخ اسلام میں جن وزراء کے کارنامے آب زر سے لکھنے کے لائق ہیں ان میں برامکہ کے بعد صاحب بن عباد اور نظام الملک طوسی کے نام سرفہرست نظر آتے ہیں۔ صاحب ابن عباد کے رعب و دبدبہ اور جاہ و جلال کا یہ عالم تھا کہ بعد از مرگ بھی لوگوں کے دلوں سے اس کی عظمت و ہیبت کا سکہ نہ نکلنے پایا۔ ابن خلکان کا بیان ہے:

"عام طور سے انسان کی اقبال مندی اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن صاحب ابن عباد کی عظمت و اقبال مندی اس کی موت کے بعد بھی قائم رہی، اس کے انتقال کی خبر ملتے ہی پایۂ تخت کے بازار بند ہو گئے سوگواروں کا مجمع اس کے محل کے دروازے پر جنازے کے انتظار میں جمع ہونے لگا۔ خود بادشاہ وقت اور تمام فوجی افسران ماتمی لباس میں محل کے باہر جنازے کے منتظر تھے۔ جیسے ہی جنازہ محل سے نکلا پوری فضا نالہ و شیون، آہ و بکا اور ماتم و گریہ زاری کے شور سے لرز اٹھی۔ جنازے کے احترام میں لوگ زمین بوس ہو گئے۔ اکثروں نے شدت غم سے اپنے کپڑے تار تار کر ڈالے، گریہ و زاری کا شور بڑھتا ہی گیا اور آخر اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ فخر الدولہ جنازے کے جلوس میں آگے آگے تھا اور کئی روز تک سوگ منایا گیا۔[۳۳]

صاحب ابن عباد ابتدا میں ابن العمید کے کاتب کی حیثیت سے منظر عام پر آیا، پھر رفتہ رفتہ موید الدولہ کا وزیر اعظم بن گیا، اور فخر الدولہ کے عہد میں صاحب ابن عباد

سلطنت کے سیاہ و سپید کا مالک بن گیا۔ اس نے معتزلہ کے وقار رفتہ کو از سر نو قائم کیا۔ حکومت کے سارے وسائل و ذرائع کو اعتدال کے نشأۃ ثانیہ کے لئے استعمال کیا۔ اس کے دربار میں جس قدر اہل کمال جمع ہوئے شاید ہی کسی دربار میں جمع ہوئے ہوں۔ ابو حیان توحیدی اگرچہ دو بار وزیروں کی بے توجہی اور عدم التفاتی کا مزہ چکھ چکا تھا، مگر صاحب ابن عباد کے اوصاف و محاسن سن کر اسے اس سے یک گونہ عقیدت ہوئی تمناؤں نے ایک بار پھر دل میں انگڑائی لی، امید کی ایک موہوم سی کرن بیدار ہوئی۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر اپنے بکھرے ہوئے حوصلوں، ٹوٹے ہوئے اور پریشان حال خواہشات جمع کیا اور رے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ تاکہ اس کے ندیم اور مصاحب کا مقام حاصل کرلے۔ لیکن وہ صاحب بن عباد کی نگاہ میں نہ بچ سکا۔ اس لئے یہاں بھی اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی قسمت اس سے روٹھ گئی ہو۔

اس طرح اس کو زندگی کے تلخ حقائق کا عملی تجربہ تھا۔ اس نے اپنی پوری زندگی فقر و فاقہ، محنت و مشقت اور کلفت و مصیبت میں گذار دی اور لاکھ کوششوں اور تدبیروں کے باوجود بھی کبھی اس کی آمدنی اتنی نہ ہو سکی کہ وہ خوشحال اور فارغ البال زندگی گذار سکے۔ یہ حسرت دل کی دل میں رہ گئی جب کہ اس سے کم تر درجے کے معاصر ادبا، و مصنفین کا حال یہ تھا کہ ان کے پاس زندگی کے عیش و عشرت اور آرام و تعیش کی جملہ سہولیات موجود تھیں۔ ان کے پاس قدر و منزلت، جاہ و رتبہ، دولت و ثروت اور اقتدار و حکومت سب کچھ تھا۔ اس کا تعلق بھی ابن عمید، ابن عباد، ابو اسحاق صابی، ابن سعدان، عبدالعزیز بن یوسف کے طبقے سے تھا۔ ان کی اکثریت وزارت کے عہدوں تک پہونچنے میں کامیاب ہو گئی۔ لیکن ابو حیان اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود دیوان انشا میں

سرکاری کاتب کے عہدے تک پہنچ سکا اور نہ ہی حکومت کے کسی چھوٹے بڑے عہدے
تک رسائی ممکن ہوسکی۔

وہ کسی حد تک بزدل اور مصلحت پسند تھا۔ خطرات سے کھیل کر، مشکلات کو گلے لگا کر
اور پریشانیوں میں کود کر عزت وشہرت اور مال ودولت حاصل کرنے پر گمنامی وغربت
میں رہتے ہوئے امن وسلامتی اور سکون واطمینان کی زندگی کو ترجیح دیتا تھا۔ اس کی
غربت وناکامی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ نہایت صاف گو، خوددار اور غیرت مند
انسان تھا، اس کا احساس زندہ اور ضمیر بیدار تھا، کسی منکر یا غلط کام کو ہوتے
دیکھ کر وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتا تھا، اس کی زبان میں تیزی وحق گوئی
تھی، اپنی اس صاف گوئی کے سبب وہ بہت سارے لوگوں کے لئے مشکلات و
پریشانیوں کا سبب ثابت ہوا جس کے ردعمل میں اسے بھی ان کی طرف سے سخت
مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر امراء وسلاطین سے دشمنی نے اس کی ناکامیوں
ومحرومیوں میں مزید اضافہ کیا۔

ابوالوفا مہندس سے ملاقات صاحب ابن عباد کے دربار سے واپسی کے بعد
توحیدی نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ صاحب ابن عباد کی سردمہری اور
بے توجہی سے اس کا دل بری طرح ٹوٹ چکا تھا اور وہ اب اپنے حالات کو بہتر بنانے
سہولیات زندگی کو فراہم کرنے کے سلسلے میں مزید ہاتھ پیر ہلانے کے لئے قطعی تیار نہ تھا
لیکن اسی یاس وناامیدی کے دور میں ابوالوفا مہندس امید کی ایک کرن بن کر
اس کی زندگی میں داخل ہوا۔ اس نے توحیدی کے اندر چھپے ہوئے جوہروں کو
پہچانا، اسے زندہ رہنے کی ترغیب دی۔ اس کی ہر طرح سے دل جوئی کی اور اطمینان
دلایا اور ہر ممکن امداد کا وعدہ بھی کیا۔ ابوالوفا سے توحیدی کی پہلی ملاقات ارجان

کے سفر میں ہوئی۔ اسی زمانے میں دونوں کے درمیان گہرے مراسم پیدا ہو گئے۔ اور دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ توحیدی کچھ پریشان حال اور مایوسیوں کا شکار تھا۔ پھر جب اسے صاحب ابن عباد کی سرد مہری اور لاپرواہی کا علم ہوا تو اس نے اسے ہر طرح سے تسلّی دی۔ ابوالوفا المہندس، وزیر ابن العارض (ابن سعدان) کا خاص آدمی تھا اور ابو حیان کا ایک طرح سے کفیل تھا۔ التوحیدی نے اس کو جو خطوط روانہ کئے ان میں زمانے کی تنگی، حالات کی ناسازگاری کا شکوہ ہے، فقر و فاقہ کی کیفیت کو دور کرنے اور دنیوی عیش و عشرت کے مواقع فراہم کرنے کی درخواست ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آخر کب تک روٹی کے چند خشک ٹکڑوں اور بوسیدہ قسم کے کپڑوں پر گذارا کیا جا سکتا ہے۔ بغداد کا عظیم شفاخانہ "البیمارستان" اس زمانے میں نہایت عروج پر تھا فوری طور پر ابوالوفا نے اسے اس شفاخانے میں ایک اچھا سا عہدہ دلا دیا۔

(باقی آئندہ)

۱۴۸۰۲۳ پ

۱۹۵۴ء حیات شیخ عبد الحق محدث دہلوی ۔ العلم والعلماء ۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت
تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین بنگال
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء ترجمان السنہ جلد ثالث ۔ اسلام کا نظام حکومت طبع جدید دلپذیر ترتیب، جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس، روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب اور کوئین

۱۹۶۰ء تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹ - ۳۰ ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق ۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام ۔

۱۹۶۱ء تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے، عرب تہذیب
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء تفسیر مظہری اردو جلد دوم ۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار ۔
نیل سے فرات تک ۔

۱۹۶۳ء تفسیر مظہری اردو جلد سوم ۔ تاریخ ردہ، سرکشی ضلع بجنور ۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں ۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں ۔

۱۹۶۵ء ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول ۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر، ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء تفسیر مظہری اردو جلد پنجم ۔ رموز عشق ۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک ۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں ۔

۱۹۶۷ء ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے ۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ ۔

۱۹۶۹ء تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین ۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء حیات عبد الحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف ۔ احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج ۔ خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب ۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

نگران اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیر اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت - اسلام کا اقتصادی نظام - قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ - تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام - سوشلزم کی بنیادی حقیقت -

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام - اخلاق و فلسفۂ اخلاق - فہم قرآن - تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم" - صراط مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول - وحی الٰہی - جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول -

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات) مسلمانوں کا عروج و زوال - تاریخ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ" -

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرستِ الفاظ جلد اول - اسلام کا نظامِ حکومت - مثریہ - تاریخ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم - لغات القرآن جلد دوم - مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم - قرآن اور تصوف - اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول - خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ - جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو -

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظم مملکت - مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم - حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ -

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم - تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ" - تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (مکمل) - اسلام کے شاندار کارنامے (کامل) تاریخ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر -

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغربِ اقصیٰ" - تدوینِ قرآن - اسلام کا نظامِ مساجد - اشاعتِ اسلام، یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا -

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم - عرب اور اسلام - تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ" - جارج برنارڈ شا -

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر - فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو از سرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے - کتابتِ حدیث -

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت - قرآن اور تعمیر سیرت - مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ -

برہان

جلد ۱۰۱ | رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ مطابق مئی ۱۹۸۸ء | شمارہ ۵

عمید الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلیشر نے جمال پریس، چھتہ شیخ منگو میں چھپوا کر دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

حضرت مفکرِ ملت کی یاد
اور
اربابِ اخلاص سے ایک گذارش

آج سے چار سال قبل مئی کے اسی مہینے میں قضا و قدر کے فیصلے کے مطابق حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رح کی دانشمندانہ، مخلصانہ، بے لوث اور گراں قیمت رہنمائی، سرپرستی اور مضبوط قیادت سے ہندوستانی مسلمانوں کی محرومی تاریخ ملی کا ایک ایسا واقعہ اور عظیم حادثہ تھا جس پر ہر دردمند دل تڑپ اٹھا تھا اور ہر آنکھ اشکبار ہوگئی تھی۔

جن شدید، پرسوز اور گہرے جذباتِ رنج والم کا اظہار اس وقت اہل فکر و بصیرت، ارباب ادب وصحافت اور اہل سیاستِ حکومت کے حلقوں میں کیا گیا تھا۔ ان گذرے ہوئے چار سالوں میں نہ جانے کتنے موقع آئے ہیں جب حضرت مفتی صاحب کی جدائی شدت سے محسوس کی گئی، بار بار ایسے مسائل ابھرے ہیں جن کے حل کی تلاش میں بہت سے مخلصین کی آنکھیں حضرت مفتی صاحب کی بصیرت افروز اور دانشمندانہ قیادت کو ڈھونڈنے پر مجبور ہو جاتی ہیں ـــــ اور خلوص، سچائی، ہمدردی، فہم و فراست سے لبریز ایک روشنی کو آنکھیں تلاش کرنے لگتی ہیں ـــــ حال کی تاریکیوں اور مسائل کے اندھیروں میں اس روشنی کی تلاش قدرتی ہے جو محبت، انسانیت، شرافت و وضعداری تحمل، برداشت اور انسانیت نوازی

کے گراں قیمت جذبات اور جوہروں سے عبارت تھی اور حضرت مفتی صاحبؒ کی باوقار شخصیت کے ساتھ مخصوص تھی۔

گذشتہ دسمبر کے آخری دنوں میں عظیم وضخیم "مفکرِ ملت نمبر" کی رسم اجرا کے سلسلے میں جو تقریب ایوان غالب میں حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صدر کل ہند پرسنل لابورڈ منعقد ہوئی اس میں جس طرح ملک بھر کے ارباب علم و دانش، ارباب صحافت و سیاست اور ہندوستان کے باوقار علماء، صلحاء، ملی وسماجی رہنماؤں اسکالرس، یونیورسٹیوں کے وائس چانسلرس اور سعودی عرب کے قائمقام سفیر ہز ایکسی لینسی حافظ الموفق، مصری سفارت خانہ کے افسر اعلیٰ اور دوسرے حضرات نے شرکت کی اور وقت کی تنگی کے باوجود جس طرح حضرت مفتی صاحبؒ کی حیات، کارناموں، جذباتِ اخلاص اور خصوصیات پر اظہار خیال کیا، اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ حضرت مفکر ملت کی ساٹھ سالہ علمی، ملّی، ملکی، دینی، سماجی، تعلیمی، اور دیگر میدانوں میں ان کی خدمات لوگوں کے قلب وروح میں آج بھی سمائی ہوئی ہے اور فکر وعمل کی وہ روشنی آج بھی ان کی رہنمائی کر رہی ہے جس کو حضرت مفکر ملتؒ سچ مچ اپنے خونِ دل اور سوز جگر سے قائم کر گئے ہیں۔

اس عظیم اور تاریخی اہمیت کے حامل نمبر کی تیاری، اعلیٰ کتابت، معیاری طباعت خوشنما گٹ اپ وغیرہ پر ادارہ ندوۃ المصنفین نے کثیر سرمایہ صرف کیا ہے جس کی وجہ سے اور حق تعالیٰ کے فضل وکرم کی بدولت یہ عظیم نمبر علمی ودینی، ادبی وتاریخی حلقوں میں اور خاص طور پر تمام اہل علم وادب لوگوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور بہت سے حضرات نے اس کے مواد، اسلوب ترتیب اور طباعت و کتابت وغیرہ کی تعریف وتحسین کی ہے۔ یہ بات ادارہ کے لئے باعث مسرت

ہے اور بلا شبہ حق تعالیٰ شانہٗ کا خاص کرم اور حضرت مفتی صاحب سے تعلق رکھنے والے بے شمار ارباب اخلاص کے تعاون کا نتیجہ ہے۔

اس موقع پر یقیناً نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ارباب علم و دانش اور حضرات خیر کی خدمت میں یہ درخواست بصد خلوص پیش کریں کہ وہ ادارہ کے جملہ تصنیفی تحقیقی اور طباعتی کاموں میں خصوصی تعاون فرمائیں۔ شدید اور ہولناک مہنگائی اور خاص طور پر کاغذ و طباعتی اشیاء کی غیر معمولی گرانی نے اس قسم کے طباعتی ٹھوس علمی اور دینی و مذہبی کاموں اور اداروں کے لئے اپنے مفید پروگراموں کا جاری رکھنا دشوار کر دیا ہے۔ ان حالات میں ہم بصد خلوص آپ حضرات خیر اور ارباب اخلاص سے یہ درخواست کرنے پر مجبور ہیں کہ براہ کرم ادارہ کے ساتھ بھرپور مالی تعاون فرمائیں۔ آپ ادارہ کی لائف ممبری اور دیگر زمروں کی رکنیت قبول فرما کر اس نازک وقت میں اس خالص علمی و دینی کام اور تعلیمات اسلامی قرآن و حدیث کے علوم و معارف کے اس عظیم ادارہ کی مدد فرما سکتے ہیں۔

امید کہ ہماری یہ درخواست صدا بصحرا ثابت نہ ہو گی۔

صوفی منش انسانیت دوست بزرگ

جناب خلیل محمد احمد ابن مخدوم صاحب

حضرت مفکر ملت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی علیہ الرحمہ ہندوستانی مسلمانوں
ے ان جلیل القدر رہنماؤں اور عالم اسلام کے ان اہم ترین مفکرین، علماء اور دانشوروں
سے تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اپنی فکر و دانش اور اپنے کردار و عمل سے
ے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ دیوبند کی شہرۂ آفاق علمی بستی کے ایک ممتاز علمی خانواد
پیدا ہونے والی یہ عظیم ہستی علم و عمل، فکر و فہم، دانش و تدبر اور خدمت خلق کے
انوں میں ساٹھ سال اس طرح سرگرم عمل رہی کہ ان کے خلوص عمل کی ایک دنیا قائل
ے۔ ان کی خدا ترسی، ان کی ذہانت، دور اندیشی اور ان کی سادگی، معاملہ فہمی اور
ف سے مخالف عناصر کے نقطۂ نظر اور تلخ سے تلخ بات کو سننے سمجھنے اور برداشت
نے کا ان کا بلند و پختہ حوصلہ، ان کے وسیع قلب و ذہن اور ان کی اعلیٰ ظرفی کچھ
ے اہم جوہر ہیں جن کی بنا پر بڑے بڑے مشائخ طریقت، علمائے کرام، مفتیان عظام
رہنمایان ملت کے ہجوم میں مفتی صاحب کی شخصی عظمت، اخلاقی بلندی، طبیعت
نفاست اور فکر و نظر اور قلب و دماغ کی کشادگی نے ان کو نہایت ممتاز اور باعظمت

مقام پر فائز کر دیا تھا گویا پر نور ستاروں کے ہجوم میں مفتی صاحب ماہ درخشاں نظر آتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب کی یاد مجھے بہت آتی ہے اور زندگی کے بہت سے مرحلے ایسے ہیں جب بے ساختہ مفتی صاحب کی شفقت بھری رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور ان کی بے شمار کرم فرمائیاں یاد آتی ہیں۔ وہ شائستگی، قدیم تہذیب اور اعلیٰ اسلامی اخلاق کے پاکیزہ اور صاف ستھرا نمونہ تھے

اس ناچیز کو ان کی خدمت میں حاضری کا بار بار شرف حاصل رہا، پرانی دلی کی جامع مسجد کے علاقہ میں ایک چھوٹی سی گلی میں واقع ان کا دفتر صرف ان کی بزرگانہ عالمانہ اور باعظمت شخصیت کی وجہ سے دینی ملی علمی اور علمی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی ادبی، معاشرتی اور تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ملک کی اہم سے اہم شخصیت اور ہر میدان عمل کے سرکردہ ممتاز لوگ نیز ضرورت مندوں اور روزگار کے متلاشی نوجوانوں کا تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ یہ ایک ایسا مرکز بن گیا تھا جہاں لوگ اپنی اپنی ضرورتیں، اپنے اپنے مسائل کی گتھیاں لے کر آتے اور مفتی صاحبؒ صبح سے رات تک ہر شخص کی رہنمائی اور امداد کی مقدور بھر کوشش فرماتے رہتے بغیر کسی لالچ کسی مفاد اور غرض کے اس قدر مستعدی، خلوص، للّٰہیت اور دل سوزی کے ساتھ لوگوں کی خدمت فرماتے کہ حیرت ہوتی تھی۔ بعض اہم سرکردہ مسلم علماء اور رہنماؤں کا کہنا تھا کہ حضرت مفتی صاحب تنہا اس قدر خدمت وکام ملت کا، ملک کا اور انسانیت کی خدمت کا انجام دیتے ہیں کہ پوری پوری جماعتیں بھی نہیں کرسکتیں۔ خدمت خلق کے معاملہ میں ان کے یہاں مذہب وملت کا بھی کوئی فرق وامتیاز نہ تھا۔ ہر امیر غریب انسان ان کے فیض کرم سے یکساں مستفید ہوتا تھا اور ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ ان سے والہانہ تعلق رکھتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب نے کسی سرکاری عہدہ یا منصب کو باوجود بار بار پیش کش کبھی قبول نہیں کیا بلکہ بڑے سے بڑے عہدہ اور منصب کو ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ حکومت کی پالیسیوں پر تعمیری انداز میں مگر سخت طریقہ پر تنقید بھی کرتے تھے لیکن اس کے باوجود مفتی صاحب کی قدر و عزت حکومت کے حلقہ میں بہت سے لیڈروں سے کہیں زیادہ تھی اور ان کی بات کا اثر کافی حد تک حکومت قبول کرتی تھی۔

ایشیا کا ممتاز علمی و تحقیقی ادارہ ـــــ ندوۃ المصنفین بھی حضرت مفتی صاحب کی ہمدردی اور اخلاص و محنت، سلیقہ اور بلند و منفرد انتظامی صلاحیتوں کا جیتا جاگتا اور کھلا ہوا ثبوت ہے، اس ادارہ کی خدمات کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا صدیوں تک اس کو یاد رکھا جائے گا۔ اسلام کی روشن، عالمگیر اور عظیم تعلیمات کو حاضر کے تقاضوں کے مطابق زبان و بیان کی تمام تر دل آویزیوں اور دل نشینی کے دلکش انداز میں پیش کر کے حضرت مفتی صاحب نے اپنے اس بنیادی عقیدہ کا ثبوت پیش کیا ہے کہ۔ اسلام امن عالم اور بقائے باہم، کائنات انسانی میں عدل و انصاف کرنے اور انسانی مساوات کے حقیقی نظام کے قیام کے لئے ایک اہم بنیادی اور ناقابل حقیقت اور کھلی سچائی کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا میں انقلابی تحریکوں کو غذا اسلام کی انسانیت پرور اور انصاف پسندانہ تعلیمات سے ہی ملی ہے ـــ!

آل انڈیا مجلس مشاورت کے قیام میں بھی حضرت مفتی صاحبؒ کا بہت اہم کردار ہے۔ بڑی جانکاہی، دل سوزی، محنت اور جد و جہد اس تنظیم کو فعال و مضبوط بنانے سلسلہ میں انھوں نے کی۔ اگر حضرت مفتی صاحب کے بتائے ہوئے راستہ اور طریقوں پر تنظیم کو چلایا جاتا تو اس کی افادیت و اہمیت ہی کچھ اور ہوتی۔

حضرت مفتی صاحبؒ کو جب فالج کا حملہ ہوا اور ان کو لکھنؤ سے دہلی لایا گیا تو جیسے معلوم ہوا تو بار بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ سلسلہ ان کی حیات کے

آخر تک قائم رہا، بار بار میں اپنی اہلیہ۔ ڈاکٹر فہمیدہ صاحبہ کے ساتھ حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں بھی کئی بار جانا ہوا جہاں ان کے داماد ـــــ جناب اظہر صدیقی اور صاحبزادگان سے بھی ملاقات ہوتی اور اس حالت میں بھی حضرت مفتی صاحب سے ملاقات کر کے دل میں روشنی اور ہمت پیدا ہوتی تھی۔ ان کی صاحبزادی صاحبہ اور داماد صاحب اور صاحبزادوں نے بڑی خدمت کی، دور دور سے بڑے بڑے لوگ حضرت مفتی صاحب کی عیادت وزیارت کے لئے آتے رہتے اور اس طرح صبح سے شام تک یہ سلسلہ چلتا رہتا۔

دارالعلوم دیوبند جیسے دینی ادارہ کے تنازعہ اور وہاں کے علمائے کرام کے مابین اختلافات کے مسئلہ پر مفتی صاحب کو شدید رنج وغم اور صدمہ تھا اور بستر علالت پر پڑے پڑے بھی اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح دارالعلوم کی عظمت وشان کو دوبارہ بحال کرادیں۔ حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب رح سے بھی بہت مخلصانہ تعلق رکھتے تھے اور ان کو ہر مرحلہ پر حضرت مفتی صاحب کی دانشمندانہ اور حوصلہ مندانہ رفاقت اور مشوروں سے بڑی تقویت ملی۔

میرا یہ مقام ہے نہ مرتبہ کہ میں حضرت مفتی صاحب جیسے عظیم عالم دین کے بارے میں لکھوں۔ ارباب اخلاص کی محفل میں اپنے آپ کو شریک کرنے کے لئے یہ چند سطور پیش کر رہا ہوں جو حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادہ جناب عمید الرحمن عثمانی نے ترتیب دیا ہے اور مفکر ملت نمبر کی اشاعت پر مبارکباد دینے کے لئے یہ چند سطریں ارباب خلوص کی خدمت میں پیش ہیں۔ میری دلی دعا ہے کہ حق تعالیٰ ادارہ برہان وندوۃ المصنفین کو قائم رکھے اور ترقیات سے نوازے اور بھائی عمید الرحمن عثمانی کو اس ادارہ کی ترقی کے لئے ہر قدم پر کامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔

نوٹ: یہ مضمون مفکر ملت نمبر کے لئے ہمیں ملا تھا لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکا اس لئے اس ماہ کے شمارے میں دے رہے ہیں۔

(ادارہ)

نظریۂ ارتقا اور دانشورانِ اسلام

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

قرآن اور نظریۂ ارتقا میں تطبیق ممکن نہیں

اسلام کے علاوہ دیگر آسمانی مذاہب اس خاکدانِ عالم میں ایک خالق و مدبر ہستی کے وجود کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ عالمِ انسانی کے اولین فردِ بشر حضرت آدم علیہ السلام تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تخلیق خصوصی کے طور پر پیدا فرمایا تھا۔ مگر چونکہ یہ عقیدہ نظریۂ ارتقار سے میل نہیں کھاتا بلکہ اس کی ضد سمجھا جاتا ہے اس لئے بعض روشن خیال "مفکرین" نے ان دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش اس طرح کی کہ نظریۂ ارتقار کو توجوں کا توں قبول کر لیا تاکہ نام نہاد اہلِ علم کی مخالفت نہ ہو، مگر مذہبی عقائد کی تاویل کرنی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ قرآن مجید کے واضح نصوص تک کو اپنی من مانی تاویلات کے ذریعہ بدل ڈالنے میں بھی کسی قسم کی قباحت محسوس نہیں کی، کیونکہ یہی ایک سستا کام ہے۔ گویا کہ ان کی نظر میں قرآن تک بس دور از کار تاویل بلکہ تحریف ہو سکتی ہے مگر نام نہاد دانشورانِ علم کے اقوال یا ان کے نظریات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ جب کہ یہ بات اچھی طرح

معلوم ہے کہ نظریۂ ارتقاء اور اس قسم کے دیگر نظریات محض مذہب دشمنی کی خا
فروغ دیئے گئے ہیں اور ان میں سائنسٹوں سے زیادہ ملحدین اور مادہ پرستو
اشتراکیوں، یہودیوں اور ان کی خفیہ تنظیموں (صیہونیت اور ماسونیت) وغیر
کا بہت بڑا ہاتھ ہے جنھوں نے دنیا میں تراج پھیلانے اور اپنے قومی اغراض و
مقاصد کو بروئے کار لانے کی غرض سے نہایت درجہ منظم طور پر اس نظریہ کی
تبلیغ کی ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث پہلے باب میں گزر چکی ہے۔

اس لحاظ سے یہ ایک حیرت انگیز ہے کہ وہ نظریہ —— بلکہ ایک مفروضہ
—— جو مذہب دشمنی کو فروغ دینے کی غرض سے اختیار کیا گیا تھا، اسی کو
بعض نادان دوست —— عین اسلام اور عین قرآن قرار دینے میں ذرا بھی
نہیں ہچکچائے۔

عقل بسوز د زحیرت کہ ایں چہ بو العجبی است

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تخلیق آدم اور نظریۂ ارتقاء دونوں
بیک وقت صحیح نہیں ہوسکتے البتہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا
پڑے گا۔ قرآن مجید میں جس اولین بشر یعنی حضرت آدمؑ کی تخلیق خصوصی کا ذکر
جس انداز میں —— صاف اور صریح بیّنات کے ساتھ —— کیا گیا ہے اور صحیح
احادیث میں جس طرح اس واقعہ کی شرح و تفسیر کی گئی ہے اس کے پیش نظر
نظریۂ ارتقاء ایک غلط اور خود ساختہ نظریہ قرار پاتا ہے، جو آج محض ایک نظریہ
نہیں رہا بلکہ ایک اچھے خاصے "عقیدے" کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ حقیقت یہ
ہے کہ نظریۂ ارتقاء کو صحیح ماننے کا مطلب صراحتاً قرآن اور اسلام کا انکار ہے۔
ان دونوں میں جمع و تطبیق نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ہر شخص کو فکری اعتبار سے آزادی
حاصل ہے کہ وہ دلائل و براہین کی رو سے جو بھی نظریہ اختیار کرے ان دونوں

سے کسی ایک ہی کو اختیار کرے۔ دونوں کو بیک وقت صحیح ماننا علمی اعتبار سے زبردست قسم کا تعارض و تضاد بلکہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ خدا اور دونوں کو بیک وقت خوش نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان دونوں میں سے کسی ایک ہی خوش کرنا پڑے گا۔

مگر واقعہ کے لحاظ سے تو یہاں پر خود ارتقا بھی ثابت نہیں ہے، جیسا کہ پچھلے اب کے مباحث سے بخوبی واضح ہو گیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا یہ نظریہ علمی و شرعی دونوں حیثیتوں سے غلط اور باطل ہے۔ قرآن اور حدیث کے تمام نات دلیل، ناطق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نوع بشری کے جس اولین فرد کو اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کیا تھا وہ ابو البشر آدم تھا، جیسا کہ تفصیل اگلے ابواب میں آرہی ہے۔

قرآن کے تمثیل ہونے کا قصہ

واقعہ یہ ہے کہ بعض مسلم علماء اور دانشوروں نے جو عموماً فکر مغرب کے خوشہ چیں یا اس سے مرعوب و متاثر تھے، دانستہ یا نادانستہ طور پر وقت کے تمام مقبول نظریات کو اسلامی اور خالص قرآنی نظریات ثابت کرنے کا بیڑا اٹھایا، خواہ وہ نظریات حقیقتاً اس سے ٹکراتے ہی کیوں نہ ہوں۔ اور اس باب میں بعض راسخ العقیدہ علماء بھی مغرب کے ان پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ روشن خیالوں کے نزدیک قرآن فہمی کے لئے بس اتنا ہی کافی تھا کہ جو قرآنی آیات و نصوص (واضح بیانات) صاف صاف جدید نظریات کے خلاف ہوں، ان کے متعلق صرف اتنا کہدیا جائے کہ یہ قرآن کا محض ایک "تمثیلی" انداز بیان ہے ورنہ اس کا ظاہری مفہوم مراد نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً قرآن کا منشا بالکل وہی ہے جس کا آج کل "علمی حلقوں" میں چرچا ہو رہا ہے۔ اگرچہ کہ قرآنی منشاد مفہوم ——— صحیح قرآن فہمی کی رو سے ——— جدید رجحانات سے کتنا ہی مختلف کیوں

نہ ہو۔ یہ گویا کہ ایک ایسی "چابی" ہے جس کے ذریعہ تجدد پسندوں کے سارے مسائل اور تمام مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسلام یا قرآن کی کوئی خدمت نہیں بلکہ چند وقتی اغراض کی خاطر اسلام کو بدنام کرنا اور مذہبی حلقوں میں انتشار برپا کرنا ہے۔ قرآن فہمی کے لئے پہلے صحیح اصول تفسیر سے واقفیت ضروری ہے ورنہ فکری انتشار اور گمراہی سے چھٹکارا کبھی نہیں مل سکتا۔

غرض عصر جدید کے بعض ایسے ہی روشن فکر اہل علم نے آدم اور تخلیق آدم کے سلسلے میں یہی روش اختیار کی تاکہ نظریہ ارتقار کو ایک خالص اسلامی نظریہ ثابت کیا جا سکے۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیے جانے کا تذکرہ بالکل صاف اور صریح لفظوں میں قرآن مجید میں مذکور ہے جو نظریۂ ارتقار کے بالکل خلاف ہے) اس لئے انھوں نے جھٹ سے کہہ دیا کہ قرآن تو یہ بات محض ایک تمثیلی روپ میں کہہ رہا ہے، ورنہ حقیقتًا کسی انسان کا مٹی سے پیدا کیا جانا ایک غیر واقعی اور غیر حقیقی بات ہے۔ بلکہ انھوں نے یہاں تک کہنے کی جسارت کر ڈالی کہ آدم نام کا کوئی شخص ــــ اولین انسانی فرد کی حیثیت سے ــــ سرے سے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوا۔ بلکہ وہ تو نوع بشری کا محض ایک تمثیلی نمائندہ تھا اور بس۔ بالفاظ دیگر نوع انسانی کی پوری جماعت کو آدم کے نام سے پکارا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مشہور منکر حدیث غلام احمد پرویز صاحب تحریر کرتے ہیں:

ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ "آدم" جن کے جنت سے نکلنے کا قصہ قرآن کریم کے مختلف مقامات میں آیا ہے (مثلاً $\frac{2}{2}$) نہیں تھے۔ قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر قصۂ آدم کی جو تفاصیل بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت سے نکلنے والا آدم کوئی خاص فرد نہیں تھا بلکہ انسانیت کا تمثیلی نمائندہ تھا۔ بالفاظ دیگر

قصۂ آدم کسی خاص فرد (یا جوڑے) کا قصہ نہیں بلکہ خود "آدمی" کی داستان ہے جسے قرآن نے تمثیلی انداز میں بیان کیا ہے۔"[1]

"آدم ایک فرد نہیں ہے۔ یہ فطرت انسانی کی سرگزشت ہے جسے قصے کے تمثیلی انداز میں بیان کیا گیا ہے اور اس تمثیل میں آدم کا لفظ غالباً اس رعایت سے لایا گیا ہے کہ انسانی ہیئت اجتماعیہ کے اولین مراحل میں جن کا تعارف قرآن کریم نے کرایا ہے، آدم نامی کسی شخصیت کو ممتاز حیثیت حاصل تھی لیکن اس تمثیل میں اس شخص کی ذات مراد نہیں ہے۔"[2]

لیکن جہاں پر کسی قسم کی تاویل ممکن نہیں تھی وہاں پر جھٹ سے کہدیا کہ یہاں [آد]م سے مراد ابوالبشر نہیں بلکہ کوئی دوسرا آدم ہوگا۔ گویا کہ قرآن حکیم میں بیان ایک [آد]م کا نہیں بلکہ کئی "آدموں" کا ہوا ہے:

"بہرحال جس آدم کا ذکر سورۂ آل عمران کی مندرجہ بالا آیت (۳/۳۲) میں آیا ہے وہ "جنت سے نکلنے والے آدم" سے مختلف تھے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نبی ہوں ہوں (اور ان کا نام آدم ہو) قرآن نے ان کا مزید تعارف نہیں کرایا۔"[3]

"لیکن سورۂ آل عمران کی متذکرہ بالا آیت (۳/۳۲) میں چونکہ آدم کا ذکر نوح کے ساتھ آیا ہے اور دونوں کے لئے اصطفیٰ کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے

---

[1] لغات القرآن، مصنفہ غلام احمد پرویز، ۱/۲۱۴، ادارہ طلوع اسلام لاہور، ۱۹۶۰ء۔

[2] معارف القرآن، مصنفہ غلام احمد پرویز، ۲/۵۳، مطبوعہ دہلی، تاریخ اشاعت غیر مذکور۔

[3] لغات القرآن: ۱/۲۱۵، حوالۂ مذکور۔

گمان غالب ہے کہ یہ آدم نبی تھے۔ اگرچہ قرآن کریم میں اس کی تائید میں کوئی نص صریح موجود نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آدم کسی نبی کا نام بھی ہو۔"[1]

یہ ایک مکابرہ نہیں تو پھر کیا ہے، جس کی تاویل میں متجدد قسم کے لوگ اس قدر تذبذب کا شکار نظر آرہے ہیں؟ اس کو تو قرآن حکیم کے سامنے اپنی حیرانی و سرگردانی کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم میں ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کے سوا کسی دوسرے آدم کا تذکرہ ہرگز موجود نہیں ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ لوگ، احادیث رسول کا تو پہلے ہی انکار کر چکے ہیں اور اب اس قسم کی اوٹ پٹانگ تاویلات کے ذریعہ قرآن کریم کا بھی انکار کرنے والے بن جائیں گے۔ گویا اس قسم کے لوگوں کا ایمان نہ تو قرآن پر ہے اور نہ حدیث رسول پر۔

یہ ہے عصر جدید کے تجدد پسندوں کا حال جو قرآن کریم کی اتباع کرنے کے بجائے قرآن کو اپنی خواہشات نفس کا تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس باب میں دور حاضر کے مسلم "مفکرین" کی اکثر و بیشتر روش یہی رہی ہے جو نظریۂ ارتقا کو ایک مرغوب اور دل پسند نظریہ تصور کر کے اس کے مطابق قرآن ثابت کرنا چاہتے ہیں اور اس باب میں سر سید احمد خاں اور شیخ محمد عبدہ نے نیچریت کی جو ابتدا کی تھی، تو اس میں اچھے اچھے اہل علم بشمول علامہ اقبال، اور ڈاکٹر رفیع الدین وغیرہ سب بہہ گئے ہیں، عنایت اللہ خاں مشرقی[2] اور پرویز وغیرہ کا ذکر ہی کیا۔ تجدد یا انحراف کی یہ داستان بڑی ہی عبرتناک ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اس کی تھوڑی سی تفصیل ناگزیر معلوم ہوتی ہے، تاکہ ہماری

---

[1] معارف القرآن: ۲/۵۲، حوالۂ مذکور

[2] دیکھئے موصوف کی کتاب "تذکرہ" مطبع وکیل امرتسر، ۱۹۲۴ء۔

ملت کے سامنے اس کا ایک خاکہ آجائے۔

سرسید اور اعتزال جدید

واقعہ یہ ہے کہ عصر جدید میں تجدد و انحراف کا آغاز غالباً سرسید احمد خاں (۱۸۱۷ — ۱۸۹۸ء) کے ذریعہ ہوا ہے، جنھوں نے علوم جدیدہ سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ہندستان میں مسلمانوں کا پہلا کالج قائم کرکے یقیناً ایک کارنامہ انجام دیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی انھیں اس بات کا بھی شدت کے ساتھ احساس تھا کہ ان علوم کی ترویج و اشاعت کے نتیجے میں اسلامی عقائد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا اس کے تدارک کے لئے اسلامی تعلیمات کی نئے انداز میں تشریح ضروری ہے۔ جیسا کہ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں اس کا صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے) لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے خود ہی انھوں نے "تفسیر القرآن" کے نام سے اردو میں ایک ناتمام تفسیر لکھی، جس میں اسلامی عقائد اور معجزات انبیاء وغیرہ کو "قانون فطرت" کے مطابق ثابت کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہوئے بہت سے حقائق و واقعات کا انکار کر ڈالا۔

قصہ مختصر موصوف اپنی تفسیر میں حضرت آدمؑ سے متعلق سارے قصے کو ایک تمثیل قرار دیتے ہوئے اس قصے میں مذکور الفاظ اور کرداروں کی طرح طرح تاویلیں کی ہیں۔ مثلاً فرشتوں کو قوائے ملکوتی اور شیطان کو قوائے بہیمی قرار دیا ہے[۶]۔

"ابلیس اور ملائکہ سے کوئی خارجی وجود مراد نہیں لیا۔"[۷]

---

[۶] دیکھئے مقالات سرسید: ۱۴/۸، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۵ء۔

[۷] موج کوثر، از شیخ محمد اکرام، ص ۱۵۹، لاہور، ۱۹۷۹ء

"آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعہ واقعہ کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اس کے جذبات اور قوت بہیمیہ جو اس میں ودیعت کی گئی اس کی برائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں۔" [۸]

"شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے۔ بلکہ خود انسان میں جو نفس امارہ یا قوت بہیمیہ ہے وہ مراد ہے۔" [۹]

مولانا حالی جو سرسید کے بہت بڑے ہمنوا اور طرفدار تھے، سرسید کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ

"وہ ملائکہ سے قوائے عالم اور شیطان سے انسان کی قوت بہیمیہ مراد لیتے ہیں۔ جن کے وجود سے جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے، انکار کرتے ہیں۔" [۱۰]

"ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں ان سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے۔ بلکہ خدائے تعالیٰ نے جو مختلف قویٰ اپنی قدرت کاملہ سے مادے میں ودیعت کئے ہیں، جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوت جذب و

---

[۸] حیات جاوید، مصنفہ مولانا الطاف حسین حالی، ص ۵۲۶، ترقی اردو بورڈ نئی دلی، ۱۹۷۹ء

[۹] ایضاً، ص ۵۲۵۔

[۱۰] ایضاً، ص ۵۳۰۔

دریح وامثال ذالک، انھیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔"[۱۱]

"قرآن سے جنات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلے سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں ...... ثابت نہیں ہوتا۔"[۱۲]

"خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسماء و افعال سے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز و استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا ہے۔ اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے، جیسے بعث و نشر، حساب و کتاب، میزان، صراط، جنت، دوزخ وغیرہ وغیرہ، وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر۔"[۱۳]

بقول شیخ محمد اکرام، سرسید نے آیاتِ قرآنی کی تاویل میں معتزلہ کا طرز اختیار کیا ہے۔ چنانچہ موصوف تحریر کرتے ہیں:

"اس تفسیر میں سرسید نے قرآن کے تمام اندراجات کو عقل اور سائنس کے مطابق ثابت کیا ہے اور جہاں کہیں سائنس کی معلومات اور کلام مجید کے درمیان اختلاف معلوم ہوتا ہے وہاں معتزلہ طریقے کے مطابق آیات کی نئی تاویل اور تشریح کرکے اس اختلاف کو دور کیا ہے۔

یہ بھی ایک مغالطہ ہے کہ سرسید کی تفسیر عقل اور سائنس کے مطابق ہے۔ جبکہ

---

[۱۱] ایضاً، ص ۵۲۶۔

[۱۲] ایضاً، ص ۵۲۹۔

[۱۳] ایضاً، ص ۵۲۷۔

[۱۴] موج کوثر، ص ۱۵۹

دنیائے سائنس کو مافوق الطبیعی مظاہر کے اثبات یا نفی سے براہ راست کوئی تعل
نہیں ہے بلکہ عقلی اعتبار سے ان مظاہر کا وجود ناممکن نہیں ہے۔ انسان کے سا
تو ابھی تک حقائق کی ایک دنیا باقی ہے جس کا اسے کھوج لگانا ہے اور خود ما
کی دنیا میں ایسے بہت سے "اسرار" جن کی کنہ و حقیقت تک اس کی رسائی نہیں ہو
ہے مگر یہ ایک الگ بحث ہے۔

سرسید کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنی یہ ساری مہم ایک جدید علم کلام کی ضرورت ک
تحت چلا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ خود ۱۸۷۶ء میں "مدرستہ العلوم" کے طلبہ سے مخاطب ہو
اپنی ایک تقریر کے دوران فرماتے ہیں:

"اس لئے اس زمانے میں ایک جدید علم کلام کی حاجت ہے جس سے
یا تو ہم علوم جدیدہ کے مسائل کو باطل کر دیں، یا مشتبہ ٹھہرا دیں،
یا اسلامی مسائل کو ان کے مطابق کر دکھائیں۔" [۴۵]

مگر افسوس کہ موصوف اپنے دعوے کے مطابق علوم جدیدہ کے مسائل کو باط
یا مشتبہ تو نہیں ٹھہرا سکے، مگر ہاں قرآن کو توڑ مروڑ کر افکار جدیدہ سے ہم آہنگ کر
کی کوشش ضرور کر ڈالی۔ حالانکہ کرنے کا کام اس کے برعکس یہ تھا کہ "نصوص قرآن"
راسخ العقیدگی کے ساتھ ایمان رکھتے ہوئے افکار جدیدہ کو باطل یا مشتبہ ٹھہرا دیا جا
اور یہ ضرورت آج بھی باقی ہے۔ اور اس اعتبار سے آج ایک نئے غزالی، ایک
نئے رازی اور ایک نئے ابن تیمیہ کی ضرورت ہے۔

سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو جدید علوم و فنون سے روشناس کرانے ک
سلسلے میں بلاشبہ زبردست اور تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں، جن سے کسی کو انکا

---

[۴۵] حیات جاوید، ص ۲۱۶۔

نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ موصوف نے مشنریوں کے مقابلے اور بعض مستشرقین کے سیرت نبوی پر رکیک اعتراضات کے جواب میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور اس اعتبار سے انھیں ایک مخلص مسلمان ہی کہا جا سکتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اپنے حد درجہ اخلاص کے باوجود موصوف نے تفسیر قرآن کے سلسلے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے اور جدید علم کلام کے نام سے "اعتزال جدید" کی بنیاد ڈالی ہے، جس کا اثر بعد والوں پر بہت دور رس واقع ہوا ہے۔ درحقیقت وہ اس منصب کے اہل ہی نہیں تھے۔ چنانچہ موصوف کے معتقد اور ان کے سیرت نگار مولانا حالی نے صاف الفاظ میں اعتراف کر لیا ہے کہ "سرسید نے اس تفسیر میں جا بجا ٹھوکریں کھائی ہیں اور بعض بعض مقامات پر ان سے نہایت رکیک لغزشیں ہوئی ہیں۔"[۱۶]

سرسید کی "تفسیر القرآن" کی اشاعت کا آغاز ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) سے ہوا ہے[۱۷]۔ اور یہ غالباً عصر جدید کی پہلی "انحرافی" تفسیر تھی جس نے خصوصیت کے ساتھ برصغیر ہند و پاک کے اہل علم کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ اور بقول شیخ محمد اکرام "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے کئی اہم مسائل میں سرسید کی رائے اختیار کر لی ہے۔ مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ کی تفسیر قرآن بیشتر سرسید ہی کی ترجمانی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق سرسید کے جو عقائد تھے وہ مرزا غلام احمد نے اختیار کر لئے اور جیسا کہ نظام المشائخ میں ڈاکٹر محمد اسماعیل کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور بھی کئی مسلمان ان سے متفق ہو گئے ہیں۔"[۱۸]

---

[۱۶] حیات جاوید، ص ۲۲۰۔

[۱۷] ایضاً، ص ۲۸۷۔

[۱۸] موج کوثر، ص ۱۶۰۔

شیخ محمد عبدہ اور نظریۂ ارتقا

مصر کے مشہور عالم اور علامہ جمال الدین افغانی کے شاگرد شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ء ـــ ۱۹۰۵ء) بھی سرسید سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ اور جیسا کہ اگلی سطور سے ظاہر ہوگا محمد عبدہ بھی سرسید کے خیالات سے واقف تھے۔ چنانچہ عصری اعتبار سے شیخ صاحب نہ صرف متاثر تھے بلکہ قصۂ آدم کے سلسلے میں تقریباً سرسید ہی کے خوشہ چیں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ شیخ صاحب عربی زبان کے عالم ہونے کی بنا پر "تاویل" اور "تمثیل" ذرا "باقاعدگی" کے ساتھ کرتے ہیں۔ غرض موصوف نے پہلے تو تخلیق آدم سے متعلق آیات کو خواہ مخواہ متشابہات میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے (وقد ذهب الأستاذ الى أن هذه الآيات من المتشابهات التي لا يمكن حملها على ظاهرها)[۱۹] پھر انھوں نے قصۂ آدم کو تمثیلی قرار دے کر اس کی دور از کار تاویلیں کی ہیں (والقصة على مذهبهم وردت مورد التمثيل لتقريب من أفهام الخلق ما تفيده هم معرفته من حال النشأة الآدمية)۔[۲۰]

عصر جدید کے انہی دو "پیشروانِ علم" کے خیالات کو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مرتبین نے پوری طرح اپنا لیا ہے۔ چنانچہ "آدم" کے عنوان پر اس میں جو مقالہ سپرد قلم کیا گیا ہے وہ انہی دو بزرگوں کی تاویلات و تمثیلات سے بھرا ہوا ہے۔[۲۱]

۱۹ے تفسیر المنار، مرتب شیخ رشید رضا: ۱/۲۵۱، مطبوعہ بیروت، طبع دوم۔

۲۰ے ایضاً: ۱/۲۵۵

۲۱ے دیکھئے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ: ۱/۲۴-۲۵، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۶۴ء۔

مگر اس سلسلے میں ایک دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ شیخ محمد عبدہ نے سرسید کے
ات سے آگاہ ہو کر انھیں نیچری اور دہریہ قرار دیا تھا۔ اور اپنے رسالہ میں
العروۃ الوثقی" کے نام سے ۱۳۰۱ھ میں پیرس سے نکلنا شروع ہوا تھا،
مقالہ خاص اس موضوع پر "الدھریون فی الھند" کے عنوان سے سپرد قلم
تھا جس میں سرسید پر نہایت درجہ سخت اور تند لہجے میں تنقید کی تھی[۲۲]۔ مگر امر
یہ ہے کہ وہ خود بھی اس الزام سے بری نہیں ہیں۔ بلکہ بعض مواقع پر تو سرسید
زیادہ نیچری دکھائی دیتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شیخ صاحب کا سرسید
زام ایک عجوبہ سا لگتا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے سرسید نے قصۂ آدم کو ایک
ل قرار دے کر اس کے بعض الفاظ کی اجمالی طور پر تاویل کی ہے۔ جبکہ شیخ صاحب
اس کی تمثیلی تفسیر میں پورے چار صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں[۲۳]۔ اس اعتبار سے ان
نوں میں صرف اجمال اور تفصیل کا فرق ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب کی اس تمثیلی تفسیر
بعض اقتباسات اردو دائرۂ معارف اسلامیہ سے نقل کیے جاتے ہیں:

"جنت سے مراد آرام و راحت کی حالت مراد لینا صحیح ہے کیونکہ نعمتوں سے پر باغات
میں انسان کو راحت و سکون ملنا یقینی ہے۔ یا اس سے مراد بے فکری اور خوشی
کی کیفیت ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آدم سے ایک شخص نہیں تمام نوع انسانی
مراد لی جائے۔ جیسے قبیلے کے باپ کے نام سے سارا قبیلہ مراد ہوتا ہے۔
درخت ممنوعہ سے مراد برائی اور ہٹ دھرمی کی جاسکتی ہے...... جنت
میں رہنے اور وہاں سے نکل جانے کے حکم سے مراد امر تکوینی ہو سکتا ہے"

---

۲۲ العروۃ الوثقی (مجموعۂ مقالات) ص ۴۷۱-۴۸۴، مطبوعہ مصر، ۱۹۲۸ء

۲۳ تفسیر المنار: ۱/۲۸۱ — ۲۸۵۔

یعنی ایسی بات جس کا ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ اس بنا پر جنت میں رہنے کا اور پھر وہاں سے نکل جانے کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی پیدائش میں بہت سی حالتوں، زمانوں اور کیفیتوں میں سے گزرتا ہے جن میں سے پہلا زمانہ بچپن کا ہے، اس عمر میں رنج و غم پاس نہیں پھٹکتا اور کھیل کود کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ بچہ گویا ایک ایسے باغ میں ہے جہاں گھنے درخت، پختہ میوے سے لدے ہوئے، موجود ہیں، نہریں بہہ رہی ہیں، پرندے گا رہے ہیں۔ زوجہ کا ذکر اس لئے کیا کہ تمام نوع انسان اس حکم میں آجائے اور معلوم ہو جائے کہ بشریت کے اندر مذکر اور مؤنث سب برابر ہیں۔ آدم وحوا کو جنت میں رہنے کے حکم کا مطلب یہ ہوا کہ نوع انسان میں مذکر و مؤنث سب ایک حالت میں ہیں...... شیطان کے وسوسے اور اُس کے بہکانے کا مطلب یہ ہے کہ خبیث روح جو انسان کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اسے برائی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ انسان بالطبع خیر کی طرف مائل ہے، بُرائی کی طرف جاتا ہے تو دوسروں کے بہکانے سے جاتا ہے۔ جنت سے نکلنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان فطرت کے قاعدے توڑ کر مشقت اور محنت میں پھنس جاتا ہے۔ آدم کی توبہ اور استغفار سے اشارہ اس طرف ہے کہ انسان اپنی فطرتِ سلیمہ کی بابت بُرے کاموں سے بُرے نتیجے پیدا ہونے کا خوف رکھتا ہے۔ اس لئے اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے کہ وہ ان بُرے نتائج سے اُسے بچالے...... خلاصۂ کلام یہ کہ انسان کی فطری حالتیں تین ہیں: اول بچپن کا زمانہ اور یہ خوشی اور راحت اور بے فکری کا زمانہ ہے۔ دوسرے بھلے اور بُرے میں کسی قدر تمیز کا زمانہ۔ اس زمانے میں وہ شیطان کے وسوسے سے خواہشوں کے جنجال میں

پھنس سکتا ہے۔ اس کے بعد ایک زمانہ عقل اور ہوش کے کامل ہونے کا آتا ہے۔ اس میں وہ اپنے افعال کے نتائج کا خیال کرتا ہے اور بُرے کاموں سے بچنا چاہتا ہے اور جب اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے تو عالم الغیب والشہادۃ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہی حالتیں ہیں جو خود پر گزرتی ہیں......."[۲۴]

اس طرح دونوں نے دور از کار تاویلات کے سلسلے میں یکساں قسم کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور جس طرح سرسید نے فرشتوں کو "قوائے ملکوتی" اور قوائے مادی کہا ہے بالکل اسی طرح شیخ صاحب نے بھی انھیں "قوائے طبیعی" یعنی NATURAL FORCES کے نام سے موسوم کرنے کی جسارت کر ڈالی ہے۔[۲۵]

اب نہیں معلوم کہ شیخ صاحب کے نزدیک "نیچریت" کا مفہوم آخر کیا تھا؟ محمد عبدہٗ کا دعویٰ تھا کہ وہ سلف و خلف دونوں کے مذاق کے مطابق تفسیر کرنا پسند کرتے ہیں۔[۲۶] چنانچہ اس مذاق کے مطابق واقعہ یہ ہے کہ وہ کبھی اِس طرف ___ ہو جاتے ہیں اور کبھی اُس طرف۔ تاکہ دونوں طبقوں کو مطمئن اور راضی رکھا جا سکے۔ بالفاظ دیگر ع

با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

غرض ان دونوں کی تفسیر اور ان کے خیالات نے امت اسلامیہ میں "تاویل"

---

[۲۴] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ : ۱/۲۴-۲۵ ، ۱۹۶۴ء

[۲۵] دیکھیے تفسیر المنار : ۱/۲۶۷-۲۶۸ -

[۲۶] ایضاً : ۱/۲۵۲ -

اور "ارتیابیت" کا دروازہ چوپٹ کھول دیا ہے۔ اور اس بنا پر اب جس ک
جی میں جو آیا وہ لکھنے لگا ہے۔ خصوصاً مصری علماء شیخ محمد عبدہ کے خیالا
سے بُری طرح متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ خاص کر ان کے اس موقف سے ک
تخلیق آدم سے متعلق قرآن کی ظاہری آیات علم انسانی پر صرف اسی وقت ت
مقدم رہیں گی جب تک کہ علم انسانی قطعیت کا درجہ حاصل نہ کرلے۔ اُن ک
اصل عبارت یہ ہے:

فظواهر الآيات في خلق آدم مثلاً مقدم في الاعتقاد على النظريات المخالفة لها من اقوال الباحثين في أسرار الخلق وتعليل أطواره و نظامه ما دامت ظنية لم تبلغ درجة القطع۔"[۲۷]

(باقی)

---

[۲۷] تفسیر المنار: ۱/۲۵۳

ڈاکٹر ابو شادی

حیات اور شاعری

جناب ابوسفیان اصلاحی۔ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

فرانسیسی حملے سے قبل مصر دن بدن ہلاکت سے قریب ہوتا گیا، تہذیب وتمدن اور علم وثقافت کے میدان میں بہت پیچھے رہ گیا۔ اسے اپنی اس تباہی کا احساس بھی نہ تھا لیکن اپنے وقار اور عزت نفس کا خیال اس وقت ہوا جب فرانسیسیوں نے مصر پر حملہ کیا۔ اس ضرب کاری نے انھیں خواب غفلت سے بیدار کیا، اب انھیں اپنے انحطاط کا احساس ہوا، اور ان اسباب کی طرف متوجہ ہوئے جن کی وجہ سے ان کے قدم متزلزل ہو رہے تھے، اب انھیں اپنی علمی گراوٹ کا بھی اندازہ ہوا چنانچہ ہندسہ اور علم طب کی طرف خصوصی توجہ دی، یوربین تہذیب سے بہت کچھ حاصل کیا، اسی زمانے میں ترجمہ پر دھیان دیا گیا۔ چنانچہ تنہا رفاعۃ الطہاوی نے تاریخ، جغرافیہ، طب، نحو اور قانون میں بیسوں کتابوں کا ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ مختلف علوم وفنون پر بھی بارہ رسائل کا ترجمہ کیا۔[1]

ترجمہ کی یہ تحریک شعر وادب میں بھی پیدا ہوئی۔ اس میں حصہ لینے والے لطفی السید

محمد السباعی، عادل زعیتر، خلیل مطران، طٰہٰ حسین، المازنی، حسن صادق، سامی الجریدنی، طانیوس عبدہ، فرح انطون، فتحی زغلول اور ان کے علاوہ بھی بہت سے نام ہیں۔ ان لوگوں کی انگریزی شعر و ادب پر بڑی گہری نظر تھی۔ ایک تو ترجمہ شدہ کتابوں کو پڑھا اور دوسرے براہ راست انگریزی کتابوں سے استفادہ کیا۔ اس طرح عربی ادب کا دامن وسیع کرنے میں ان لوگوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان لوگوں کو جدید خیالات اور نئے احساسات کا علم تھا۔[۱]

یہی وہ دور ہے جس میں ڈاکٹر ابو شادی نے آنکھ کھولی، انیسویں صدی کے آخر ۹ فروری ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوا، اس کا تعلق قاہرہ کے قبیلہ "عابدین" سے تھا۔ اس کے والد ابو شادی ایک وکیلوں کے صدر تھے جن کا شمار ممتاز لوگوں میں تھا۔[۲]

ابو شادی نے اپنی تعلیم کا آغاز قبیلہ "حنفی" کے اسکول "الھمیاثم الاولیہ" سے کیا۔ اس کے بعد "عابدین" کے نرسری اسکول میں داخلہ لیا۔ ثانوی تعلیم مدرسہ "توفیقیہ" میں مکمل کی جو ایک Rasidencial School تھا اس میں داخلہ شاید اس لئے لیا تھا کہ اس کے والدین چل بسے تھے۔

والدین کے انتقال سے اسے مایوسیوں اور ناامیدیوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ بچپن میں ہی والد کے پیار اور ماں کی ممتا سے محروم ہوگیا۔ ان مایوسیوں کا اظہار جا بجا وہ اپنے اشعار میں کرتا ہے۔ ابو شادی کی شاعری کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے ایام حیات بڑی دشواریوں سے گذارے۔

ڈاکٹر ابو شادی نے عربی کے ساتھ انگریزی ادب پر بھی بھرپور توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عربی و انگریزی دونوں ہی میں عبور پیدا کرلیا۔ جس کا ذکر اس نے "قطرۃ من یراع فی الادب والاجتماع" میں کیا ہے کہ میں نے دونوں زبانوں کا جم کر مطالعہ کیا اور بے شمار مترجمہ کتب پر بھی گہری نظر ڈالی۔ مطالعہ کے دوران جو

افکار و آرا ملیں انھیں منظوم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔[۵]

ابو شادی نے انگلینڈ کا سفر کیا اور وہاں پر ایک انگریز لڑکی سے شادی کر لی۔ اب سے ایک نئی تہذیب کو نہایت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ خود اپنی بیوی سے اس نے بہت کچھ سیکھا۔ وہاں کے عالم و فاضل لوگوں سے دوبدو گفتگو کرنے کے مواقع بھی ملے۔ "حرکۃ التجدید" کے مصنف نے اس کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

انگلینڈ کے بیس سالہ قیام کے دوران وہاں کی تہذیب و تمدن اور بود و باش کا بڑا گہرا جائزہ لیا اور ایک انگریز لڑکی سے شادی کر کے بھی اس نے بہت کچھ سیکھا لیکن جب ۱۹۲۶ء میں امریکہ کا سفر کیا تو وہ مر چکی تھی۔ اس سفر کی وجہ سے اس کے یہاں بڑی تبدیلیاں آئیں۔ عالم و فاضل لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور براہ راست انگریزی کے مصادر و مخارج سے مستفیض ہوا۔[۶]

ڈاکٹر ابو شادی کے والد محترم برابر شعر و ادب کی طرف توجہ دلاتے رہتے جس کی وجہ سے اس کی بعض قدیم عربی کی نوادرات تک رسائی ہوئی۔ والد محترم کے ساتھ علمی مجالس میں بھی شریک ہوتا۔ انھیں مجلسوں میں حافظ اور شوقی بھی ہوتے، حافظ اور شوقی سے ابو شادی کے گھریلو تعلقات تھے۔ ابو شادی کے والد نے حافظ کی وکالت میں رہنمائی کی۔ اس حیثیت سے حافظ ان کا شاگرد ہوا۔

ابو شادی نے ان مجالس کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے: "میرے استاذ مطران نے حافظ سے کہیں زیادہ متاثر کیا۔ میرے گھر پر اکثر اہل علم و ادب کا اجتماع ہوتا، میں بڑے شوق سے ان لوگوں کی باتیں سنتا۔ ان مجالس نے مجھے بہت کچھ عطا کیا۔ ان میں السید محمد، رشید رضا، جرجی زیدان، ابراہیم الیازجی، شبلی شمیل، محمد لطفی جمعہ، محمد المویلحی، سعد زاغلول، یعقوب صروف، احمد زکی، السید محمد البیلاوی، مفتی ناصف، محمود واصف، حمزہ فتح اللہ، محمد فرید، محمد کرد علی، عبد القادر المغربی، عبد الفتاح اور ان کے علاوہ اور

بھی بہت سے دوسرے۔" ابوشادی نے اپنے ادبی فکر کی نشوونما میں ان تمام لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن دراصل اپنا خصوصی رہنما اور استاذ مطران کو تسلیم کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ استاذ مطران کی نظر ادب کے میدان میں بہت وسیع تھی اور جدید عربی ادب پر انھیں خاصا عبور تھا۔[۷]

انگلینڈ کے دس سالہ قیام کے دوران اس نے جراثیم میں تخصص کیا۔ ادب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس کا مختلف تنظیموں سے گہرا ربط رہا۔ اسی دوران اس نے میگزین "عالم النحل" کی بنیاد ڈالی۔ اور "جمعیۃ آداب اللغۃ العربیۃ" کا سکریٹری رہا جسے ایک مستشرق مرجلیوث نے قائم کیا تھا۔ اس طرح مغربی ادب کا مطالعہ کیا اور مغربی تحریکوں سے واقف ہو گیا۔[۸]

اس کے علمی سفر کا آغاز اس طرح ہوا کہ مصر آنے کے بعد اس نے فروری ۱۹۲۳ء میں "نادی النحل المصری" کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کی طرف سے ایک جلسہ ہوا اور اس میں شوقی کا قصیدہ "مملکۃ النحل" پیش کیا گیا۔ مقررین میں محمد لطفی بکلی تھے جنھوں نے مختلف علمی اور طبی و ادبی رسائل کا ذکر کیا۔ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر ابوشادی کے والد محترم کا انتقال ہو گیا، معاً بعد اس کی والدہ بھی رخصت ہو گئیں۔ وہ وقت دوسری جنگ عظیم کا تھا جب ابوشادی انگلینڈ میں تھا۔ اس نے ایک مرثیہ کہا جس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

اهكبك من قلبي الحزين طويلاً	واظل يحسبني الوفاء بخيلاً
وتفيض من غالي الرثاء جوارحي	فيومن التاريخ فيك جليلاً
بل جيل اتاه سطعن على الجدى	شرفاً وحيون المماة صئيلاً

مصر واپس آنے کے بعد ابوشادی نے ادبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے بہت سے قصائد کتابی شکل میں یا مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔

انجمنوں کی بنیاد بھی ڈالی۔ اس کا پہلا دیوان "انداء الفجر" سنہ ۱۹۱۰ء میں منظر عام پر آیا
ں کے بعد دواوین پے بہ پے آتے رہے۔ زینب (سنہ ۱۹۲۴ء)، مصریات (سنہ ۱۹۲۴ء)
ن ورنین (سنہ ۱۹۲۵ء)، شعر الوجدان (سنہ ۱۹۲۵ء)، الشفق الباکی (سنہ ۱۹۲۶ء)، مختارات
ی العام (سنہ ۱۹۲۷ء)، اشعة وظلال (سنہ ۱۹۳۱ء)، الشعلة (سنہ ۱۹۳۲ء)،
طیاف الربیع (سنہ ۱۹۳۳ء) اغانی ابی شادی (سنہ ۱۹۳۳ء) الکائن الثانی (سنہ ۱۹۳۴ء)
ینبوع (سنہ ۱۹۳۴ء) شعر الریف (سنہ ۱۹۳۵ء)، فوق العباب (سنہ ۱۹۳۵ء)،
ودة الزاعی (سنہ ۱۹۴۲ء)، من السمار (سنہ ۱۹۴۹ء)۔

ان کے علاوہ کچھ قصائد الگ سے شائع ہوئے مثلاً ذکری شکسپیر، مصطفیٰ زعیم
کتبہ نافارین، الیوم، وطن الفراعنة وغیرہ۔ ابوشادی نے شکسپیر، عمر خیام اور
شیرازی سے بہت کچھ استفادہ کیا۔ اب بھی اس کے کچھ دیوان غیر مطبوعہ ہیں
مثلاً ایزیس، النیر، ذوالحر، اناشید الحیاة اور النسان الجدید وغیرہ۔ یہ دیوان
جدید عربی شاعری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔

یہ بات تو عربی ادب کے ناقدین کو تسلیم ہی ہے کہ ابوشادی نے جدید عربی شاعری
کو نئے اسالیب اور نئے افکار عطا کئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی شاعری
کی اور اس کے انگریزی کے دونوں دیوان امریکہ سے شائع ہوئے۔ ایک کا نام
Song of Joy and narrow کا اور دوسرے کا Song of Nothing New
ہے۔

ابوشادی نے چھ ادبی وثقافتی انجمنوں کی بنیاد ڈالی۔ جماعة ابولو، جماعة الادب
المصری، مملکة النحل، رابطة الادب الجدید، الاتحاد المصری لتربیة الدجاج، جمعیة
الصناعة الزراعیة[9]

سنہ ۱۹۴۶ء میں ابوشادی ولایت متحدہ امریکہ پہنچا اور سنہ ۱۹۵۵ء میں وہیں اس کا

انتقال ہوگیا۔ جوانی اور بڑھاپے کے زمانے میں یکساں طور پر اس نے عربی اور غیر عربی اخبارات کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنائے رکھا۔ اس کے ماسوا ہر ہفتے میں دوبار وائس آف امریکہ سے اس کی آواز کائنات کی فضائے بسیط میں سنائی دیتی۔ انسانی حقوق کی بین الاقوامی کونسل کا اسے ممبر چنا گیا۔ امریکہ کی ادبی انجمنوں اور ثقافتی اداروں نے عربی ادب پر تقریریں کرنے کے لئے اس کو مدعو کیا اور جس طرح اپنے وطن میں آفتاب کے دیوتا کے نام پر جماعت اپولو قائم کی تھی اور اس کے ادبی اغراض و مقاصد کی اشاعت کے لئے اسی کے نام سے ایک ادبی رسالہ "اپولو" ۱۹۳۲ء میں جاری کیا تھا۔ امریکہ میں بھی اس نے یونان کی علم ودانش کی دیوی منیروا (Minerva) کے نام سے "منروا یونین" نامی ایک شعری اور ادبی انجمن کی بنیاد رکھی۔[۱]

شاعری

جدید ترین عربی شعراء میں ڈاکٹر ابوشادی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس نے پوری زندگی شعر و ادب کی خدمت میں گزار دی۔ وہ بے شمار دواوین کا مالک ہے۔ اس نے اپنی شاعری میں ہر ممکن نئے احساسات اور جدید تقاضوں کا خیال رکھا ہے، اس کے یہاں عصری حسیات موجود ہیں۔ قدرت نے اسے زبردست قوت مشاہدہ (Keen observation) عطا کی تھی۔ جہاں وہ ایک ادیب و شاعر تھے وہیں ایک سائنس داں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غور و خوض میں گہرائی تک جا پہنچتا۔ دیکھا جائے تو جدید عربی شاعری کی پہلی قیادت و سیادت اسی کے حصہ میں آئی۔ محمد عبدالمنعم نے صحیح کہا ہے:

"بارودی نے جدید عربی شاعری کی فضا ہموار کی۔ بارودی کو جدید شاعری کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن درحقیقت جدید شاعری کی

قیادت وسیادت عقاد، مازنی اور شکری کے ہاتھوں آئی اور اس کو تیز سے تیز تر اور جدید شاعری کو زندہ وجاوید کرنے والا ڈاکٹر ابو شادی ہے۔ اس کی تحریک "اپولو" کا اس باب میں اہم رول ہے جس کی وجہ سے شعراء تنگنائیوں سے باہر آئے، انھیں حریت و آزادی ملی، اب وہ نہایت بے باکانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔"[11]

ابو شادی کو بچپن ہی میں انگریزی سے کافی واقفیت ہو گئی تھی، بہت سی تنقیدی کتابوں کا مطالعہ کر چکا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں جب وہ تیرہ سال کا تھا تو باقاعدہ ادبی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا، اپنے باپ کی وجہ سے اسے عظیم کتابوں اور عظیم لوگوں سے ملنے کے مواقع ملے۔ والد محترم کی مجلسوں میں علمی موضوعات پر مباحثے بھی سنے۔ انھیں تمام چیزوں کے سبب اسے اوائل عمر ہی میں "امہات الکتب" سے واقفیت ہو چکی تھی۔ اس کے پہلے قصیدے کا عنوان "عهد الصبا وعصر الشباب" تھا۔ اس کے تین اشعار:

نشأت وقلبي يصبو لك	والي وبيت على حبك
ونضك ادری واد عماالما	نجالج لبی لدی ذکرک
فكنت قديما وعهد الشباب	تخالينه ليس بالاالك[12]

جدید شاعری اپنے واضح انداز میں ابو شادی کے یہاں آغاز ہی سے نظر آنے لگی تھی۔ اس کے ذہن میں حریت و آزادی تھی۔ قدیم شاعری کے مطالعہ کے درمیان سے جو چیزیں سود مند لگیں اسے اپنا لیا۔ لیکن اس کے اسلوب و منہج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جیسا کہ مطران اور شکری کے علاوہ معاصرین شعراء اپنائے ہوئے تھے، اس کے تمام قصائد جدید رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس کے اثرات شعراء کے دواوین اور محافظین شعراء کے یہاں نظر آتے ہیں۔[13]

یہ بات حقیقت سے بہت قریب ہے کہ جدید شاعری کو آگے بڑھانے

میں تین حضرات کلیدی حیثیت کے حامل ہیں، یہی جدید شعراء کے امام ہیں۔ ان میں پہلا نام مطران، دوسرا عبدالرحمن شکری اور تیسرا ڈاکٹر ابوشادی کا ہے عقاد اور مازنی ان تینوں سے پیچھے رہے۔ ابوشادی کی جدت و ندرت کا اندازہ اس کے دواوین کے پڑھنے سے ہوتا ہے۔ شوقی کے بعد گیارہ سال تک جدید شاعری کا پتہ رہی۔

ڈاکٹر ابوشادی کے نئے احساسات اس کے لئے باعث ضرر ثابت ہوئے مصر کے اس حلقہ نے جو قدیم خیالات سے بری طرح چمٹا ہوا تھا اور اسی کو ادب کا قیمتی ذخیرہ سمجھتا تھا، ہر طرح سے ابوشادی کو ذہنی گزند پہنچائی۔ جس کا اظہار محترم ڈاکٹر اشفاق صاحب ندوی نے اس طرح کیا ہے:

"مصری شاعر ابوشادی کے امریکہ جانے کی کہانی خود اس کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہے کہ اسکندریہ یونیورسٹی میں وہ ایک اچھی پوسٹ پر تھا۔ رجعت پسندوں اور اس سے جلنے والوں نے اس کو پریشان کرنا شروع کردیا اور ان رجعت پسندوں کی خوشنودی کی خاطر ناشرین اس کی تخلیقات سے اغراض کرنے لگے۔ ظاہر ہے کہ ایک حساس انسان کے جذبات کچلنے کے لئے یہ بہت بڑی چیز تھی۔ ان حالات سے مجبور ہو کر ابوشادی کو امریکہ کے لئے رخت سفر باندھنا پڑا۔"[15]

ابوشادی کے اندر یہ سب تبدیلیاں کیسے آئیں؟ ایسے نئے خیالات کا اندازہ کیسے ہوا۔ اس نے قدیم اور روایتی شاعری سے بغاوت کیوں کی؟ بات یہ ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ میں اس نے اپنے والد کی میگزین "الظاہر" میں لکھنا شروع کردیا تھا۔ بچپن ہی میں اسے عربی و انگریزی ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ بچپن ہی میں "اغانی" اور The international Library of famous literature کا مطالعہ کرچکا تھا۔ وہ پابندی سے معروف کتب خانہ "خدیویہ" جایا کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ

سے انگریزی کی مایۂ ناز کتاب Oxford Lectures on poetry بھی پڑھنے کو مل گئی۔[۱۴] ان تمام کتابوں نے اس کے ذہن و قلب پر گہرے اثرات ڈالے اور بہت تیزی سے اس کے اندر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ رجعت پسند حلقہ ابوشادی کے خلاف سینہ سپر ہو گیا۔

ان تبدیلیوں کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابوشادی کی زندگی کا بیشتر حصہ انگلینڈ اور امریکہ میں گزرا۔ اس کی زندگی کے چار مرحلے ہیں:

(۱) مصر میں ۱۸۹۲ء سے ۱۹۲۲ء تک

(۲) انگلینڈ میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۶ء تک

(۳) دوبارہ مصر میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۶ء تک

(۴) امریکہ میں ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۵ء تک

ان مراحل کی وجہ سے اس کے اندر بڑے تغیرات آئے۔ ان مراحل اور نشیب و فراز سے اس نے بہت کچھ سیکھا۔

عباس محمود العقاد، مازنی اور شکری اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے راہیں ہموار کر چکے تھے۔ ابوشادی کا تعلق بھی اسی قبیل سے تھا۔ اس نے عربی ادب کی تمام تحریکوں سے استفادہ کیا۔ انگریزی ادب میں مہارت تامہ پیدا کرنے کی وجہ سے اس کی شاعری کا رنگ یکسر تبدیل ہو گیا۔ شاعری میں نئے تجربات کئے۔

اس کی شاعری میں درج ذیل چیزیں ملتی ہیں:

(۱) بحور و قوافی میں تنوع اور جدید اوزان کا اضافہ

(۲) اشعار کے ترجمے

(۳) آزاد اور نثری قصائد

(۴) ڈرامائی قصائد

(۵) جدید الفاظ کا اضافہ اور نئی تراکیب کا اختراع[18]

ان تمام چیزوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں وہ احساسات میں تبدیلیاں
وہیں اس نے عربی شاعری کے Structure کو بھی بدلا۔

عربی شاعری میں آزاد نظموں کی بنیاد احمد فارس الشدیاق نے ڈالی لیکن
ہی تھوڑے اشعار کہے۔ عبدالرحمن شکری نے بھی قافیہ سے بغاوت کی۔ اس ط
آزاد شاعری کی بنیاد پڑ گئی۔ بعد میں اسی نقش قدم پر مازنی اور فرید الوجدید کی
فرید کی آزاد نظم "مقتل عثمان" ۱۹۱۸ء میں منظر عام پر آئی۔

لیکن اس کو بحیثیت ایک صنف شاعری کے متعارف کرانے میں ابوشاد
کارنامہ ہے۔ اس کا دیوان "الشفق الباکی" جو ۱۹۲۷ء میں منظر عام پر آیا جو اک
آزاد شاعری پر مشتمل ہے۔ "صرخۃ الليل" (ص ۲۱۷) "تلبیۃ" (ص ۸۰۳) "مملکۃ اب
(ص ۱۰۲۳) "ممنون الفیلسوف" (ص ۶۲۵) "الصرصرد" (ص ۱۱۰۰) "اناد غی
(ص ۳۵) آزاد نظمیں ہیں۔ اور "مختارات وحی العام" جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا ا
میں بھی بے شمار آزاد نظمیں ہیں۔ اس طرح آزاد شاعری کا کافی ذخیرہ اس ک
یہاں موجود ہے۔[19] اس طرح دیکھا جائے تو آزاد شاعری کا اصل بانی ڈاکٹر ابو
ہی ہے۔ اس نے آنے والے شاعروں سے آزاد شاعری کو منوالیا۔ شعراء آز
شاعری سے مانوس ہو گئے۔

جدید شاعری میں رومانوی تحریک کا بانی بھی ڈاکٹر ابوشادی ہے۔ اس با
میں اس کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ "دراسات فی ادبنا الحدیث" کی یہ عبار
ملاحظہ کریں:

"دونوں عالمی جنگوں کے درمیان جو وقفہ ہے اسی میں رومانوی تحریک
وجود میں آئی۔ سب سے پہلے مہجری ادباء نے اس کی طرف توجہ

مبذول کی۔ ایلیا ابوماضی اور اپولو تحریک نے اس طرف پیش قدمی کی جس میں سر فہرست ابوشادی کا نام ہے، اب ہر طرف رومانوی تحریک کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ تقلیدی ادب کی دیواریں مسمار ہو گئیں۔ دوسری جنگ کے وقت یہ تحریک شباب پر تھی۔ اس میں ابوشادی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں بڑے جتن کئے۔

ڈاکٹر ابوشادی عشق و محبت کا پتلا تھا۔ اس کی رگ و پے میں خون عشق موجزن ۔ یہی وجہ ہے کہ مصر اور دوسرے ممالک میں وہ حسن و جمال کا متلاشی رہا۔ یہ بہ اس کا آخر وقت تک قائم و دائم رہا۔ درج ذیل اشعار اس کے اسی خیال کے بیان ہیں:

رعد صوتك أم حديث دفاق	قدبه لنه برادة الاشراق
دت طويلاً فى جفاء طاهرة	وهنيهة صنمك فى الاشراق
امواج بعثت كانها	للعاشقين مصارع العشاق

ابوشادی کے عشق و محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ اوائل عمر ہی سے وہ عورتوں کے دس اور احترام کا قائل تھا۔ یہاں تک کہ "وحدۃ الوجود" کے مسلک میں اس نے ورت کو الوہیت کا درجہ دیا۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء میں اس نے یہ اعلان کیا کہ عورتوں کا ترام کیا جائے کیونکہ روحانی اور جسمانی اعتبار سے وہ مقدس ہیں۔ انھیں حقیر، مبتذل ور گری ہوئی نظروں سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے اخلاق و عادات گڑتے ہیں اور جنسیات کے امراض ہو جاتے ہیں۔

عورت بنی نوع انسان کا ایک اہم جزو ہے، وہ اس کے شعور میں بس جاتی ہے چنانچہ جب قاہرہ چھوڑ کر اسکندریہ آ گیا تو اسے اپنی بیوی "زینب" بہت یاد

آرہی تھی۔ اس باب میں یہ اشعار:

ودعتنی تو دیع حلم خاطف ودخلت للبلد الجمیل وداء

ومن حلات القلب الفیود فانہ ضرب الضلوع تطلعا واباء

لم ادر من أرقی ولوعۃ وحشتی معنی الی فر الابناء

یاغربتی وانا المقیم بموئل کالسجن الفتہ تزید جفاء[۲۲]

ابوشادی کی زندگی کے تجزیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس کی زندگی رنج وغم اور آلام ومصائب سے پر ہے۔ ایک تو والدین کا انتقال، دوسرے رجعت پسندوں کے حملے اور تیسرے بیوی کا انتقال۔ اس طرح وہ زندگی سے بیزار ہوگیا۔ وہ اپنی بیزاری کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

ویلی من الدھر یبکینی ویبتسم ولا یردعوادی جودہ القسم

تعدد شر ذنوبی ما یفیض بہ قلبی الی الناس من حب ویزدھم

املل دمعی وماء العین مضطرم وھاج وجدی وسخط القلب محتدم

سخرت من بیئتی لما مرمت بھا ونحت لکن نواحی کلہ کرم[۲۳]

ابوشادی کی شاعری ان موضوعات پر مشتمل ہے وصف، وطن، قوم، تامل، وجدان اور ان کے علاوہ بعض خاص موضوعات پر۔[۲۴]

حواشی ومصادر

۱۔ ڈاکٹر کمال نشأت، احمد زکی ابوشادی وحرکۃ التجدید فی الشعر العربی الحدیث، وزارۃ الثقافۃ، دار الکاتب العربی الحدیث للطباعۃ والنشر بالقاہرہ ۱۹۶۷ء، ص ۸۔۹۔

۲۔ ایضاً ص ۱۲۔

ایضاً ص ۱۶۔

ایضاً ص ۱۷۔

ایضاً ص ۲۱۔

ایضاً ص ۱۵۹۔

ایضاً ص ۲۵۔

عبدالعزیز الدسوقی، جماعۃ ابولو واثرہا فی الشعر الحدیث، معہد الدراسات العربیہ العالیہ ۱۹۶۰ء ص ۱۴۸۔

ڈاکٹر کمال نشأت، احمد ذکی ابوشادی وحرکۃ التجدید فی الشعر العربی، وزارۃ الثقافۃ دار الکاتب العربی للطباعۃ والنشر بالقاہرہ ۱۹۶۷ء ص ۴۴۔۴۵

ڈاکٹر سید طفیل احمد مدنی، امریکہ میں شعر و ادب کا ارتقاء، نیشنل آرٹ پرنٹرس الہ آباد ۱۹۸۳ء ص ۲۵۵۔

عبدالعزیز الدسوقی، جماعۃ ابولو واثرہا فی الشعر الحدیث، معہد الدراسات العربیہ العالیہ ۱۹۶۰ء ص ۵۹۱۔

ڈاکٹر کمال نشأت، احمد ذکی ابوشادی وحرکۃ التجدید فی الشعر العربی الحدیث، وزارۃ الثقافۃ دار الکاتب العربی للطباعۃ والنشر بالقاہرہ ۱۹۶۷ء ص ۱۰۶

ایضاً ص ۲۹۳

ایضاً ص ۳۰۱

ڈاکٹر اشفاق احمد، جدید عربی ادب کے ارتقاء میں مہجری ادباء کی خدمات، نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۳۷۲ — ۳۷۳

محمد یوسف کوکن، اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث، دار حافظۃ للطباعۃ والنشر مدراس، ج ۳ ص ۱۹۴۔

۱۷۔ عبدالعزیز الدسوقی، جماعۃ ابولو واثرہا فی الشعر الحدیث، معہد الدراسات العربیہ العالیہ، سنہ ۱۹۶۰ء، ص ۱۳۳۔

۱۸۔ محمد المنعم خفاجی، الشعر والتجدید، رابطۃ الادب الحدیث، ص ۳۹

۱۹۔ ڈاکٹر کمال نشأت، احمد زکی ابوشادی وحرکۃ التجدید فی الشعر العربی الحدیث وزارۃ الثقافۃ دار الکاتب العربی للطباعۃ والنشر بالقاہرہ سنہ ۱۹۶۷ء، ص ۲۹۔

۲۰۔ یونس عوض، دراسات فی ادبنا الحدیث (المسرح، الشعر، القصۃ) دار المعرفۃ شرکۃ ذات مسئولیۃ محدودۃ ۱۵ شارع صبری ابوعلم (جامع چرکسی) القاہرہ سنہ ۱۹۶۱ء ص ۲۰۹۔

۲۱۔ احمد الشائب، ابحاث ومقالات، مکتبۃ النہضۃ المصریہ، شارع عدلی بالقاہرہ۔

۲۲۔ ڈاکٹر کمال نشأت، احمد زکی ابوشادی، حرکۃ التجدید فی الشعر العربی الحدیث وزارۃ الثقافۃ، دار الکاتب العربی للطباعۃ والنشر بالقاہرہ سنہ ۱۹۶۷ء ص ۳۲۲۔

۲۳۔ ڈاکٹر ماہر حسن فہمی، تطور الشعر العربی الحدیث فی مصر ۱۹۰۰ — ۱۹۵۰، ملتزم الطبع والنشر مکتبۃ نہضۃ مصر بالفجالۃ، ۱۸ شارع کامل صدقی ص ۱۹۰

۲۴۔ احمد قیش، دار الجیل بیروت لبنان ۱/۶/۱۹۷۱ء تاریخ الشعر العربی الحدیث ص ۲۴۰۔

ابو جہاد کا قتل

صہیونی دہشت گردی کا ایک اور شرمناک مظاہرہ

جناب محمد اظہر صدیقی انڈو عرب پریس فیچرس انٹرنیشنل

یہ حقیقت اب کھل کر دنیا کے سامنے آگئی ہے کہ تیونس میں فلسطینی لیڈر خلیل الوزیر ابو جہاد کا سفاکانہ قتل اسرائیلی حکومت کی معروف دہشت گردی، درندگی اور قانون و انصاف کے تقاضوں کو مسلسل پامال کرتے رہنے کی اس کی بے شرم اور ننگی جارحانہ ذہنیت کی بدولت ہوا ہے اور تل ابیب میں اسرائیلی کابینہ کے اہم وزیروں، فوجی کمانڈروں اور اہم شاطر یہودی دہشت گردوں کی ملی بھگت اور منصوبہ بند طریقہ سے تیار کی ہوئی سازش کے بعد ہی یہ جرم عظیم کیا گیا ہے جس نے ہر قلب و ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ آج کی نام نہاد ترقی یافتہ دنیا میں کسی بین الاقوامی ضابطہ، کسی آئین، کسی تمدن اور قانون کا وجود ہے یا نہیں؟

ساری دنیا چیخ اٹھی، بین الاقوامی ادارے دم بخود اور مختلف تنظیمیں ہکا بکا رہ گئیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ دہشت گردی، قانون شکنی، جارحانہ توسیع پسندی کی گھناؤنی ذہنیت کی کوکھ سے جنم لینے والی بدنام زمانہ اسرائیلی حکومت ساری دنیا کے ضابطوں، اصولوں اور روایات کو مسلسل پامال کرتی چلی جا رہی ہے لیکن وہ امریکہ ـــــ جو بڑے فخر سے اپنے آپ کو جمہوریت کا جنم داتا، تہذیب و تمدن

کا امام اور دہشت گردی کا سب سے بڑا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اسرائیل کے ہر قہر وستم، ہر جابرانہ حرکت اور ہر اس عمل کی پشت پناہی کرتا ہے جس کی بدولت بین الاقوامی قوانین، اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے چارٹر اور دنیا میں امن وامان قائم کرنے کی غرض سے بنائے جانے والے ضابطے ایک بھونڈا مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔

بین الاقوامی حالات پر گہری نظر رکھنے والا، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور سکیورٹی کونسل کی کارروائیوں کی تفصیلات اخبارات میں غور سے مطالعہ کرنے والا ہر باشعور اور ذی ہوش انسان جانتا ہے کہ یہ امریکہ اور صرف امریکہ ہی ہے جس کی بے جا حمایت، ناجائز تائید اور غیر منصفانہ بلکہ بے شرمانہ سرپرستی و پشت پناہی کی بدولت اسرائیلی حکومت کی ڈھٹائی، فرعونیت، سفاکی اور بربریت اپنی حدود سے بہت آگے نکل آئی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ اسرائیل کے ہر جابرانہ عمل کے پیچھے بلکہ برابر میں امریکہ کھڑا نظر آتا ہے۔ اور صاف محسوس ہوتا ہے کہ بین الاقوامی دہشت گردی، معصوم بچوں کے قتل عام، عورتوں اور ضعیفوں کی ہلاکت، عمارتوں کی تباہی و تاراجی کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس کی ذمہ داری سے دنیا کی یہ بڑی طاقت اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کر سکے ــــ؟

سب سے بڑا دکھ اور افسوس تو خود اپنوں پر، اپنے حالات، اپنی صفوں میں پھیلے ہوئے انتشار پر ہوتا ہے، ساری دنیا کے عرب اور مسلمان ان ظالم وجابر درندوں کو سبق نہیں دے سکتے ان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے کیونکہ ان کی صلاحیتیں ان کی توانائیاں سب کی سب آپس کی جنگ اور باہمی اختلافات کی نذر ہو کے رہ گئی ہیں۔

ہم اس کا یقین رکھتے ہیں کہ وحشت و بربریت و دہشت گردی اور قتل و

غارت گری کا یہ طوفان بلاخیز آگ اور خون کا یہ سمندر، یہ آتش و آہن کی بجلیاں اور آندھیاں آزادی، حریت اور انقلاب کی اس روشنی کو ختم نہیں کر سکتیں جو اس وقت فلسطین کی آزادی کے لئے جد و جہد کرنے والے جیالے اور بہادر انسانوں کے دلوں میں پیدا ہو چکی ہے اور نہ جذبات کا وہ طوفان اب کسی طرح رُک سکتا ہے جو آزادی کے حسین خواب دیکھنے والوں کے قلب و روح میں جگہ بنا چکا ہے۔ تاریخ کے اس اٹل فیصلے اور قدرت کے اس قانون کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ظلم و جبر اور قہر و ستم کی جو راہ اسرائیلی حکمرانوں نے اپنا رکھی ہے اس کا نتیجہ خود ان کی تباہی و بربادی کے سوا دوسرا نہیں نکل سکتا۔ یہ ظلمتیں، یہ اندھیرے یہ تاریکیاں ہی ایک دن ایک نئے سویرے اجالوں کے جنم دینے کا ذریعہ بنیں گی۔

رات کے ماتھے پہ "موہوم ستاروں" کا ہجوم
صرف "خورشید درخشاں" کے نکلنے تک ہے

ابوحیان توحیدی

حیات وخدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

(۳)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی، شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ابن سعدان کے دربار میں

ابن سعدان بویہی خاندان کے مشہور خلیفہ صم
کے وزیر تھے۔ ان کا دربار علماء وفضلاء، فلاسفہ وحکماء اور اطباء وسائنسد
کا عظیم مرکز بنا ہوا تھا اور وہ اپنے درباری فضلاء وحکماء کی کثرت پر فخر کر
کہتے ہیں:

"خدا کی قسم مملکت عراق میں اس کی نظیر نہیں ہے۔ یہ اہل فضل کے اعیا
دانشوروں کے سردار ہیں[۳۴]" ابوالوفا مہندس بھی ابن سعدان کے دربار میں
قابل ذکر مشہور ومعروف شخص تھے۔ ابن سعدان سے ان کے مراسم اچھے
ابوالوفا حساب وانجینرنگ کے شعبہ میں سند تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھو
اس میدان میں بہت ساری نئی چیزوں کا ایجاد وانکشاف کیا۔ ریاضی وعل
پر ان کی کئی قابل ذکر کتابیں بھی موجود ہیں۔

ابوالوفا مہندس کی سفارش پر ہی ابن سعدان نے توحیدی کو اپنے مد

درباریوں میں شامل کر لیا۔ ابن سعدان نے ابوحیان کی صلاحیتوں کی قدر کی، اسے
واحترام اور انعام واکرام دونوں ہی چیزوں سے نوازا۔ ابوحیان کی زندگی میں
بار کوئی ایسا شخص ملا جس نے اس کے فن کی قدر دانی کی، اس کی کاوشوں اور
ات کو سراہا۔ چنانچہ ابوحیان بھی ابن سعدان کی سخاوت، خوش خلقی، علم دوستی
دلچسپی اور بندہ پروری سے بہت زیادہ متاثر ہوا اور دل کھول کر اس کی
یف و توصیف کی۔[۳۵] ابوحیان نے ان کے لئے جاحظ کی کتاب الحیوان" کی کتابت
ر دوستی کے موضوع پر "الصداقۃ والصدیق" نام کی ایک عمدہ کتاب تصنیف

ابن سعدان کی نوازشوں اور انعامات کے سائے میں پلتے ہوئے کچھ وقت کے
ایسا لگا کہ مصیبت کے بادل چھٹ گئے، پریشانیوں اور کلفتوں کے دن ختم ہو گئے
ن شاید تقدیر کا فیصلہ کچھ اور تھا چنانچہ محسن ابن سعدان بھی کسی وجہ سے ان سے
ض ہو گیا اور زمانے نے ایک بار پھر ان کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا، وہ ابن سعدان
سرپرستی سے محروم ہو گئے۔ توحیدی نے ان کی خدمت میں جذبات واحساسات
ہو ایک موثر خط لکھا کہ شاید ان کی ناراضگی دور ہو جائے اور اس کی مالی مشکلات
دور ہو جائیں۔ توحیدی نے اپنے محسن ابوالوفا کی خدمت میں بھی ایک خط
انہ کیا۔[۳۶]

جہ ناراضگی

تاریخی حقائق و شواہد کی روشنی میں ابن سعدان کی ابوحیان توحیدی
ے ناراضگی کا سبب دریافت کرنا مشکل ہے۔ اور یہ بات ہنوز تحقیق طلب ہے کہ
ن سعدان اس سے کیوں ناراض ہو گئے۔ مگر مورخین کا اندازہ یہ ہے کہ وجہ ناراضگی
ن سعدان کے ساتھ شبینہ محفلوں میں سیاسی سوالات و جوابات کے درمیان

وہ تنقیدی خیالات ہیں[۳۷] جو اس نے ابن سعدان کے سامنے مختلف درباری شخصیات کے متعلق ظاہر کئے تھے جو کسی طرح ان متعدد شخصیات تک پہنچ گئے اور انھوں نے توحیدی کے خلاف ابن سعدان کے کان بھرنا شروع کئے، نتیجتاً توحیدی کو اس کی سرد مہری کا شکار ہونا پڑا۔[۳۸] ہو سکتا تھا کہ ابو الوفا کی کوششوں سے ایک بار پھر ابوحیان توحیدی اور ابن سعدان کے تعلقات استوار ہو جاتے، اور ان میں خوشگواری آجاتی مگر اسی اثنا میں ابن سعدان کو عبد العزیز یوسف نے قتل کر دیا اور خود کرسی وزارت پر قابض ہو گیا۔ اور برسر اقتدار آتے ہی ابن سعدان کے اصحاب و احباب کو پریشان کرنا شروع کیا اور توحیدی کا شمار بھی ابن سعدان کے قریبی اصحاب میں ہوتا تھا، انھوں نے ابن سعدان کی شبینہ محفلوں میں ابن یوسف کے اعمال و سرگرمیوں کو نقد و تنقید کا نشانہ بھی بنایا تھا لہٰذا اس کا بہت زیادہ امکان تھا کہ اگر ابن یوسف کو بغداد میں توحیدی کے قیام کی اطلاع مل جاتی تو وہ کسی بہت بڑی مصیبت کا شکار ہو جاتا چنانچہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہ خاموشی سے بغداد سے فرار ہو گیا اور شیراز آکر باقی ماندہ زندگی گوشۂ عافیت میں گذاری۔

قیام شیراز کے دوران ابوحیان توحیدی نے اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ عرفان ذات اور ذکر الٰہی میں صرف کیا۔ اپنے زمانے میں رائج علوم فلسفہ اور تصوف کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور پھر اسی زمانے میں المقابسات، المحاضرات وغیرہ اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ان تصانیف کا رنگ ان تالیفات سے بالکل علیحدہ ہے جو انھوں نے اس سے قبل جوانی کے زمانے میں لکھی تھیں۔

ناقدانہ ذہنیت

ابوحیان توحیدی کی زندگی کا ایک نمایاں وصف عیب جوئی و تنقید نگاری تھا۔ توحیدی کو لوگوں کے عیوب نکالنے، ان کی کمزوریوں کا پتہ لگانے

ن پر تنقید کرنے پھر ان کے نقائص کو عوام میں پھیلانے کا بڑا شوق تھا۔ چنانچہ یاقوت کہتا ہے "الذام ستا منہ و التلب د کانہ" مذمت کرنا تو اس کی فطرت میں داخل ہے اور مذمت کرنا اس کا خاص مشغلہ ہے[۳۹]۔ ابوحیان کو خود بھی اپنی اس کمزوری کا اچھی طرح احساس تھا۔ چنانچہ وہ معذرت کرتے ہوئے اپنے عیب کو تسلیم کرتا ہے۔ معاصرین کے درمیان ابوحیان کی یہ بری خصلت مشہور تھی۔ خود ابوحیان کو بھی اس کا اعتراف تھا۔ اس کی تحریروں کے مطالعہ سے اس کا یہ نمایاں وصف کھل کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ "مثالب الوزیرین" اس کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ اس کے اندر ہجوگوئی، تنقیص، تنقید اور انتقام کی وہ انتہائی شکل ہے جس سے زیادہ عربی نثر نگاری میں توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر ابن العمید اور صاحب بن عباد کی شان میں کہے گئے تمام تر مدحیہ قصائد کو ایک طرف رکھ دیا جائے پھر بھی وہ ابوحیان توحیدی کے چند نقائص کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ نثری ہجوگوئی کے میدان میں ابوحیان سے آگے کوئی نہیں بڑھا۔ نثر کے اندر ہجوگوئی میں اس کا وہی مقام ہے جو شاعرانہ ہجوگوئی میں فرزدق و جریر کا۔

یہی وجہ ہے کہ ابوحیان توحیدی کے اپنے معاصر علماء کے ساتھ تعلقات کچھ زیادہ خوشگوار نہ رہے بلکہ ان کے درمیان باہمی چپقلش اور عناد و مخالفت کی فضا برابر باقی رہی۔ ایسی بات نہیں کہ ابوحیان کے پاس ضمیر نہیں تھا یا وہ اخلاق کے اصولوں اور وقار و سنجیدگی سے ناواقف تھا، یا اسے مجد و شرافت اور عزت و کرامت کی قیمت کا اندازہ نہ تھا بلکہ زمانے کی ستم ظریفیوں اور ناکامیوں نے اسے ان پرخار وادیوں سے گذرنے پر مجبور کیا اور اس نے یہ راستہ اختیار کیا۔ اسے ایسے جاہل حکمران و سلاطین کی عنادت و دون عقلی پر رونا آتا تھا جن کے اندر خیر و شر کی تمیز، ہیرے اور پتھر کے فرق

اور شریف و رذیل کو پہچاننے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس نے انسان کی فطری کمزوریوں کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بظاہر ایک حریص اور لالچی انسان تھا۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ دوسروں کے اندر جس عیب یا خرابی کی نشاندہی کرتا وہی خرابی اس کی اپنی ذات میں موجود ہوتی اور وہ اس کی اصلاح کی طرف کم ہی متوجہ ہوتا۔

(باقی آئندہ)

الکتاب ــــ سیبویہ کا ایک عظیم کارنامہ

توقیر عالم فلاحی، ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ ایک ناقابل انکار صداقت ہے کہ عربی زبان و ادب کے سرمایہ میں جو قابل ذکر اضافہ عہد عباسی میں ہوا ہے اس کے مقابلے میں نہ تو پہلے ہوا اور نہ اس کے بعد۔ چنانچہ یہ دور اسلام کا وہ زریں دور ہے جس میں مسلمان تہذیب و تمدن کے لحاظ سے بام عروج پر پہنچ گئے اور انھوں نے تاریخ اسلامی کے ایوان کو کلچر و ثقافت اور علوم و فنون کے لحاظ سے درخشاں اور تابندہ بنا دیا۔

عروج و اقبال کے اس تابناک دور میں فتوحات کا سلسلہ بھی سیل رواں کی طرح بڑھ رہا تھا، ضرورت اس بات کی متقاضی تھی کہ حکومت کی توسیع و استحکام کے لیے غیر عربوں کو عربی معاشرے میں ضم کر لیا جائے اور ان کے اندر سے احساس کہتری، مرعوبیت اور اجنبیت ختم ہو تاکہ مفتوحہ ممالک کے یہ غیر عرب لوگ عربوں کے شانہ بشانہ ہو کر عالم انسانیت کے قابل ذکر حصوں پر فتح و تسخیر کی کمندیں ڈال سکیں۔ یہی وہ غایت تھی جس کے حصول نے عربوں کو مہمیز کیا کہ کوئی ایسا فن وجود میں آئے جو زبان کی تعلیم و تعلّم میں معاون و مددگار ہو سکے۔ چنانچہ آٹھویں صدی عیسوی میں اس سمت میں عملی طور پر پیش قدمی ہوئی اور عربی گرامر کے دو مکتبۂ فکر وجود میں آئے۔ جنھوں نے بلا شک و تردید زبان عربی کی بقا و تحفظ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے اہم نمائندوں میں خلیل ابن احمد، ابو عبیدہ بمر بن المثنی، الاخفش، الاصمعی، الزجاج، کسائی، فراء، ابو زکریا، المفضل الضبی اور ابن الانباری کا شمار ہوتا ہے۔

سیبویہ ۔ میدان نحو کا شہسوار :

ان مکاتیب فکر کے ناموران نحو میں سیبویہ کا مقام بڑا ہی اعلیٰ اور ارفع ہے
خود اس وقت کا مشہور معاصر ادیب اور نحوی اس کی ذات سے اس قدر متاثر
نظر آتا ہے کہ اس کی بلا کی ذہانت اور استعداد و صلاحیت نے اسے اس
اعتراف حقیقت سے باز نہیں رکھا کہ نحو میں لوگوں نے اس جیسی کتاب نہیں
لکھی ۔ متقدمین اور متاخرین تمام کی نحوی کاوشوں پر الکتاب کی چھاپ نظر آتی
ہے[۱] ابن خلکان لکھتے ہیں کہ سیبویہ متقدمین اور متاخرین دونوں سے نحو کے
معاملے میں سبقت لے گیا[۲] ابو الطیب عبدالواحد اس کے علمی مقام کا تذکرہ
اسی ایک جملے میں کرتے ہیں ۔ " وھو اعلم الناس بالنحو بعد الخلیل "[۳]

شروع میں وہ حدیث و فقہ کی طرف زیادہ مائل تھا ۔ اسی سلسلے کی مشغولیت
میں حماد بن سلمہ کے یہاں حاضر تھا اور اس کی املا کرائی ہوئی ایک حدیث رسول
لکھ رہا تھا جس کی عبارت یہ تھی " لیس احدٌ من اصحابی الا و ط اخذت
علیہ لیس ابا الدرداء " ۔ سیبویہ بول پڑا " لیس ابو الدرداء " ہونا
چاہیے تو اس پر حماد نے کہا کہ دیکھو سیبویہ تم غلطی کر رہے ہو " لیس ابا الدرداء "
ہی صحیح ہے ۔ استاذ کی اس تلقین کا سیبویہ کی علمی زندگی پر بڑا اثر پڑا اور اس نے
یہ عہد کر لیا کہ وہ ان قواعد و ضوابط کو سیکھے گا جن کی مدد سے غلطیاں درست
ہو جائیں[۴] یہ واقعہ نحوی علم کی تحصیل میں سرگرم عمل ہونے کا محرک خاص بنا اور
بصری مکتبہ فکر کے اہم ترین نمائندہ خلیل بن احمد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا
مزید برآں یونس اور عیسیٰ بن عمر جیسے قابل نحویوں سے بھی استفادہ کرتے ہوئے
اپنے کشکول علمی کو بھرنے میں پیش پیش رہا ۔

چونکہ خلیل بن احمد دبستان بصرہ کے ایک نامور استاذ اور اس دبستان کے

رکین تھے اس لیے علم نحو کے شائقین موصوف کے پاس رہے اور بحیثیت
مذہ رفاقت اختیار کرنے کو باعث اعزاز و افتخار سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے
بے شمار علم کے پیاسوں نے علم و فکر کے اس ابلتے ہوئے چشمے سے سیرابی حاصل
نضر بن شمیل، علی بن نصر الجھضمی اور مورج السدوسی کا شمار وقت کے ان
ز علماء لغت و نحو میں ہوتا ہے جنھوں نے عربی زبان و ادب پر بڑا احسان کیا ہے
ان تمام میں ممتاز اور نمایاں سیبویہ تھا جو میدان نحو کا عظیم شہسوار ثابت ہوا[۵]

تاب - نحو کی ایک شاہکار تالیف :

یہ بات ذہن نشیں - - - - - - - - - - - - - - - - -
ی چاہیے کہ عرب علماء قابل قدر و احترام انھیں مصنفین کو قرار دیتے ہیں جنھوں نے
ی عمر پائی ہو۔ سیبویہ کے فضل و کمال اور حذاقت و مہارت کا اندازہ لگانے کے لیے
سند کافی ہے کہ کم عمر پانے کے باوجود اس کی تصنیف شرف قبولیت سے ہمکنار
ئی۔ اس نے علوم عربیہ میں وسعت مطالعہ کا نچوڑ ایک ایسی تصنیف میں پیش
ہے جو قدیم تذکرہ نویسوں کے بقول ایک ہزار اوراق پر مشتمل ہے اور یہ بات
ی قابل ذکر ہے کہ دبستان بصرہ کی جو علمی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں اُسے ہمیشہ
ں نحو کے مطالعے میں بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے[۶]

درحقیقت بات یہ ہے کہ اس کتاب کا نام بذات خود سیبویہ نے نہیں رکھا
ں کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سیبویہ نے اپنے منظم ارادے کے تحت اسے پایۂ تکمیل
ک نہ پہنچایا ہو اور اس کی موت واقع ہو گئی ہو۔ علی نجدی نے بھی اس امکان کا
ظہار کیا ہے کہ اس کتاب کی تزئین و آرائش سے متعلق دوسرے مباحث کا نقشہ
ہن میں رہا ہو گا اور اس نے یہ سوچا ہو گا کہ اس سے فراغت کے بعد ہی نام رکھا
ئے گا۔ بس اس کی تائید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ اس نے کسی کو پڑھ کر

سنایا نہیں اور نہ ہی اس کے سامنے کسی نے پڑھا۔[۸]

بہر حال اس کی موت کے بعد ہی علماء کے اتفاق رائے سے اس کتاب
"کتاب" رکھا گیا اور اس کے ساتھ کوئی صفت یا اضافت نہیں تھی۔ پھر بعد میں
علماء "الکتاب" کے نام سے معروف ہوگئی تاکہ دوسری کتابوں میں اور سیبویہ کی
کتاب میں فرق و امتیاز روا رکھا جا سکے۔[۸] اس کتاب کے اندر نہ ہی مقدمہ ہے
خاتمہ۔ یہاں تک کہ ترتیب وغیرہ کا بھی لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا آغاز کلمہ
سے ہوا ہے اور اختتام "علماء بنو فلان" نامی باب پر۔[۹] مقدمہ، خاتمہ اور ترتیب
ہونے کے باوجود عربوں نے ہمیشہ اسے عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا
کہ صاحب "الکامل" نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ علوم میں کوئی کتاب جو اس کے
اب تک منظر عام پر نہیں آئی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دوسرے علوم کی تمام
دوسری کتابوں کی محتاج ہوتی ہیں اور سیبویہ کی کتاب دوسری تمام کتابوں سے
ہے۔[۱۰] علی نجدی اس کتاب کا تعارف ان عبارتوں میں کراتے ہیں۔ کان کتاب سی
فی النحو کان هو وحده الحقیق فی ـــ ایهم ان یسمیٰ بالکتاب اما غی
فلا ینبغی ان یسمیٰ به الا علی ضرب من التجوز او المجاملة۔

ترجمہ: لوگوں کے خیال میں سیبویہ کی کتاب ہی حقیقی معنوں میں نحو کی کتاب ہے جو ا
سے موسوم ہے۔ اس کے علاوہ کسی بھی کتاب کو الکتاب کے نام سے موسوم نہیں
جانا چاہیے۔

الکتاب ہی صرف نحو کی کتاب ہے در اصل ایسا نہیں ہے۔ ہاں اس کے عن
وسعت اور نحو کے باب میں ہمہ گیریت کو پیش نظر رکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس
اس کے مثل کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ وسعت معلومات کے لیے ہر شخص مجبور
وہ اس کتاب کی طرف رجوع کرے۔ یہاں ہم اس کتاب کے مقام و مرتبہ سے متعل

...لی بحث نہیں کرنا چاہیے۔ اگرچہ آگے چل کر موقعہ آئے گا کہ علماء عظام اور خود
...ے کے ہمعصر ساتھیوں کے بیانات کی روشنی میں اس کتاب کی وقعت واضح کی جائے
...و اس کتاب کا ایک مختصر تعارف مقصود ہے کہ دراصل یہ کتاب وہی ہے جو سیبویہ کی
...ت کے وفات کے بعد اس کے استاد الاخفش کے ذریعہ نظر ثانی شدہ ایڈیشن کی
...یں منظر عام پر آئی اور الکتاب کے پروقار نام سے معروف ہوئی۔ اس کتاب
...ہتر ابواب ہیں اور ہر باب ذیلی عناوین کے ذریعہ اس طرح شرح وبسط کے
...قہ واضح کیا گیا ہے کہ طالب العلم اکتائے بغیر نحوی ذوق تجسس کی پیاس کو
...تا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے اور علم کے اس دریا میں غوطہ زنی کرتے ہوئے گوہر
...ر حاصل کر لیتا ہے۔

...صوصیات - ایک نظر میں

اس شاہکار تصنیف کی متعدد خصوصیات ہیں جن کی بناء پر یہ کتاب پورے
...رق و مغرب میں شہرت واحترام کی شاہراہ پر آ کھڑی ہوئی۔ یہاں چند خوبیوں کا
...رہ ناگزیر معلوم ہوتا ہے تاکہ مخاطب یا قاری اس کی اہمیت کا اندازہ کر سکے۔
... سیبویہ اس امر کو قابل ترجیح سمجھتا ہے کہ اس کی گفتگو تفصیلی ہو۔ یہی وجہ ہے
...وہ ہر باب کی ہر شق پر سیر حاصل گفتگو کرتا ہے۔ اس کے مباحث مربوط ہوتے
...، ان کے اندر کسی طرح کا اضطراب نہیں پایا جاتا۔ فقرے اس حد تک ایک
...سرے سے متعلق ہوتے ہیں گویا کہ ایک دوسرے میں پیوست ہیں ان خوبیوں
...بناء پر سامع یا قاری کے سامنے کوئی گوشہ تشنۂ توضیح نہیں رہتا اور پھر دوسرے
...ئلے پر گفتگو کا آغاز ہوتا ہے۔
: کہیں وقفہ یا ٹھہراؤ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ قاری خاتمہ باب تک پہنچ جائے۔
...سی نئے باب کو موضوع بحث بنانے کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

وا علم ان الامر کن اوکذا۔ کہہ کر صاحب کتاب باخبر اور ہوشیار کرنا چاہتے ہیں کہ گفتگو کے نئے مرحلے سے سابقہ پیش آرہا ہے۔

۳:- اس کی عبارتوں میں اس لحاظ سے تفاوت ہے کہ کہیں وہ صبح درخشاں کے مثل بیّن اور واضح ہیں اور کہیں وہ طلسماتی بن کر رہ جاتی ہیں جہاں عقل حیران ہو جاتی ہے اور قاری عاجز و درماندہ رہ جاتا ہے۔

۴:- بہتیرے الفاظ ایسے ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے دوسرے توضیحی الفاظ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مبرد کا شاگرد رشید ابن کیسان کہتا ہے۔ سیبویہ کی کتاب پر غور و خوض کے بعد پایا کہ وہ شایان شان مقام پر ہے۔ نیز اس کے الفاظ دوسرے الفاظ کے محتاج ہوتے ہیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ یہ کتاب اس وقت منظر عام پر آئی ہے جبکہ تصنیف و تالیف کے میدان میں الفاظ کے استعمال کا یہی طریقہ مروج تھا۔ سیبویہ نے بھی دوسروں کا خیال کرکے اپنی تالیف میں یہ نہج اختیار کیا۔

مذکورہ بالا چوتھی اور پانچویں باتیں بظاہر کسی بھی کتاب کی قدر و قیمت کے خلاف نظر آتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انداز تصنیف و تالیف کے نقص پر دلالت نہیں کرتا اور نہ ہی کسی عیب یا خامی کی نشاندہی پر۔ بلکہ کہیں شرح و بسط اور کہیں ایجاز و اختصار سے کام لینا، کہیں غموض و ابہام اور کہیں وضاحت و تبئین کا طریقہ اختیار کرنا، مؤثر اور دلنشین پیرایۂ بیان کا ایک تقاضا ہے۔

ابن قتیبہ مختلف اسالیب بیان میں قرآن کے خطاب کرنے کو اس کی عظمت کی دلیل مانتے ہیں اور عرب خطیبوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ عرب کا خطیب جب گھر میں یا بازار میں، نکاح کی مجلس میں یا جنگ کے میدان میں تحریض و ترغیب کے لیے یا صلح و مصالحت کی خاطر تقریر کیا کرتا تھا۔ تو وہ ہر موقع پر ایک ہی وادی میں نہیں بھٹکتا تھا بلکہ مواقع کی مناسبت سے مختلف انداز خطاب

اختیار کرتا تھا۔ اگر وہ تخفیف کا ارادہ کرتا تو مختصر کہتا، افہام وتفہیم کا قصد کرتا تو طوالت سے کام لیتا، جب کسی بات کو مؤکد کرنا چاہتا تو تکرار سے کام لیتا، کبھی غموض وابہام کا سہارا لیتا اور کبھی بالکل ہی کھول کھول کر بیان کر دیتا۔[۱۱]

علی بن سلیمان الاخفش کہتے ہیں۔

"عمل سیبویہ کتابہ علی لغۃ العرب وخطبھا وبلاغتھا فجعل فیہ بیّناً مشروحاً، وجعل فیہ مستبھماً، لیکون عن استنبط ونظر فضل وعلی ھٰذا خاطبھم اللّٰہ عز وجل بالقرآن"۔[۱۲]

ترجمہ: سیبویہ نے اپنی کتاب میں مباحث کے افہام وتفہیم کا کام زبان عرب، ان کے خطبوں اور ان کی بلاغت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ہے۔ کہیں اس نے شرح و بسط سے کام لیا ہے تو کہیں غموض وابہام سے۔ ایسا اس لیے کیا ہے تاکہ نتائج کا استنباط کرنے والوں اور تدبر وتعمق کی نگاہ سے دیکھنے والوں کا فضل و برتری نمایاں ہو۔ اور اسی طریقے پر اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن پاک میں ان کو خطاب کیا۔

چنانچہ ایضاح وابہام، ایجاز واختصار اور تقدیم وتاخیر وغیرہ ایسی صفات ہیں جو دوران تالیف وتصنیف مناسب ہی نہیں اتنا ہی ناگزیر ضرورت کے طور پر ہیں۔ یہ انداز مصلحت وحکمت کے تحت گفتگو کو دل نشیں بنانے کے لیے کسی بھی مؤلف اور مصنف کا سرمایہ ہے جس کی ضرورت کلام میں زیر وبم، اتار چڑھاؤ اور فصاحت وبلاغت پیدا کرنے کے لیے پڑتی ہے اور اس سے مطالعہ کرنے والوں کو بھی شیرینی کی لذت ملتی ہے۔

سیبویہ — الکتاب کے آئینے میں:

کسی بھی تصنیف وتالیف کی شہرت ومقبولیت میں جہاں معلومات کی وسعت اور موضوعات کے تنوع کا رول ہوتا ہے وہاں دلنشین پیرایۂ بیان بھی اپنا نمایاں

مقام رکھتا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک ناگزیر ضرورت یہ ہے کہ صاحب تصنیف کے سلسلے میں مطالعہ کے دوران یہ خیال نہ ہو کہ وہ گوشہ نشیں ہو گیا ہے۔ مطالعہ کرنے والوں کا یہ احساس ایک طرف تو اس کے نقص پر دلالت کرتا ہے اور دوسرے یہ کہ عدم موجودگی کا یہ تصور ان پر وہ اثر پیدا نہیں کرتا جو کسی کے ہمہ وقت موجود رہنے کے احساس سے پیدا ہوتا ہے۔ سیبویہ اپنی اس عجوبۂ روزگار تصنیف میں ہر وقت نمایاں رہتا ہے۔ اس کتاب کے اندر سیبویہ کی شخصیت کی ترجمانی کن کن پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ یہاں مختصراً ان کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱:- وہ ایک لمحہ بھی اپنی کتاب میں گمنام نہیں ہے۔ ڈاکٹر علی نجدی ناصف کے بقول وہ شہد کی مکھی کے مثل نہیں ہے جو مختلف پھولوں، باغوں اور کھیتوں کے پھلوں سے رس چوس کر جمع کرتی ہے اور وہ نہیں جانتی کہ ایسا کیوں کرتی ہے ہاں اسے صرف جمع و ادخار سے مطلب ہوتا ہے[۱۶]

۲:- فی الحقیقت وہ ہر جگہ مطالعہ کرنے والوں کی رہنمائی کے لیے حاضر رہتا ہے یہاں تک کہ آثار علماء کی آراء اور قاریوں کی قراءتوں کے ذکر کے وقت بھی روپوش نہیں ہوتا ہے۔ اگر چہ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ نری روح موجود ہے اور ایک آواز ہے جو کہہ رہی ہے تاہم یہ مستحضر رہے کہ اس کی شخصیت ان آثار و آراء کے پشت میں موجود ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں بھی وحشت اور تنہائی کا احساس نہیں ہوتا[۱۷]

۳- اپنی کتاب میں وہ لائق اور محبوب استاذ نظر آتا ہے۔ ادعانہ انداز سے احتراز کرتا ہے۔ اس کی طبیعت کبھی آمادہ نہیں ہوتی کہ محض وہ کہتا جائے اور سامعین سنتے چلے جائیں بلکہ وہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ زیر بحث موضوع سے متعلق

تمام گوشوں کو واضح اور روشن کردیے۔ مختلف جہتوں سے وہ اپنی باتیں قارئین کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتا ہے اور اسی مقصد کے تحت وہ بسا اوقات اعادہ و تکرار سے کام لیتا ہے۔ چنانچہ ایک قاری اسے شفیق استاذ محسوس کرتا ہے اور ہمہ تن گوش ہوکر اخذ و استفادہ کرکے اپنی جھولیوں کو بھر لیتا ہے۔

۴:۔ بیباک متکلم اور ناقد کی حیثیت سے بھی اس کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے۔ کہیں پر بھی پس و پیش اور شکوک و شبہات کا شکار نہیں ہوتا ہے۔ افہام و تفہیم میں تصنع اور تکلف کا لبادہ زیب تن نہیں کرتا ہے بلکہ انتہائی دیانتداری کے ساتھ اور حقیقت بینی کو اپنا شیوہ و شعار بناتے ہوئے مسائل کی توضیح و تشریح کرتا ہے اور کسی سے متاثر ہوئے بغیر نقد و تنقید کا بیڑا اٹھاتا ہے مثلاً وہ اپنے استاذ خلیل کی ایک روایت نقل کرتا ہے۔

"زعم الخلیل انہ یجوز ان یقول الرجل: ھٰذا رجل اخو زید اذا اردت ان تشبھہ بأخی زید"[۱۵]

سیبویہ اپنے استاذ خلیل کی اس رائے سے شد و مد کے ساتھ اختلاف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس تعبیر کے اندر ضعف اور قباحت ہے۔ ایسا کرنا صرف حالت اضطرار ہی میں جائز ہو سکتا ہے۔

۵:۔ اپنے قاریوں کے لیے وہ ایک مفسر اور شارح ثابت ہوتا ہے۔ جب کبھی کبھی مسائل ایک دوسرے سے ملتبس ہو جایا کرتے ہیں فروق و امتیازات آپس میں متضاد ہو جاتے ہیں تو قاری کو الجھ کر حیرت و استعجاب کا شکار ہو جانا پڑتا ہے لیکن وہ خود ہی مسائل کو ایک دوسرے سے واضح طور پر الگ کر دیتا ہے اور اس طرح قاری کے اضطراب اور حیرت و تعجب کو حذق و مہارت کے ساتھ رفع کرتا ہے اور جوابات دے کر مطمئن کرتا ہے۔

الکتاب کی شروح و تعلیقات:

جیوں ہی یہ کتاب تہذیب و نظر ثانی کے بعد منظر عام پر آئی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اس کی مقبولیت کا ایک بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ وقت کے چوٹی کے جتنے علماء تھے تقریباً تمام ہی لوگوں نے کسی نہ کسی حیثیت سے الکتاب سے رشتہ جوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ الکتاب کی بیشمار شرحیں لکھی گئیں اور دبستان بصرہ کا شاید ہی کوئی ایسا عالم ہو گا جس نے الکتاب پر حواشی نہ لکھے ہوں یا اس کے مضامین میں اضافہ نہ کیا ہو[16] ذیل میں اس کتاب کے شارحین کی ایک فہرست دی جا رہی ہے۔

(۱) ابوسعید حسن بن عبداللہ جو سیرافی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی شرح لکھی۔ انتقال ۳۶۸ھ میں ہوا۔

(۲) سیرافی کے صاحبزادے یوسف نے بھی شرح لکھی۔ اس کا انتقال ۳۸۵ھ میں ہوا۔

(۳) تیسری شرح ابوجعفر احمد بن محمد النحاس النحوی نے لکھی اور اس میں انھوں نے سیبویہ کی الکتاب کے نحوی شواہد پر بھی بحث کی۔ انتقال ۳۳۸ھ میں ہوا۔

(۴) چوتھی شرح ابوالعباس محمد بن یزید جو مبرد کے نام سے معروف ہیں، نے لکھی اور سیبویہ کے نحوی شواہد پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے ۲۸۵ھ میں وفات ہوئی۔

(۵) احمد بن ابان اللغوی الاندلسی نے بھی اس کی ایک شرح لکھی ہے۔ انتقال ۳۸۲ھ میں ہوا۔

(۶) ابراہیم ابن سفیان الزیادی المتوفی ۲۴۹ھ کی شرح۔

(۷) علی ابن سلیمان کی شرح جو اخفش الاصغر سے معروف ہیں۔

(۸) ابن السراج (ابوبکر) محمد بن السری (البغدادی) کی شرح۔ ان کا انتقال

۳۱۶ھ میں ہوا۔

(۹) ابو عمر عثمان بن عمر المالکی کی شرح۔ یہ ابن حاجب نحوی کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کی موت ۶۴۶ھ میں واقع ہوئی۔

(۱۰) علامہ جار اللہ ابو قاسم محمود بن عمر الزمخشری کی شرح جن کا انتقال ۵۳۸ھ میں ہوا۔[۱۴]

علی نجدی ناصف نے بھی شارحین "الکتاب" کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ علماء اندلس جنھوں نے اس کی شرح پر کام کیا ہے ان میں بلند پایہ شارحین مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ابو بکر محمد بن الحسن الزبیدی الاشبیلی المتوفی ۳۷۹ھ (۲) ابو نصر ہارون بن موسیٰ القرطبی المتوفی ۴۰۱ھ (۳) یوسف بن سلیمان الشنتمری جو الاعلم کے نام سے معروف ہیں اور جن کا انتقال ۴۷۶ھ میں ہوا (۴) ابوالحسن علی بن احمد جو ابن باذش الغرناطی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وفات ۵۲۸ھ میں ہوئی۔ (۵) ابو بکر محمد بن مسعود الخشنی المتوفی ۵۴۴ھ (۶) محمد بن احمد ابن ہشام اللخمی السبتی المتوفی ۵۵۷۔ (۷) ابوالحسن علی بن محمد جو ابن خروف کے نام سے معروف ہیں۔ ۶۰۶ھ میں انتقال ہوا۔

مشرقی ممالک میں جنھوں نے الکتاب کی شرح لکھی چند نام حسب ذیل ہیں:

(۱) ابو عثمان بکر بن محمد المازنی المتوفی ۲۴۸ھ (۲) ابو اسحاق ابراہیم السری الزجاج۔ متوفی ۳۱۱ھ (۳) ابو علی الحسن بن احمد الفارسی المتوفی ۳۷۷ھ (۴) ابوالحسن علی بن عیسیٰ الرمانی المتوفی ۳۸۴ھ

مصری علماء جنھوں نے شرح لکھی یا کچھ اضافہ کیا۔

(۱) ابو عبدالغنی سلیمان بن بنین الدقیقی المتوفی ۶۱۴ھ (۲) ابن الحاجب عثمان

بن علی المتوفی ۶۴۶ھ

ان شرحوں کے علاوہ کچھ تعلیقات لکھی ہیں جو علمار اندلس اور مشرق کی ہیں

(۱) ابوالحسن سلیمان بن محمد الاشبیلی جو ابن الضائع سے جانے جاتے ہیں۔

۶۸۰ھ میں انتقال ہوا۔

(۲) سلیمان بن محمد المالقی جو ابن الطراۃ سے معروف ہیں اور جن کا انتقال

۵۲۸ھ میں ہوا۔

مشرق میں ابو محمد عبیداللہ بن محمد بن ابی بردۃ نے بھی تقریظ لکھی نیز مصر

احمد بن محمد بن ولاد نے بھی "الکتاب" کی تقریظ لکھی ہے۔ ۳۳۲ھ میں انتقال کر

تجرید و اختصار کی بھی کچھ لوگوں نے ذمہ داری انجام دی ہے۔ اس سلسلے میں ابوجـ

محمد بن یوسف کا نام آتا ہے جو اندلس کے رہنے والے تھے۔ ان کا انتقال ۵۴

میں ہوا۔ اور ابراہیم بن محمد الیمینی نے اس کتاب کے احکام کو موخر اور مختصر بنا کر

پیش کیا ہے۔

جن لوگوں نے اسے یاد کرلیا اور اس میں تخصّص کیا وہ علمار غرب اور علمار شر

دونوں ہیں۔

علمار غرب میں ابوالقاسم ابراہیم بن عثمان القیروانی المتوفی ۳۴۶ھ ۔

ابوالقاسم حلف بن یوسف الاندلسی الشنتریتی المتوفی ۵۳۲ھ، ابوعامر بن

عبداللہ بن یحییٰ الاشبیلی المتوفی ۵۶۰ھ، محمد بن حجّاج الاشبیلی (جو ابن المطرفی کے

نام سے مشہور ہیں) المتوفی ۶۰۷ھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ اور علمار مشرق میں ابوبکر

عبیداللہ الخباط الاصبہانی اور ابراہیم بن مسعود المتوفی ۵۹۰ھ کے نام ملتے ہیں

سیبویہ کی "الکتاب" سے متعلق لکھی گئی مندرجہ بالا تمام شرحیں، تقریظات

اور تجریدات اس امر کی شہادت فراہم کرتی ہیں کہ وقت کے مشہور ترین علمار اور

[اد]بار کا کسی نہ کسی جہت سے اس کتاب سے تعلق قائم رہا ہے۔ بلکہ اگر شرح و [ت]علیقات کے اس ذخیرہ کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ طبقۂ علماء [نے] اس کتاب سے کسی طرح کا بھی تعلق قائم رکھنا باعث شرف و افتخار [سمج]ھا اور نحوی معاملات میں مرجع کا مقام دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر خدیجہ الحدیثی نے اپنی [ک]تاب کتاب سیبویہ وشروحہ (صفحہ ۱۲۷ تا ۱۳۵) میں ذکر کیا ہے "کتاب سیبویہ کے [گ]یارہ قلمی نسخے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی دو درجن [س]ے زائد شروح لکھی گئیں، دو درجن تعلیقات وحواشی اور پانچ استدراکات تصنیف [ک]یے گئے۔"[19]

[ع]لماء اور ادباء کے تاثرات قلبی

اگرچہ اس کتاب کی خصوصیات، اس میں سیبویہ کی شخصیت کی جھلکیاں اور [ا]س کی شروح وتعلیقات کی روشنی میں اس کے مقام کی تعیین کرنا مشکل نہیں ہے۔ [ت]اہم اس حقیقت کے اعتراف سے راہ فرار اختیار نہیں کی جاسکتی کہ اسی [ک]تاب سے متعلق ممتاز ترین علماء اور ادباء کے خیالات بھی اس کی اعلیٰ وارفع [پ]وزیشن کو تسلیم کرانے میں قابلِ ذکر محرک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا چند علماء و [ا]دباء کے تاثرات قلبی کا اظہار کیا جانا مناسب ہے۔

سب سے پہلے امام جاحظ کی ایک روایت نقل کی جاتی ہے جس سے ایک [ط]رف تو جاحظ کی نظر میں جو اس کی قدر ومنزلت ہے وہ سامنے آتی ہے اور دوسری [ط]رف محمد بن عبد الملک کا تاثر یہ بتاتا ہے کہ فی الحقیقت یہ ایک بیش قیمت سرمایہ ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے ایک بار محمد بن عبد الملک کے یہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اس موقعہ پر ہدیہ میں پیش کرنے کے لیے جو سب سے قیمتی چیز ملی وہ سیبویہ کی کتاب تھی، تو [م]یں نے ان سے کہا کہ میں ایک ایسی چیز ہدیہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے مقابلے میں

اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے، اور وہ ہے ایک کتاب جسے فراء کی میراث میں سے خریدی ہے۔ تو اس پر محمد بن عبدالملک نے کہا "مجھے اس سے زیادہ قیمتی چیز ہدیہ نہیں کی گئی۔"[۲۰]

کوئی شخص جو اس کتاب کے پڑھنے کا مشتاق ہوتا اور مبرد کی طرف رجوع کرتا تو وہ اس سے پوچھتا "کیا تم نے کبھی سمندر کا سفر کیا ہے؟ یعنی یہ کتاب سمندر کی طرح وسیع پر ہول اور مشکل ہے[۲۱]

ابو سعید الحسن بن عبداللہ کہتے ہیں "وعمل کتابہ الذی لم یسبقہ الی مثلہ أحد قبلہ ولم یلحق بہ من بعدہ"۔[۲۲]

امام زمخشری نے سیبویہ اور اس کی کتاب کی اہمیت یوں ذہن نشین کرائی

الا صلّی الالہ صلاۃ صدق ۔ علی عمرو بن عثمان بن قنبر
فان کتابہ لم یغن عنہ ۔ بنو قلم ولا ابناء منبر۔[۲۳]

ابن خلکان کی وفیات میں ہے کہ سیبویہ کی کتاب اس کی شہرت اور فضیلت کی وجہ سے علم کے طور پر جانی گئی۔ بصرہ میں جب بھی کہا جاتا کہ فلاں نے الکتاب پڑھی تو یہی جان لیا جاتا کہ وہ سیبویہ کی کتاب ہے۔ اور اسی طرح اگر یہ کہا جاتا کہ فلاں نے الکتاب کی قرأت کی تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ سیبویہ کی کتاب ہے[۲۴]

فہرست ابن ندیم میں المازنی کا قول ہے "من اراد ان یعمل کتابا کبیرا فی النحو بعد کتاب سیبویہ فلیستحی"[۲۵]

معجم الادباء میں صاعد بن احمد الجیانی کہتے ہیں کہ انھوں نے اہل اندلس کا اپنی کتاب میں ذکر کیا۔ مجھے کسی ایسی کتاب کا علم نہیں (خواہ قدیم علوم میں ہو یا جدید میں) جو تمام ہی علوم پر مشتمل ہو اور اس فن کے اجزاء کا پورے طور پر احاطہ کیا گیا ہو

لیکن تین ایسی کتابیں ضرور ہیں جو ان اوصاف کی حامل ہیں۔ علم ہیئت کے سلسلے میں (۱) بطلیموس کی کتاب المجسطی۔ (۲) علم منطق میں ارسطو کی کتاب (۳) اور نحو میں سیبویہ کی کتاب۔

جناب کلمنٹ ہارٹ اس کتاب کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں:

THIS KITAB WAS FAMOUS ALL OVER THE EAST AND HAS REMAINED THE GREAT AND FAVOURIT[E] AUTHORITY. NO OTHER WORK HAS BEEN ACKNOWLEDGED ITS EQUAL [26]

یہ کتاب پورے مشرق میں مشہور و معروف تھی۔ اور عظیم المرتبت اور منظور نظر سند کی حیثیت سے برقرار رہی۔ اس کے ہم پلّہ کبھی بھی دوسرے کام کو نہیں جانا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی زبان میں لکنت تھی اس کا اعتراف ابوبکر الزبیدی نے بھی اپنی کتاب میں "وکان فی لسانہ حبسۃ" کے الفاظ سے کیا ہے۔ [۲۷] چنانچہ اس کے زبان کی اس معذوری کے پیش نظر اگر اس کے قلم کی تعریف کی جائے اور فصاحت و بلاغت سے پُر اس کی شاہکار تصنیف کا دقت نظری سے مطالعہ کیا جائے تو اس حقیقت کے اعتراف سے راہ گریز اختیار کرنے کی نوبت نہیں آئے گی کہ الکتاب کا ایک ایک صفحہ نحوی فکر و نظر کی گیرائی و گہرائی کے ساتھ ساتھ اس کے زور بیان اور دلکش انداز تحریر کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اسی زور قلم کا ثمرہ ہے کہ وہ اول شخص ہے جس نے علم نحو کو پھیلا کر بیان کیا اور اس سے متعلق باریکیوں اور نزاکتوں کی شرح و بسط کے ساتھ عقدہ کشائی کی خدمت انجام دی۔ [۲۸]

علی النوری ناصف جنھوں نے سیبویہ پر امام النحاۃ کی حیثیت سے ریسرچ کیا ہے

وہ اپنی کتاب کے آغاز میں لکھتے ہیں کہ سیبویہ نے نحو کے میدان میں ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ اس کے سامنے تمام نحوی کاوشیں عاجز و درماندہ نظر آتی ہیں۔ اس کی کتاب عربی زبان و ادب کا معیاری نمونہ ہے۔ چنانچہ یہ زبان کے قیمتی سرمایوں میں ایک سرمایہ ہے۔ ندمار نے اس کے فضل و برتری کے پیش نظر ائمہ لغت کے مقام پر فائز کر دیا ہے۔[۷]

ان چند صفحات میں سیبویہ اور اس کی کتاب کے متعدد مباحث کا مطالعہ اس کی لیاقت و استعداد، حذق و مہارت اور بالخصوص نحو کی دنیا میں اس کے اثر و رسوخ کو تشنۂ توضیح نہیں چھوڑتا۔ علوم و فنون کی مختلف شاہراہوں پر گامزن رہنے کے باوجود اس نے جس وسعت مطالعہ اور دقت نظری کا ثبوت دیا ہے اس سے انکار و انحراف کرنا ایک بڑی خیانت ہوگی۔ الکتاب اسی دبستان بصرہ کی چوٹی کی شخصیت کے عمق مطالعہ اور وسعت فکر و نظر کا ایک شاہکار ترجمان ہے جو اپنے موضوع پر آپ ہی مثال ہے۔ جب تک زبان عربی کے سیکھنے سکھانے کا غلغلہ بلند رہے گا یہ کتاب رہنما بنائی جاتی رہے گی اور جب تک عربی زبان باقی رہے گی اس کے مؤلف امام البصریین سیبویہ کا نام روشن رہے گا اور دنیائے عربی کبھی بھی اپنے محسن کو فراموش نہیں کر سکے گی

مراجع و مصادر

(۱)	وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان۔ ابن خلکان ج ۳ صفحہ ۱۳۳ طبع اول قاہرہ			
(۲)	ایضاً	ایضاً	"	"
(۳)	مراتب النحویین	ابوالطیب عبدالواحد ص ۶۵		قاہرہ
(۴)	نزہۃ الالباء فی طبقات الادباء	عبدالرحمان الانباری ص ۷۲		مصر
(۵)	ایضاً	ایضاً	ایضاً	"
(۶)	اردو دائرہ معارف اسلامیہ		ص ۴۹۲	لاہور
(۷)	سیبویہ امام النحاۃ	علی نجدی ناصف	ص ۱۲۳	مصر

(۸) کتاب سیبویہ للشنتمیری ج ۱ ص ۵ طبع ثانی ۱۹۶۷ء۔ بیروت۔ لبنان
(۹) کشف الظنون مصطفیٰ بن عبداللہ ج ۲ ص ۱۴۲۷ استانبول
(۱۰) " " " " "
(۱۱) تاویل مشکل القرآن ابن قتیبہ مقدمہ
(۱۲) بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ۔ جلال الدین عبدالرحمان السیوطی ص ۳۳۸ طبع اول قاہرہ
(۱۳) سیبویہ امام النحاۃ علی نجدی ناصف ص ۱۸۰ مصر
(۱۴) " " ص ۱۸۱ "
(۱۵) " " ص ۱۸۲ "
(۱۶) اردو دائرۂ معارف ص ۴۹۲ لاہور
(۱۷) شارحین کی یہ مختصر فہرست کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۲۷ سے ماخوذ ہے۔
(۱۸) یہ فہرست علی نجدی ناصف کی کتاب سیبویہ امام النحاۃ ص ۱۸۸۔۱۸۷ سے ماخوذ ہے۔
(۱۹) اردو دائرۂ معارف ص ۴۹۳ لاہور
(۲۰) تاریخ بغداد، ابوبکر احمد بن خطیب البغدادی ج ۱۲ صفحہ ۱۹۶ ۱۹۳۱ء مصر
نیز وفیات الاعیان ج ۳ صفحہ ۴۸ پر بھی ملاحظہ فرمائیں۔
(۲۱) تاریخ ادب عربی۔ احمد حسن زیارت (ترجمۂ اردو) صفحہ ۳۱۹ طبع اول لاہور
(۲۲) اخبار النحویین والبصریین۔ ابوسعید الحسن بن عبداللہ ص ۴۸ بیروت
(۲۳) کتاب سیبویہ للشنتمیری ج ۱ ص ۵ طبع ثانی ۱۹۶۷ء۔ بیروت، لبنان
(۲۴) وفیات الاعیان بحوالہ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۴۲۷
(۲۵) الفہرست۔ ابن الندیم ص ۸۶ مصر
(۲۶) A HISTORY OF ARABIC LITERATURE. BY. K. A. Fariqe
P. 1972 - DELHI
(۲۷) کتاب المختصر من تاریخ النحویین۔ ابوبکر الزبیدی ص ۱۲۱
(۲۸) الاعلام۔ قاموس تراجم۔ ج ۵ ص ۸۱ بیروت۔ لبنان
(۲۹) سیبویہ امام النحاۃ۔ مقدمہ کا ص ۲ ملاحظہ فرمائیں۔

خلافت عباسیہ اور ہندوستان
از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری
ہندوستان میں ۱۱۵ سالہ عباسی دورِ خلافت کے غزوات وفتوحات اور
اہم واقعات وحادثات، عباسی امرار وحکام کے ملکی وشہری انتظامات،
عرب وہند کے درمیان گوناگوں تجارتی تعلقات، بحر بصرہ کے تحت
بحری امن وامان کا پیام، ہندی علوم وفنون اور علمائے اسلام اور ہندی
موالی ومالک وغیرہ مستقل عنوانات پر نہایت مفصل ومستند معلومات
پیش کی گئی ہیں نیز یہاں کے مسلموں وغیر مسلموں کے عالم اسلام سے
فکری وعلمی اور تہذیبی روابط کی تفصیلات درج ہیں جس سے معلوم ہوتا
ہے کہ عباسی خلفار امرار نے پہلی بار افسانوی ہندوستان کو دنیا کے
سامنے حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے
قیمت غیر مجلد چالیس روپے
مجلد عمدہ رنگین پچاس روپے
ندوۃ المصنفین، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ [illegible]۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت
تاریخ صقلیہ، تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند [illegible]
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء — ترجمان السنہ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) [illegible]
سیاسی معلومات جلد دوم، خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب [illegible]

۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات [illegible]

۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب [illegible]

۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹-۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے [illegible]
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں، معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک

۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم، تاریخ ردہ، [illegible] ضلع بجنور۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں۔
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر، ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم، [illegible]۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء — ترجمان السنہ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین، دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء — حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج، خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب، [illegible]
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

یادگار حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

نگرانِ اعلیٰ حضرت مولانا حکیم محمد زماں حسینی

مدیرِ اعزازی
قاضی اطہر مبارکپوری

مرتب
عمید الرحمٰن عثمانی

مطبوعات ندوۃ المصنفین دہلی

سنہ ۱۹۳۹ء اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ اسلام کا اقتصادی نظام۔ قانونِ شریعت کے نفاذ کا مسئلہ۔ تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت۔

سنہ ۱۹۴۰ء غلامانِ اسلام۔ اخلاق و فلسفۂ اخلاق۔ فہم قرآن۔ تاریخ ملت حصہ اول "نبی عربی صلعم"۔ صراط مستقیم (انگریزی)

سنہ ۱۹۴۱ء قصص القرآن جلد اول۔ وحی الٰہی۔ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات حصہ اول۔

سنہ ۱۹۴۲ء قصص القرآن جلد دوم۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع دوم بڑی تقطیع مع ضروری اضافات) مسلمانوں کا عروج و زوال۔ تاریخ ملت حصہ دوم "خلافتِ راشدہ"۔

سنہ ۱۹۴۳ء مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ جلد اول۔ اسلام کا نظامِ حکومت۔ سرلیہ۔ تاریخ ملت حصہ سوم "خلافتِ بنی امیہ"

سنہ ۱۹۴۴ء قصص القرآن جلد سوم۔ لغات القرآن جلد دوم۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت (کامل)

سنہ ۱۹۴۵ء قصص القرآن جلد چہارم۔ قرآن اور تصوف۔ اسلام کا اقتصادی نظام (طبع سوم جس میں غیر معمولی اضافے کئے گئے)

سنہ ۱۹۴۶ء ترجمان السنہ جلد اول۔ خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ۔ جمہوریہ یوگوسلاویہ اور مارشل ٹیٹو۔

سنہ ۱۹۴۷ء مسلمانوں کا نظمِ مملکت۔ مسلمانوں کا عروج و زوال (طبع دوم جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے اور متعدد ابواب بڑھائے گئے ہیں) لغات القرآن جلد سوم۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ۔

سنہ ۱۹۴۸ء ترجمان السنہ جلد دوم۔ تاریخ ملت حصہ چہارم "خلافتِ ہسپانیہ"۔ تاریخ ملت حصہ پنجم "خلافتِ عباسیہ اول"

سنہ ۱۹۴۹ء قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات (حکمائے اسلام کے شاندار کارنامے (کامل) تاریخ ملت حصہ ششم "خلافتِ عباسیہ دوم" بصائر۔

سنہ ۱۹۵۰ء تاریخ ملت حصہ ہفتم "تاریخ مصر و مغربِ اقصیٰ"۔ تدوینِ قرآن۔ اسلام کا نظامِ مساجد۔ اشاعتِ اسلام (یعنی دنیا میں اسلام کیونکر پھیلا۔

سنہ ۱۹۵۱ء لغات القرآن جلد چہارم۔ عرب اور اسلام۔ تاریخ ملت حصہ ہشتم "خلافتِ عثمانیہ"۔ جارج برنارڈشا۔

سنہ ۱۹۵۲ء تاریخ اسلام پر ایک طائرانہ نظر۔ فلسفہ کیا ہے؟ جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد اول (جس کو ازسرِ نو مرتب اور سیکڑوں صفحوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ کتابتِ حدیث۔

سنہ ۱۹۵۳ء تاریخ مشائخ چشت۔ قرآن اور تعمیرِ سیرت۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ۔

برہان

جلد ۱۰۱ | شوال المکرم ۱۴۰۸ھ مطابق جون ۱۹۸۸ء | شمارہ ۶

...الرحمٰن عثمانی پرنٹر پبلشر نے جمال پریس حیتہ شیخ منگو میں چھپوا کر
دفتر برہان اردو بازار دہلی سے شائع کیا

نظرات

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر کے اس پورے علاقے میں دین و شریعت کا جو کچھ چرچا دکھائی دیتا ہے اور اس کی جو کچھ چہل پہل دکھائی دیتی ہے یقیناً یہ سب کچھ اولیائے عظام، علمائے اسلام، مبلغین کرام، بزرگان دین، سلفِ صالحین، مدارس اسلامیہ اور مکاتب دینیہ کی مثبت کوششوں اور کاوشوں کا ثمرہ ہے۔

خدانخواستہ ہمارے اکابر و اسلاف نے زمانے کی رفتار اور وقت کے نبض کو پہچان کر تحفظ دین و شریعت کے سلسلے میں مختلف جہات سے جد وجہد نہ کی ہوتی تو یہ حال نہ ہوتا کہ دنیا بھر کے ممالک دینی اور مذہبی اعتبار سے اس پر اطمینان کا اظہار کرتے اور ان کی ملی و دینی خدمات کو سراہتے۔

ہمارے سامنے اندلس، بخارا، قرطبہ اور تاشقند کی تاریخ ہے کہ حکومتوں کے ختم ہونے کے بعد ان مسلمان ممالک اور علاقوں کا کیا حال ہوا؟ جہاں سینکڑوں برس سے مسلمان حکمرانی کرتے آرہے تھے۔

چنانچہ کمیونزم کا سیلاب جب وہاں آیا تو وہاں کے مسلمان اور نئی اسلامی نسل کس طرح الحاد اور دہریت کے بلاخیز طوفان میں بہہ گئی اور پورا خطہ کس طرح مذہب بیزار بن گیا۔

بڑی طاقتیں (SUPER POWERS) آج بھی اس کوشش میں لگی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ برصغیر سے اسلام کا نام و نشان مٹ جائے، شریعت اسلامی کی بنیادوں کو کمزور کیا جائے، دین قیم کی چھاپ جو یہاں کے باشندوں کے دلوں پر پڑی ہے وہ ختم ہو جائے "قال اللہ وقال الرسول" کا غلغلہ باقی نہ رہے اور مجموعی طور سے مسلمان اپنی اس قابل فخر وراثت سے محروم کر دیئے جائیں جو اقوام عالم کی صفوں میں انھیں ممتاز اور مشخص کرتی ہیں۔ آخر برصغیر کے علاقوں میں اندلس اور روس کی تاریخ کیوں دہرائی نہیں جا سکتی۔ اسلام دشمن قومیں بڑی عیاری، چالاکی اور برق رفتاری کے ساتھ اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے سرگرم عمل ہیں وہ دین اسلام، اسلامی تعلیمات، مسلمانوں کے مذہبی تشخص، ملی انفرادیت اور باہمی اتحاد و اتفاق کی عظیم قوت کو ڈائنامیٹ کرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں اور فی الواقع اس کے تجربات کا سلسلہ انھوں نے شروع کر دیا ہے۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ان خطرات و خدشات کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔ مشترکہ لائحہ عمل بنا کر سوچیں اور عملی جد و جہد میں لگ کر انفرادی اور اجتماعی اصلاح کا فریضہ انجام دیں۔

یہاں یہ بات بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ مسلمان اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اس کا اپنا ایک مخصوص مذہب، ایک مخصوص تہذیب

ایک مخصوص تمدن اور ایک انفرادی تشخص ہے۔ عقائد، اعمال اور اخلاق کی تطہیر اس کی
بنیاد میں داخل ہیں۔ ملک کی تقسیم سے قبل اور اس کے بعد بھی مختلف ادوار اور اوقات
میں مسلمانوں نے اپنی جان، املاک اور عزت سے زیادہ اپنے مذہبی اور تہذیبی ورثہ
کی حفاظت کی ہے اور قانون شریعت کے تحفظ اور دفاع کے لئے قابل فخر اور قابل
قدر کردار ادا کیا ہے۔ لیکن ہمیں اس بات سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیئے کہ اب بھی
قانونِ شریعت Muslim Personal Law میں مختلف طریقوں سے
جارحانہ مداخلت کا سلسلہ جاری ہے۔

یکساں سول کوڈ (Common Civil code) کی تلوار بر قسم
مسلمانوں کی گردن پر لٹک رہی ہے۔ انکم ٹیکس کے نئے قانون کے تحت اوقاف اسلامی
کی جائداد مقصدیت کے اعتبار سے ختم کرنے سے متعلق ایکٹ پاس ہو چکا ہے۔
نئے قوانین اور عدالتی فیصلے ہو رہے ہیں اس لئے مسلمانوں کو اپنے ملی تشخص کی بقا اور
انفرادیت کو بحال رکھنے کے لئے عملی، ذہنی اور فکری اعتبار سے ہمہ دم تیار رہنا چاہیئے
جہاں تک "مشترکہ سول کوڈ" کے نفاذ کا تعلق ہے تو حکومت ہند کو ہمارا یہی
مشورہ ہے کہ وہ اس مسئلہ کے مالہ وما علیہ کا اچھی طرح جائزہ لے کر اس کے مختلف
پہلوؤں پر ہزار مرتبہ غور کرے۔ اس لئے کہ متحدہ ہندستان کی تقسیم کے بعد بھی
موجودہ ملک کا رقبہ جو بے حد وسیع وعریض ہے۔ جس میں روز اول سے اکثریتی فرقے
کے ساتھ ساتھ اقلیتی فرقے آباد ہیں۔ سب کے مذہبی جذبات و احساسات
کا خیال رکھے۔ ہمارے خیال میں ملک کے مخلوط سماجی نظام اور معاشرے میں
یکجہتی، ہم آہنگی اور امن کے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے یہ انتہائی ضروری
ہے کہ باہمی اکرام و احترام کے جذبات کو بڑھاوا دینے کی ایک ہمہ گیر تحریک چلائی
جائے مختلف فرقوں کے درمیان اعتماد و اعتبار کی فضا بڑھاوا دیا جائے۔ ذہنوں

سے شکوک و شبہات دور کیے جائیں۔ جن سے تعصب، تنگ نظری اور منافرت کے رجحانات کا خاتمہ ممکن ہو سکے۔ ایسے مخلوط سماج میں اگرچہ امن و امان سے رہنا ایک مشکل فن ہے لیکن اب یہ ہم سب کو سیکھنا ہے اور جو جاننے والے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو سکھائیں۔

ملک کے موجودہ سیاسی اور سماجی حالات کے پس منظر میں مسلمانوں کی دوہری ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مذہب، تہذیب اور تشخص پر جہاں ضرور اصرار کریں وہاں اسے اپنا حصار نہ بنا ڈالیں۔ بلکہ حفاظتِ اسلام کے ساتھ ساتھ دعوتِ اسلام اور اشاعتِ اسلام کے اولین کام کو سب سے زیادہ اہمیت اور فوقیت دے کر اپنے "فرضِ منصبی" کو پورا کریں۔ اگرچہ مجموعی طور پر مسلم قوم کا مزاج بھی ہنگامی اور جذباتی بنتا جا رہا ہے۔ تاہم ابھی ایسے لوگ ہیں جو اگرچہ کم ہیں، جو اپنے اپنے دائرہ کار میں کام کر رہے ہیں اور بقول شاعرِ مشرقؒ ؎

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا!

---

۱۰ اپریل کا دن اسلام آباد اور راولپنڈی کے باشندوں کے لئے کس قدر بھیانک اور منحوس دن تھا جبکہ اوجڑی کیمپ کے اسلحہ ڈپو میں اچانک آگ بھڑک اٹھی جس نے آناً فاناً سینکڑوں مکانوں کو زمین بوس اور سینکڑوں کی تعداد میں شہریوں کو ہلاک، مفلوج

اور ناکارہ بنا دیا۔ یہ منظر قیامت کا سماں پیش کر رہا تھا ہزارو
کی تعداد میں راکٹ، میزائل اور بم اُڑ اُڑ کر فضا میں دُور دُور تک
آبادیوں میں گر کر انسانوں کو ہلاک کرتے رہے۔ ہر شخص اس
آفتِ ناگہانی اور قیامتِ صغریٰ پر غم و الم اور حیرت و
استعجاب کی تصویر بنا ہوا تھا۔ یہ ناقابلِ تصور واقعہ کیونکر رونما
ہوا اس کی تحقیقات کا سلسلہ حکومت پاکستان کی طرف سے جاری
اس افسوسناک واقعہ کے اسباب و علل کو تلاش کرنا حکومت
فرض ہے۔ ہم پاکستان میں رونما ہوئے اس دردناک سانحہ پ
وہاں کے متاثرہ کنبوں اور عوام سے اپنی بھرپور ہمدردی او
یکجہتی کا اظہار کرتے ہوئے مہلوکین کے لئے دعائے معفرت
اور مجروحین کے لئے دعائے صحت کر رہے ہیں۔

مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورۂ فیل

ایک جائزہ

از جناب محمد رضی الاسلام صاحب ندوی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۱)

مولانا حمید الدین فراہیؒ عہد حاضر کے ان ممتاز علماء میں سے ہیں جنھوں نے قرآن اور علوم قرآن پر عظیم الشان کام انجام دیا ہے اور تدبر قرآن کا نیا راستہ نکالا ہے۔ علوم قرآنی سے متعلق ان کے رسالے اور تفسیر نظام القرآن کے مختلف اجزاء شائع ہوکر قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ اس امتیازی خصوصیت کے باوجود ان کی تحریروں میں بعض خیالات ایسے ملتے ہیں جو قرآن کے طالب علم کو کھٹکتے ہیں، اس لئے کہ ان کے سلسلے میں وہ امت مسلمہ کی پوری تاریخ میں منفرد ہیں۔ انھیں میں ایک وہ رائے بھی ہے جس کا اظہار انھوں نے تفسیر سورۂ فیل میں کیا ہے۔ وہ یہ کہ لشکر ابرہہ کا مقابلہ اہل مکہ نے کیا تھا اور پرندے ان پر سنگباری کرنے نہیں بلکہ ان کی لاشوں کو کھانے کے لئے آئے تھے۔ اگرچہ ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی نے بھی اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں بعینہ یہی خیالات اختصار کے ساتھ بیان کئے ہیں لیکن علماء و مفسرین کے درمیان اس نظریہ کو مقبولیت

حاصل نہ ہوسکی۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی رح نے ارض القرآن[1] میں اصحاب الفیل پر بحث کرتے ہوئے مشہور ر عام روایت ذکر کرنے کے بعد اس نظریہ کا سرسری تذکرہ کردیا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی[2] اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رح نے اس پر متعدد اعتراضات کئے ہیں اور دلائل کے ساتھ اس کی غلطی واضح کی ہے۔ مولانا شبیر احمد صاحب اظہر میرٹھی مدرس جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ نے بھی اپنے ایک مضمون "تفسیر سورۂ فیل" (شائع شدہ ماہنامہ الرشاد اکتوبر نومبر ۱۹۸۵ء) میں جو ان کی زیر تالیف تفسیر مفتاح القرآن کا حصہ ہے۔ اس پر اعتراضات کئے ہیں۔ خیال تھا کہ ان بحثوں کے نتیجے میں مذکورہ رائے کی غلطی واضح ہوگئی ہے لیکن سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ کے شمارہ اپریل تا جون ۱۹۸۷ء میں جناب نسیم ظہیر اصلاحی کا ایک مضمون نظر سے گزرا جس میں مولانا میرٹھی کے اعتراضات کا جائزہ لیا گیا ہے اور مولانا فراہی کی رائے کی تائید کی گئی ہے۔ ان کا جائزہ جیسا کچھ ہے اس پر بحث مقالہ میں آئے گی۔ لیکن چونکہ ان تمام مناقشات و مباحثات کی بنیاد مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ فیل ہے اس لئے ہم براہ راست اسی کا جائزہ لیں گے اور اس کے ساتھ ہی مولانا امین احسن اصلاحی اور جناب نسیم ظہیر اصلاحی کے استدلالات پر بھی گفتگو کریں گے۔

مولانا فراہی کا طریقۂ تفسیر:

مولانا فراہی کے نزدیک بنیادی ماخذ صرف قرآن ہے۔ حدیث کو فرع کی حیثیت حاصل ہے اس لئے ان کے نزدیک تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن میں

---

[1] ارض القرآن اول ص ۲۱۵ دارالمصنفین اعظم گڑھ طبع چہارم ۱۹۵۵ء

[2] قصص القرآن سوم بحث اصحاب الفیل ندوۃ المصنفین دہلی۔

تدبر کیا جائے اور قرآن کے الفاظ سیاق وسباق اور نظم سے اس کا مفہوم سمجھا جائے پھر جو مفہوم سمجھ میں آیا ہو اس پر حدیث کو پرکھا جائے۔ اگر حدیث سے بھی وہ مفہوم معلوم ہوتا ہو تو حدیث کو قبول کر لیا جائے ورنہ وہ مفہوم اختیار کر لیا جائے اور حدیث کے معاملہ میں توقف اختیار کیا جائے:

"شان نزول خود قرآن کے اندر سے اخذ کرنی چاہیے اور احادیث و روایات کے ذخیرہ میں سے صرف وہ چیزیں لینی چاہئیں جو نظم قرآن کی تائید کریں نہ کہ اس کے تمام نظام کو درہم برہم کریں، پھر سب سے زیادہ لائق اہتمام وہ شانِ نزول ہے جو نظم قرآن سے مترشح ہو رہی ہو۔"[1]

یہی طریقہ انھوں نے تفسیر سورۂ فیل میں بھی اپنایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

"مفسرین عموماً قصہ کی تمام تفصیلات روایات سے اخذ کرتے ہیں اور ضعیف وقوی روایات میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ شکل منشا اور صحیح تاویل تک پہنچنے سے مانع ہوتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ واقعہ کی اصلی شکل روایات سے بالکل الگ کر کے دیکھی جائے۔ اس کے بعد روایات پر نظر ڈالی جائے اور کمزور روایات کو صحیح روایات سے چھانٹ کر الگ کیا جائے۔"[2]

قرآن میں تدبر ضروری ہے لیکن روایات کو پس پشت ڈال کر صرف عقل کا

۱۔ مقدمہ نظام القرآن از مولانا حمید الدین فراہی ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی ص ۲۶-۲۷ طبع اول دائرہ حمیدیہ سرائے میر۔ اعظم گڑھ۔

۲۔ تفسیر سورۂ فیل ص ۲۴۔

سہارا لینا اور روایات کو عقلی طور پر سمجھ میں آنے والے مفہوم پر پرکھنا بھی حد اعتدال
تجاوز ہے۔ ایک تاریخی واقعہ کے بیان کرنے میں روایات رطب ویابس شامل ہوسک
ہیں اور کچھ مبالغہ آرائی ہوسکتی ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے پوری روایت کو بے بنیاد ا
خودساختہ قرار دینا صحیح نہیں۔

مشہور عام روایات پر شبہات:

۱۔ روایت کی سند کے بارے میں مولانا فراہی نے لکھا ہے:

"جو حالات وواقعات بیان کئے گئے ہیں سب یک قلم بے بنیاد ہیں۔
از روئے سند ان میں سے ایک روایت بھی قابل اعتماد نہیں
ہے۔ یہ تمام روایات ابن اسحاق پر ختم ہوتی ہیں اور اہل فن کے
نزدیک یہ امر طے شدہ ہے کہ وہ یہود اور غیر ثقہ راویوں سے
روایت کرتے ہیں۔"[۱]

نسیم اصلاحی صاحب نے بھی ابن حجر کی تہذیب التہذیب سے بہت سے ا
نقل کیے ہیں جیسے امام مالک کا قول "محمد بن اسحاق دجال ہے" امام بخاری کا قو
"محمد بن اسحاق ایک ہزار حدیثوں میں منفرد ہے" ابن نمیر کا قول "وہ مجہول لوگوں
بے بنیاد روایت نقل کرتے ہیں" احمد بن حنبل کا قول "محمد بن اسحاق تدلیس کر
ہیں" وغیرہ۔ پھر حاشیہ میں لکھا ہے کہ "امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث انھ
بالکل ناقابل اعتماد سمجھتے ہیں"[۲] لیکن ان تمام اقوال کا جائزہ لینے کی ضرورت۔
امام مالک کے قول کا ایک خاص پس منظر ہے۔ مدینہ میں ابن اسحاق سے بڑھ ک

---

[۱] ایضاً ص ۴۹

[۲] سہ ماہی تحقیقات اسلامی شمارہ اپریل تا جون ۸۷ء ص ۶۲-۶۳

علم الانساب جاننے والا کوئی نہ تھا۔ ابن اسحاق کا خیال تھا کہ امام مالک ذی اصبح کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ہیں جبکہ امام مالک اپنے آپ کو حمیر کی شاخ اصبح میں سے سمجھتے تھے اسی وجہ سے دونوں میں منافرت تھی۔ جب امام مالک نے موطا تصنیف کی تو ابن اسحاق نے کہا: "ایتونی بہ فانا بیطارہ" (اسے میرے پاس لاؤ، اس کا ناقد تو میں ہوں) یہ بات امام مالک کو معلوم ہوئی تو انھوں نے فرمایا: "ھذا دجال من الدجاجلۃ، یروی عن الیھود (یہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے، یہودیوں سے روایات نقل کرتا ہے)۔

"امام مالک حدیث کی وجہ سے ابن اسحاق پر عیب نہیں لگاتے تھے بلکہ اس لئے ان کا انکار کرتے تھے کہ وہ غزوات نبوی سے متعلق یہودیوں کی ان اولادوں کی روایات نقل کرتے تھے جو مسلمان ہو چکے تھے، اور جنہیں خیبر، قریظہ اور نضیر کی جنگوں کے حالات اور اپنے آباء و اجداد کے متعلق اس طرح کے عجیب و غریب واقعات یاد تھے۔ ابن اسحاق یہ روایات معلوم کرنے کے لئے ان کا تتبع کرتے تھے، اور اس بات کا التزام نہ کرتے تھے کہ وہ قابل اعتماد بھی ہیں۔"[۱]

ان پر ایک بڑا اعتراض تدلیس کا بھی ہے۔ لیکن کسی کا مدلس ہونا اس کی تضعیف کے لئے کافی نہیں ہے۔ خود امام احمد بن حنبل نے تدلیس کے باوجود عروہ کی روایات قبول کی ہیں۔ دراصل "یہ اسلوب اس فرق سے متعلق ہے جو حدیث اور تاریخ کے درمیان موجود ہے۔ حدیث میں مربوط قصہ مطلوب نہیں ہوتا

۱۔ نقوش رسول نمبر لاہور جلد ۱۱ مقدمہ بر سیرت ابن اسحاق از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صفحہ ۳۱۔

بلکہ بیان کردہ واقعات کی معرفت کے بارے میں ہر گواہ کی گواہی مطلوب ہوتی ہے جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے اس کا انحصار تو حدیث پر ہے لیکن اس کی غرض یہ ہے کہ تاریخی حکایت کے متعلق ایک مکمل اور مربوط قصہ کے طور پر خبر بہم پہنچائی جائے بغیر اس کے کہ کلام کو اسانید اور بیانات کے تکرار سے بوجھل کیا جائے۔"[۱]

ابن اسحاق کو مطعون کرنے والوں سے کہیں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جنھوں نے توثیق کی ہے۔ شعبہ، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن سعید، حماد بن زید، حماد بن سلمہ جیسے عظیم محدثین نے ان سے روایت کی ہے[۲]۔ بخاری نے صحیح کے علاوہ دوسری کتابوں میں ان سے روایت لی ہے۔ مسلم نے بھی روایت لی ہے اور ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں بھی ان کی روایات موجود ہیں[۳]۔

جس شخص کو متعدد ائمہ حدیث نے ثقہ قرار دیا ہو اور جس کی روایات (صحیح بخاری کے علاوہ) صحاح تک میں موجود ہیں۔ اس کی روایت کو محض چند لوگوں کی تضعیف کی وجہ سے (وہ بھی ایک مخصوص پس منظر میں) ناقابل اعتبار قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اگر یوں ہی ہم ایک دو اقوال کی روشنی میں راویوں کو مطعون اور ناقابل اعتبار قرار دینا شروع کر دیں تو امام ابوحنیفہ اور امام شافعی جیسے بزرگ فقہاء بھی اس کی زد میں آنے سے نہ بچ سکیں گے اس لئے کہ متعدد لوگوں نے ان پر بھی نقد و طعن کیا ہے۔ اس سلسلہ میں عصر حاضر کے مشہور محقق علامہ شبلی نعمانی کی رائے ملاحظہ ہو:

---

[۱] ایضاً ص ۲۸۵۔

[۲] ایضاً ص ۲۸۶ بحوالہ جماعیلی، الکمال فی معرفۃ الرجال، مخطوطہ برلن

[۳] مقدمہ بر سیرت ابن ہشام از محققین، دار احیاء التراث العربی، لبنان ص ۱۲

"محمد بن اسحاق تابعی ہیں۔ ایک صحابی حضرت انسؓ کو دیکھا تھا۔ علم حدیث میں کمال تھا ...... ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے۔ امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں۔ لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیر میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان سے روایت نہیں لی لیکن جزء القراءۃ میں ان سے روایت لی ہے۔ تاریخ میں تو اکثر واقعات ان ہی سے لئے ہیں۔ ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ ان یہودیوں سے دریافت کر کے داخل کتاب کرتے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے اور چونکہ یہ واقعات انھوں نے یہودیوں سے سنے ہوں گے اس لئے ان پر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا۔" [۱]

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ روایت صرف محمد بن اسحاق کے واسطہ سے مروی ہے اس لئے کہ روایت کے بعض اجزاء دوسرے راویوں جیسے قتادہ، عبید بن عمر، ابن عباسؓ اور سعید بن جبیر وغیرہ سے بھی مروی ہیں اور ان میں چڑیوں کے بصراحت سنگباری کرنے کا بھی تذکرہ ہے۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ ایک طرف مولانا فراہی روایت کو محض ابن اسحاق کی وجہ سے ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں دوسری طرف خود اس روایت میں موجود اشعار پر اپنے استدلال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ حالانکہ ابن اسحاق کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

---

[۱] سیرت النبی اول ص ۲۳-۲۴، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء

ابرہہ کے لشکر جرار سے مقابلہ ناممکن تھا۔ راستہ میں جن قبائل نے مقابلہ کی کوشش کی تھی وہ ہزیمت کھا کر قتل اور قید کر دیئے گئے تھے۔ اس لئے اہل مکہ کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ ابرہہ کے لشکر کا مقابلہ کرنا ان کے بس میں نہیں۔ سیرت ابن ہشام میں ہے:

"فھمّت قریش وکنانۃ وھذیل ومن کان بذلك الحرم من سائر الناس لقتالہ ثم عرفوا أنھم لا طاقۃ لھم بہ فترکوا ذلك" [1]

[قریش، کنانہ، ہذیل اور جو لوگ اس وقت حرم میں موجود تھے انھوں نے ابرہہ سے جنگ کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر انھیں اندازہ ہوگیا کہ ان میں لڑنے کی طاقت نہیں ہے اس لئے جنگ کا ارادہ ترک کر دیا]

اس صورت میں صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعاؤں کو شرف قبولیت بخش کر لشکر ابرہہ کو تباہ و برباد کر دیا۔

اس سے ملتی جلتی کیفیت ہمیں غزوۂ احزاب میں ملتی ہے۔ مشرکین کے عظیم لشکر سے مقابلہ کرنے کے بجائے رسول کریمؐ نے یہ بہتر خیال کیا کہ اپنے بچاؤ کے لئے خندق کھود لی جائے۔ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ایک موقع پر رسول اللہؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا تھا کہ کھجوروں کی پیداوار کا ایک حصہ ادا کر لئے پر صلح کر لی جائے لیکن صحابہ اپنی ایمانی حمیت کی بناپر تیار نہ ہوئے تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے تیز ہوا اور غیر مرئی فوج بھیج کر مشرکین کو واپس ہونے پر مجبور کر دیا۔

---

[1] سیرتہ ابن ہشام اول ص۵۰۔

(۳) تیسرا شبہ یہ ہے کہ اہل سیر کے بیان کے مطابق ابرہہ کے حملہ کے پہلے دن سے قبائل عرب اس کی فوج پر تاخت کرتے رہتے تھے۔ ذوالرمہ کہتا ہے:

وابرھۃ اصطادت صدور رماحنا
جھاراً وعثنون العجاجۃ اکدر
تنحی لہ عمرو فشک ضلوعہ
بنافذۃ نجلاء والخیل تضبر

[ہمارے نیزوں نے علانیہ ابرہہ کا شکار کیا اور فضا میں کثیف غبار کا ستون قائم تھا۔ عمرو نے اس کی طرف لپک کر نیزے کے کاری زخم سے اس کی پسلیاں توڑ دیں اور شہسوار ثابت قدم رہے]

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قریش اس قدر مرعوب ہو جائیں کہ بالکل مقابلہ نہ کریں۔"

مولانا فراہی نے ان اشعار کی تشریح میں لکھا ہے کہ ان شعروں میں صاف تصریح ہے کہ ذوالرمہ کی قوم کے ایک آدمی نے ابرہہ کو نیزہ مارا اور یہ واقعہ جس دن پیش آیا کثیف غبار آسمان تک بلند تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے ہوا بھیج کر ان پر سنگریزوں سے بارش کی۔"[۱] اس تشریح میں مولانا سے تسامح ہو گیا ہے۔ مولانا کے نزدیک جس دن یہ واقعہ پیش آیا اسی دن اللہ تعالیٰ نے سنگباری کے ذریعہ لشکر ابرہہ کو ہلاک کر دیا۔ حالانکہ صحیح یہ ہے کہ شاعر نے ان اشعار میں لشکر ابرہہ سے پہلے

---

[۱] تفسیر سورۂ فیل ص ۸۴۔

ہونے والی جھڑپوں میں سے کسی جھڑپ کا تذکرہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر یمامہ کا رہنے والا ہے۔ دوسرے یہ کہ خود ان کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ اہل مکہ نے لشکر ابرہہ سے نیزوں کے ذریعے آمنے سامنے مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں پر جاکر مقابلہ کیا تھا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

"اس میں شبہ نہیں کہ اس موقع پر قریش پہاڑوں پر چلے گئے تھے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ مدافعت سے کلیۃً دست بردار ہو کر پہاڑوں پر جا چھپے تھے بلکہ ابرہہ کی عظیم فوج کے مقابل میں مدافعت کی واحد ممکن شکل جو وہ اختیار کرسکتے تھے یہی تھی اس وجہ سے انھوں نے یہی اختیار کی۔۔۔۔ ابرہہ کا لشکر ساٹھ ہزار تھا اور اس کے ساتھ ہاتھیوں کا ایک دستہ بھی تھا۔ اتنی بڑی فوج کا مقابلہ میدان میں نکل کر اور صف بندی اور تلواروں کے ذریعے سے کرنا قریش کے لئے ممکن نہ تھا۔ وہ اگر اپنا پورا زور واثر استعمال کرتے تو بھی شاید دس بیس ہزار سے زیادہ آدمی اکٹھے نہ کرپاتے۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے لئے بہترین جنگی پالیسی یہی خیال کی کہ میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کے بجائے پہاڑوں میں محفوظ ہوجائیں اور وہاں سے گوریلوں کے طریقے پر جس حد تک ان کے اقدام میں مزاحمت پیدا کرسکتے ہوں، کریں۔" [1]

قریش کے مقابلہ نہ کرنے کی وجہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ ہونے والی جھڑپوں کے نتائج سے واقف تھے انھیں سوائے اللہ کے غیبی مدد کے کسی سہارے کی امید نہیں تھی اس لئے مقابلہ کی تیاریوں کے بجائے وہ اللہ تعالیٰ سے دعا ومناجات

---

[1] تدبر قرآن جلد ہشتم ص ۵۶۱ - ۵۶۲

اور تفرع و ابتہال کرتے ہوئے پہاڑیوں میں چلے گئے۔

(۴) مولانا فراہی نے لکھا ہے کہ "علمائے سیر کے بیان کے مطابق ابرہہ کا حملہ موسم حج میں ہوا تھا" اور دلیل میں عکرمہ بن ہاشم کا یہ شعر نقل کیا ہے:

لاھمّ أخز الاسود بن مقصود   الآخذ الهجمة فيها التقليد

[خداوندا، اسود بن مقصود کو رسوا کر جو قربانی کے اونٹوں کو جن کی گردنوں میں قلادے تھے ہنکا لے گیا]

جہاں تک علمائے سیر کا تعلق ہے ان کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ انھوں نے ابرہہ کے حملے کا وقت موسم حج بتایا ہے تلاش بسیار کے باوجود ہمیں ایک روایت بھی ایسی نہیں ملی جس سے موسم حج میں ابرہہ کے حملے کا اشارہ ملتا ہو، اس کا اعتراف نسیم اصلاحی صاحب نے بھی کیا ہے[1] تاریخ و سیر کی متداول کتابوں میں جب ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی جس سے موسم حج میں حملۂ ابرہہ کا پتہ چلتا ہو تو محض خوش گمانی علمی تحقیقات میں کارگر ثابت نہیں ہوسکتی۔ واقعۂ فیل کے زمانے کے بارے میں بہت سے اقوال ملتے ہیں۔ لیکن مشہور قول یہ ہے کہ اسی سال حضورؐ کی ولادت ہوئی اور ادر مشہور قول کے مطابق حضورؐ کی ولادت سے پچاس دن قبل یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ نسیم اصلاحی صاحب کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جن روایتوں میں واقعۂ فیل کا زمانہ محرم بتلایا گیا ہے ان کا مأخذ صرف محمد بن اسحاق کی بیان کردہ روایت ہے اس لئے کہ ان کے علاوہ بھی دوسرے راویوں کی تصریحات ملتی ہیں، چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابو جعفر باقر سے بھی یہی خیال نقل کیا ہے کہ

---

[1] تحقیقات اسلامی شمارہ مذکور ص ۶۲-۶۴۔

(۶) مولانا فراہی نے کید کی یہ تشریح کی ہے :

"قرآن مجید میں تصریح ہے کہ اصحاب الفیل نے ایک مخفی چال چلی تھی ۔ لیکن روایات میں اس کے حملے کے جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں ان میں مخفی چال کا کوئی پہلو نہیں ہے ۔ وہ اس کے برعکس قوت نمائش اور عربوں کی تذلیل کی ایک نہایت کھلی ہوئی کاروائی ہے ۔ البتہ قابل اعتماد روایات سے استنباط کرنے کے بعد کید (مخفی چال) کے چند پہلو سامنے آتے ہیں ۔ مثلاً :

۱۔ اس نے احترام کے مہینوں میں حملہ کیا ۔ کیونکہ اس کو خیال تھا کہ عرب ان مہینوں میں جنگ و خوں ریزی سے احتراز کرتے ہیں ۔

۲۔ اس نے مکہ میں .... ایسے وقت میں داخل ہونا چاہا جب تمام اہل مکہ دوسرے عربوں کے ساتھ حج کے مراسم ادا کرنے میں مشغول ہوتے ہیں ۔

۳۔ اس نے خاص طور پر قیام منیٰ کے دنوں میں حملہ کرنا چاہا کہ عرب یا تو منیٰ میں قربانی میں مصروف ہوں گے یا سفر کے تھکے ہارے گھروں کو واپس آ رہے ہوں گے ۔"[۱]

کید کا ترجمہ مخفی چال کرنا محل نظر ہے ۔ لغت میں اس کے ایک معنی مطلق تدبیر بھی بیان کیئے گئے ہیں ۔ لسان العرب میں ہے : "الکید التدبیر بباطل او حق" (کید تدبیر کو کہتے ہیں خواہ حق ہو یا ناحق) قرآن میں بھی کید کا استعمال خفیہ چال کے

---

[۱] تفسیر سورۂ فیل صفحہ ۱۵

[۲] لسان العرب ابن منظور ۴/ ۳۸۹ مادہ کید

س نہیں ہے بلکہ کبھی مطلق تدبیر کے معنی میں آتا ہے جیسے درج ذیل آیت
ں :

"من كان يظن أن لن ينصره الله في الدنيا والآخرة فليمدد
بسبب إلى السماء ثم ليقطع فلينظر هل يذهبن كيده
ما يغيظ" (الحج - ۱۵)

[جو شخص گمان رکھتا ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی کوئی مدد نہ کرے
گا اسے چاہیئے کہ ایک رسی کے ذریعے آسمان تک پہنچ کر شگاف لگائے
پھر دیکھ لے کہ آیا اس کی تدبیر کسی ایسی چیز کو رد کر سکتی ہے جو اس کو
ناگوار ہے]

ر کبھی 'بری تدبیر' کے معنی میں آتا ہے خواہ علانیہ ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت ابراہیم کے
اف ان کی قوم کی کھلی سازشیں ڈھکی چھپی نہ تھیں۔ انھوں نے علانیہ معبودوں کی دہائی
ے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے الاؤ میں جھونک دینے کا منصوبہ بنایا
ا لیکن قرآن نے اس کے لئے بھی 'کید' کا لفظ استعمال کیا :

"قالوا ابنوا له بنيانا فالقوه في الجحيم، فأرادوا به كيدا
فجعلناهم الأسفلين" (الصافات : ۹۷ - ۹۸)

"قالوا حرقوه وانصروا آلهتكم إن كنتم فاعلين، قلنا
يا نار كوني بردا وسلاما على ابراهيم، وأرادوا به كيدا
فجعلناهم الأخسرين" (الانبياء ــــ ۶۸ - ۷۰)

اگر کید کے معنی خفیہ چال کے مان بھی لیں تب بھی مولانا فراہی کی مذکورہ تشریح
یح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اوپر گزرا کہ ابرہہ کا حملہ موسم حج میں نہیں بلکہ محرم کے مہینے
ں ہوا تھا۔ ابن اسحاق کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ نے 'قلیس' نامی

گرجا گھر تیار کرایا تھا اور چاہتا تھا کہ لوگ خانہ کعبہ کا حج کرنے کے بجائے اس گرجے کا حج کریں۔ اس اثنار میں کسی عرب نے گرجا گھر کو گندا کر دیا یا ممکن ہے خود اس نے سازش کر کے گندا کروا دیا ہو اور عربوں کی جانب منسوب کر دیا ہو۔ بہرحال اس طرح اس نے ظاہر میں خانہ کعبہ کو ڈھانے کا ایک بہانہ تلاش کر لیا۔ ورنہ وہ دل میں بہرصورت اسے ڈھانے کا عزم رکھتا تھا۔ فخر الرازی نے بھی کید کی یہی تشریح کی ہے۔[1]

کلام عرب سے استشہاد :

(۱) مولانا فراہی نے دسویں فصل کا عنوان یہ قائم کیا ہے " کلام عرب کی شہادت کہ سنگباری آسمان اور ہوا سے ہوئی " اور اس میں سات آٹھ شعرار کے اشعار نقل کئے ہیں۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ بیشتر اشعار میں سنگباری کا کوئی تذکرہ نہیں جن اشعار سے کسی نہ کسی صورت استدلال کیا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہیں :

فأرسل من ربهم حاصب   یلفهم مثل لفّ القزم

(ابو قیس)

فلمّا أجازوا بطن نعمان ردّهم   جنود الالٰہ بین ساف وحاصب

(ابو قیس)

حمدت الله اذ عاینت طیرا   وحصب حجارة تلقی علینا

(نفیل خثعمی)

پہلے دو اشعار میں 'حاصب' اور 'سافی' کے الفاظ ہیں۔ ان سے انھوں نے

---

[1] تفسیر کبیر رازی ۳۲/۹۹ دار احیار التراث الاسلامی

استدلال کیا ہے کہ "عربی میں حاصب اس تند ہوا کو کہتے ہیں جو کنکریاں اور سنگریزے لاکر پاٹ دیتی ہے اور سافی اس ہوا کو کہتے ہیں جو گرد و غبار، خس و خاشاک اور درختوں کی پتیاں اڑاتی ہوئی چلتی ہے" دوسرے شعر کا ترجمہ مترجم مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے یہ کیا ہے: جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے خدا کی فوجوں نے ساف اور حاصب کی شکل میں نمودار ہو کر انھیں پسپا کر دیا"[1] یہ ترجمہ صحیح نہیں خود انھوں نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں اس شعر کا جو ترجمہ کیا ہے وہ زیادہ صحیح ہے: "جونہی وہ بطن نعمان سے آگے بڑھے خدا کی فوجوں نے ساف اور حاصب کے درمیان نمودار ہو کر انھیں پسپا کر دیا"[2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی فوج جس نے لشکر ابرہہ کو پسپا کیا وہ ساف اور حاصب کے علاوہ کچھ اور ہے۔ ان فوجوں نے لشکر کو اس حال میں پسپا کیا جب تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ وہ خدائی فوج کیا تھی روایتوں سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے یہ شعر مختلف کتابوں میں کچھ الفاظ کے اختلاف سے مذکور ہے۔ جیسے سیرت ابن اسحاق میں ہے:

خشیت اللہ لما رایت طیرًا وقذف حجارۃ ترمی علینا

[میں اللہ سے ڈرا جب میں نے پرندوں کو دیکھا۔ اس وقت ہمارے اوپر پتھر پھینکے جا رہے تھے]

سیرت ابن ہشام میں ہے:

حمدت اللہ اذ ابصرت طیرا وخفت حجارۃ تلقی علینا

[میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جب پرندوں کو دیکھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں پتھر ہمارے اوپر نہ آپڑیں]

---

[1] تفسیر سورۂ فیل ص ۶۴
[2] تدبر قرآن ہشتم ص ۵۶۰

تمام اشعار نقل کرنے کے بعد مولانا فراہی نے لکھا ہے :

"ان اشعار کو غور سے پڑھو، یہ لوگ جو واقعہ کے عینی شاہد ہیں چڑیوں اور پتھروں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتے ہیں لیکن یہ نہیں کہتے کہ یہ پتھر چڑیوں نے پھینکے بلکہ اس سنگباری کو حاصب اور ساف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں"

پہلے دو شعروں کے بارے میں وضاحت گذری کہ شاعر نے لشکر کو پسپا کی نسبت ساف اور حاصب کی طرف نہیں بلکہ "جنود الالٰہ" کی طرف کی ہے۔ تیسرے میں شاعر چڑیوں اور سنگباری کا ایک ساتھ ذکر کرتا ہے تو اس کا مطلب سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ چڑیاں ہی سنگباری کر رہی تھیں۔ شعر کا جو انداز بھی اس بات کی تائید کرتا ہے۔ مولانا فراہی نے خود لکھا ہے کہ "شعراء کا عام اجمال اور کنایہ کا ہوتا ہے وہ زیادہ تصریح و تفصیل نہیں کیا کرتے" شاعر کا میں نے چڑیوں کو دیکھا تو اللہ کا شکر ادا کیا اور اس وقت مجھے ڈر لگ رہا کہیں پتھر ہمارے اوپر نہ آگریں۔ چڑیوں کو دیکھتے ہی اللہ کا شکر ادا کرنا اپنے اوپر پتھر گرنے کا خوف کرنے کا کیا مطلب ہوگا؟ اس سے صاف معلوم ہوتا کہ شاعر نے چڑیوں کو سنگباری کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ کسی شاعر نے بصراحت چڑیوں کے پتھر پھینکنے کا تذکرہ ہو۔ ابن ہشام نے عبداللہ بن قیس الرقیات کے جو اشعار نقل کئے ہیں ان بصراحت چڑیوں کی سنگباری کا تذکرہ ہے :

کادہ الأشرم الذی جاء بالفیل   فولی وجیشہ مھز
واستھلت علیھم الطیر بالجندل حتی کانہ مرجو

ٰ تفسیر سورۂ فیل ص ۶۶

ک من یغزہ من الناس یرجع وھو فلّ من الجیوش ذمیم[۱]

[اس کے خلاف (ابرہہ) اشرم نے سازش کی جو ہاتھی لے کر آیا تھا
لیکن اسے منہ پھیر کر بھاگنا پڑا اور اس کا لشکر پسپا ہو گیا اور چڑیوں
نے اس پر کنکریاں پھینکیں یہاں تک کہ اس کی حالت ایسی ہو گئی
جیسے اس پر سنگ ساری کی گئی ہو۔ ہر اس شخص کا یہی حشر ہوگا
جو خدا سے آمادۂ جنگ ہوگا۔ اسے شکست خوردہ ہو کر واپس
بھاگنا پڑے گا]

یہ اشعار سیرت ابن ہشام میں موجود ہیں جو مولانا فراہی کی نظر سے
ر گزرے ہوں گے لیکن معلوم نہیں کیوں مولانا نے انھیں لائق اعتنا
ب سمجھا۔

(جاری)

ـه سیرت ابن ہشام اول صـ ۶۳

نظریۂ ارتقاء اور دانشورانِ اسلام

(۲)

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

شیخ محمد عبدہ کی تاویلات کا اثر

چنانچہ شیخ فرید وجدی نے اپنی کتاب "دائرۃ معارف القرن العشرین" میں اور شیخ عبدالوہاب نجار نے اپنی کتاب "قصص الانبیاء" میں یہی موقف اختیار کیا ہے کہ اگر نظریۂ ارتقاء علمی اعتبار سے ثابت ہو جائے تو پھر قرآن میں مذکور قصۂ آدم کو اس کے ظاہری نصوص سے پھیر دینا ممکن ہو جائے گا[1] جب کہ یہ دونوں حضرات تسلیم کرتے ہیں کہ قرآنی نصوص قطعی ہیں اور اس کی ظاہری آیات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تو اس کا حاصل وہی قرآن کی قطعیت میں شک وشبہ پیدا کرنا اور ارتیابیت کی دعوت دینا ہے۔ ایک طرف قرآنی نصوص پر ایمان رکھنے کا بھی دعویٰ ہے اور دوسری طرف اس کی قطعیت کے بارے میں تردد کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے

---

[1] دیکھئے دائرۃ معارف القرن العشرین : ۱/۱۲۷ اور قصص الانبیاء : ص ۱۴

اس قصے کے بارے میں عام طور پر مصری علماء کا موقف یہی ہے۔

یہ ہے وہ صورت حال جس میں اس وقت اُمت مسلمہ گرفتار اور حیران و سرگرداں ہے کہ وہ کس کی بات مانے اور قرآن حکیم پر کس طرح ایمان لائے؟ سر سید احمد خاں نے جب نیچریت کا دروازہ کھولا تو اس وقت کے بعض علماء نے ان پر کفر کے فتوے لگائے اور ان کے خلاف ایک اچھا خاصہ لٹریچر تیار کر دیا[1] مگر اس کے برعکس شیخ محمد عبدہ کے خیالات کو قبول عام حاصل ہوگیا۔ محض اس لئے کہ وہ ایک عالم دین اور عالم عربیت تھے۔ لہذا کسی نے بھی ان کے خلاف زبان نہیں کھولی۔ گویا کہ اُن کے علم اور اُن کی عربیت کی عبا نے اُن کے سارے عیوب چھپا دیئے۔

بہر حال عالم اسلام میں ان دونوں حضرات کے خیالات کی بازگشت اکثر و بیشتر سنائی دیتی ہے۔ اور ہند و پاک کے بہت سے اہل علم اور دانشور بھی ان سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اس موقع پر اس کا ایک مختصر سا تنقیدی جائزہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

علامہ اقبال اور نظریۂ ارتقاء

علامہ اقبال نے اپنے خطبات Reconstruction of Religious Thought in Islam (تیسرے خطبے میں) جہاں پر قصۂ آدم سے بحث کی ہے تو وہ اسی تمثیلی انداز میں ہے جو ان دو پیش روؤں کا انداز ہے۔ مگر اقبال چونکہ ایک فلسفی ہیں اس لئے اس قصے کو بھی ایک مکمل فلسفے کی شکل دیتے ہوئے اس پر کئی صفحات سیاہ کر دیئے ہیں۔ اور اس کا حاصل بھی ان کے نزدیک وہی ہے کہ

---

[1] دیکھیئے "اسلامی علوم و فنون ہندستان میں" از مولانا سید عبدالحیٔ، ص ۳۲۱، ۱۹۶۹ء۔

اس سے مراد کوئی مخصوص انسان نہیں (بلکہ بحیثیت مجموعی نوع بشری کا تذکرہ ہے)۔[1]

اقبال کے مجمل بیان کی تشریح کرتے ہوئے اقبال کے ایک شارح ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب "فکر اقبال" میں تحریر کرتے ہیں: "قرآن جس آدم کو پیش کرتا ہے وہ کوئی ایک فرد نہیں بلکہ انسانیت کا ایک تصور ہے۔ قرآن نے آدم کے لفظ کو انسانیت یا نوع انسان کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔"[2]

علامہ اقبال کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہے، مگر جہاں تک اسلامی عقائد کا معاملہ ہے تو اس میں اقبال تو کیا کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بخشا نہیں جا سکتا، خواہ وہ کتنی ہی قدآور کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ہمیں محمد عبدہ اور اقبال سے زیادہ اسلام اور قرآن عزیز ہیں۔

واضح رہے کہ علامہ اقبال نے اس موقع پر اپنے اس قیاس کے لئے ایک قرآنی آیت کو بطور ثبوت پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہتر ہے کہ اس موقع پر خود موصوف ہی کی عبارت پیش کر دی جائے جو یہ ہے:

"..... آدم کا لفظ بے شک حذف نہیں ہوا، لیکن یہاں اس کا اشارہ کسی مخصوص انسان کی طرف نہیں۔ اس کی حیثیت ایک تصور کی ہے جس کی تائید قرآن پاک ہی سے ہو جاتی ہے اور جس کا ذیل کی آیت ایک قطعی اور واضح ثبوت ہے: وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ق فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ"[3]

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ از سید نذیر نیازی، ص ۱۲۶، طبع جدید دہلی، ۱۹۸۶ء۔
[2] فکر اقبال، ص ۵۹۴، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۷۷ء۔
[3] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۲۶۔

ترجمہ: اور ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہاری صورت گری کی پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ (اعراف: ۱۱)

اقبال کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ اس آیت کریمہ میں ضمیریں جمع مخاطب کی لائی گئی ہیں اس لئے یہ کسی ایک انسان کا تذکرہ نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کا تذکرہ ہو سکتا ہے۔ تو یہ شبہ دراصل قرآنی اسلوب اور اس کی بلاغت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اس واقعہ سے قرآن درحقیقت پوری نوع انسانی کا شرف بڑھانا چاہتا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ ابوالبشر حضرت آدمؑ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا، وہ مجموعی طور پر تمہاری سب کی تکریم کی غرض سے تھا، گویا کہ یہ واقعہ صرف آدم کے ساتھ نہیں بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ پیش آیا ہے اور اس کی نظیر قوم یہود سے قوم یہود سے طرز تخاطب میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آیت ۴۷ تا ۹۳ میں مختلف آیات ملاحظہ فرمائیے، جن میں دور رسالت میں موجود یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کے تاریخی واقعات کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ گویا وہ واقعات انھیں کے ساتھ پیش آئے تھے۔ ان واقعات میں اللہ کے احسانات کو بھی گنایا گیا ہے جو قوم یہود پر ہوئے تھے اور ان کی لغزشوں کا تذکرہ بھی اس انداز سے کیا گیا ہے گویا کہ ان کا ارتکاب خود نزولِ قرآن کے دور میں موجود یہودیوں نے کیا تھا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى: اور ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا اور تم پر من و سلوی اتارا۔ (البقرہ: ۵۷)

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ: اور جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کریں گے (البقرہ: ۶۱)

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ : اورجب ہم نے تم سے عہد لیا اورتم پر کوہ طور بلند کیا۔ (البقرہ : ۶۳)

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُم مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ : پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ (البقرہ : ۷۴)

دیکھئے یہ اور اس قسم کی دیگر آیات میں کس طرح ماضی کے واقعات کے ذریعہ زمانۂ حال کے لوگوں سے خطاب کیا جارہا ہے، گویا یہ سب کچھ حال والوں کے ساتھ پیش آیا ہے! یہ قرآن حکیم کا ایک معروف اور بہت بلیغ اسلوب ہے۔ امام رازی نے بھی تقریباً یہی توجیہ اختیار کی ہے[1] اور علامہ زمخشری فرماتے ہیں (وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ) یعنی خلقنا أباكم آدم طيناً غير مصوّر ثم صوّرناه بعد ذلك[2]

ڈاکٹر رفیع الدین اور نظریۂ ارتقاء

علامہ اقبال کے بعد انہی کے ایک نام لیوا دوسرے فلسفی ڈاکٹر محمد رفیع الدین میدان میں آئے اور اس سلسلے میں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ ڈاکٹر صاحب کی بعض کلامی تحریریں اگرچہ بہت وقیع اور فکر انگیز ضرور ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کی کتاب "قرآن اور علم جدید" تعارض و تضاد کا ایک عجیب وغریب شاہکار ہے۔ جس میں موصوف نے قصۂ آدم اور نظریۂ ارتقاء پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو وہ نظریۂ ارتقاء کو غلط، ایک خلاق ہستی کا منکر اور کافرانہ نظریہ

---

[1] دیکھئے تفسیر کبیر : ۲۹/۱۴ — ۳۰، طبع جدید۔

[2] تفسیر کشاف : ۲/۶۸، مطبوعہ طہران۔

وغیرہ وغیرہ بھی کہتے ہیں، مثلاً:

"ڈارون ارتقاء کے اسباب کی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ ان کو درست تسلیم کر لینے کے بعد ہمارے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ ہم کائنات کی تخلیق میں کسی قادر مطلق ہستی کے دخل یا عمل کو یا خود کائنات ہی کے کسی مقصد یا مدعا کو ذہن میں لا سکیں۔" [۱]

اور ایک دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں:

"ڈارون کا نظریۂ ارتقا مغرب کے تمام کافرانہ فلسفیانہ نظریات سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے ...... سچ بات تو یہ ہے کہ مغرب کے فلسفیوں میں لامذہبیت اور دہریت کا جس قدر مواد اس وقت موجود ہے وہ ڈارون ہی کے نظریہ کی پیداوار ہے۔ یہ کلیہ بالخصوص کارل مارکس، میکڈوگل، فرائڈ، ایڈلر اور میکیاولی کے نظریات پر حاوی ہے ..... یہ فلسفے ڈارون کے نظریہ سے براہ راست نہیں تو اس سے بالواسطہ طور پر گہری طرح سے متاثر ہیں۔ ان سب کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔" [۲]

مگر اس کے باوجود اس کو قرآن سے صحیح ثابت کرنے کے لئے اپنا سارا زور بھی صرف کر دیتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں بعض متشابہات یا مبہم آیتوں کا سہارا لے کر محکمات تک کو متشابہات کے تابع کرتے ہوئے من مانی اور رکیک قسم کی تاویلات کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم کو سمجھنے کا یہ الٹا رخ ہے۔ اور صحیح رخ یہ ہے کہ

۱؎ قرآن اور علم جدید، ص ۳۷، طبع چہارم، ۱۹۸۱ء، لاہور۔

۲؎ ایضاً ص ۱۳۷ — ۱۳۸

اُس کی متشابہات کو اس کی محکمات کی روشنی میں دیکھا جائے۔ مگر مصنف چو
"ارتقا" کی عینک چڑھائے ہوئے ہیں اس لئے انھیں قرآن کے ہر ہر لفظ میں
ہی ارتقا نظر آرہا ہے۔ میری نظر میں قرآن حکیم پر اپنے نظریات زبردستی لاد
یہ ایک بدترین مثال ہے جس کے ذریعہ قرآن فہمی کے اصولوں کا خون ہوتا ہے
عقل سلیم اس سے اباء کرتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے نظریات پر اس وقت تفصیلی بحث کی تو گنجائش
ہے، مگر مجموعی طور پر عرض ہے کہ موصوف کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ارتقا اپنی جگہ بالکل
ہے، مگر وہ غیر شعوری طور پر نہیں بلکہ شعوری طور پر ہوتا ہے۔ بس یہی ایک
نظر آتا ہے ان کے اور ڈاردن کے نظریہ میں۔ مگر وہ اتنا کہہ کر ڈاردن کے
کو مسلمان نہیں بنا سکتے۔ اس کے لئے تو ضروری تھا کہ سب سے پہلے وہ ارتق
اعتبار سے صحیح ثابت کرتے۔ اس کو مسلمان بنانے کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے
ارتقا ہی ثابت نہیں ہے تو پھر قرآن عظیم کو نہایت درجہ بھونڈے طریقے
کھینچ تان کر مطابق ارتقا ثابت کرنے کا کیا مطلب ہے؟ بلکہ اب تو خود ما
حیاتیات ہی اس غلط اور نامعقول نظریہ سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے
آرہے ہیں، جیسا کہ پہلے باب میں ہم دیکھ آئے ہیں۔ اس موضوع پر تفص
بحث راقم سطور نے اپنی کتاب "قرآن حکیم اور نظریۂ ارتقا" میں کی ہے
زیر تکمیل ہے۔

احمد باشمیل اور اُن کا اُصول باطل۔

اسی طرح احمد باشمیل نامی ایک عربی داں نے ایک کتاب "الاسلام و نظری
کے نام سے لکھی ہے، جس میں حق و باطل کو گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ اور اس مل

ب بات بھی مذکور رہے کہ اگر کسی کو نظریہ ارتقا کی تردید کرنی ہو تو وہ اس کو صرف
ی طرف سے کرے، قرآن کو درمیان میں نہ لائے، مبادا کہ یہ نظریہ آئندہ چل کر صحیح
بت ہو اور قرآن متہم ہو جائے۔ مگر موصوف نے دوسری طرف خود ہی قرآن اور
ریۂ ارتقا میں تطبیق دیتے ہوئے قرآن کے اُن قطعی نصوص میں بھی جو ارتقا
ے خلاف ہیں، تاویل کر کے ان کو مطابق ارتقا ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی
ہے۔ اللہ اللہ! ایک طرف تو احتیاط کا یہ عالم، اور دوسری طرف مرعوبیت کی
انتہا!! مگر سوال یہ ہے کہ موصوف نے اس موقع پر یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر نظریۂ
ارتقا غلط اور باطل ثابت ہو جائے تو پھر خود اپنی توجیہ و تعلیل کا کیا ہوگا؟
کیا اس صورت میں بھی قرآن متہم نہیں ہو جائے گا؟ آخر یہ "وَن وے ٹرافک"
اصول اور کس لئے؟

غرض اس غلط اور باطل اصول کا مطلب یہ ہوا کہ قرآنِ حکیم سے اس
غیر ثابت شدہ نظریہ کی تائید تو کی جا سکتی ہے مگر اس کی تردید نہیں۔ گویا کہ
قرآن عظیم مادہ پرستانہ نظریات کی تائید کے لئے نازل ہوا ہے ان کی تردید
کے لئے نہیں۔ گویا کہ قرآن عظیم انسانی نظریات و مفروضات کے تابع ہے
اور انسانی نظریات جس طرف بھی جائیں گے قرآن کو بھی خواہی یا ناخواہی
اسی طرف جانا پڑے گا۔ یہ عجیب و غریب قسم کی قرآن دانی ہے، جو قرآن حکیم
جیسی باطل شکن کتاب کے ساتھ ایک مذاق ہے۔

واضح رہے کہ اس موقع پر بحث محض نظریات و مفروضات کے سلسلے میں ہے۔
اس کے برعکس علوم طبیعی (NATURAL SCIENCES) کے وہ
ثابت شدہ حقائق جو مسلسل تجربے و مشاہدے کے باعث "قوانینِ فطرت" کا
درجہ حاصل کر چکے ہوں، ان کا انکار مقصود نہیں ہے۔ بلکہ اس قسم کے

حقائق کی قرآن حکیم تصدیق و تائید کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو خود علوم جدیدہ قرآن حکیم کی ابدی سچائیوں کی تصدیق و تائید کرتے ہیں۔ راقم سطور نے اس موضوع پر اپنی دیگر تصانیف میں تفصیلی بحث کی ہے۔

مولانا آزاد اور نظریۂ ارتقا

اس سلسلے میں دو اہم شخصیتوں کا تذکرہ کئے بغیر یہ جائزہ نامکمل رہے گا ان میں سے ایک مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے علامہ سید سلیمان ندوی ہیں۔ چنانچہ اول الذکر نے اپنی تفسیر میں جہاں پر ربوبیت کی تفصیل کی ہے تو وہاں پر انھوں نے نظریۂ ارتقار کا تذکرہ اس حیثیت سے کیا ہے گویا کہ وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اگرچہ موصوف نے آدم کی شخصیت کو تمثیل قرار دینے سے احتراز کیا ہے، مگر ارتقا کی تشریح بالکل اسی انداز میں کی ہے جس طرح کہ مادہ پرست کرتے ہیں کہ زندگی کی ابتدا ایک اولین خلیہ یا بیج سے ہوئی جس کو پروٹوپلازم کہتے ہیں۔ پھر اس میں ایک مدت مدید کے ارتقا کے بعد ادنا سے اعلیٰ درجے کی کڑیاں ظہور میں آئیں یہاں تک کہ لاکھوں سال کے ارتقا کے بعد انسان کا ظہور ہوا۔ پھر یہی نہیں بلکہ موجودہ انسان کے بعد بھی موصوف کے نزدیک ارتقا ممکن ہے [1]

اور موصوف نے یہ سب دلیل آخرت کے ثبوت کے طور پر تحریر کیا ہے۔ مگر علمی اعتبار سے اس سے آخرت کا ثبوت تو کجا خود ربوبیت بھی ثابت نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جو چیز خود بخود ترقی کرتے کرتے آپ سے آپ ظاہر ہوتی جائے اس میں

---

[1] دیکھئے ترجمان القرآن : ۱/۳۷، مطبوعہ دفتر ترجمان دہلی، ۱۳۵۰ھ

بھلا ربوبیت کا کیا دخل ہو سکتا ہے؟ اس اعتبار سے ارتقا ربوبیت کی نقیض ہے اور ربوبیت ارتقا کی۔ مادہ پرست نظریۂ ارتقا سے اسی لئے چمٹے ہوئے ہیں کہ انھیں ایک خالق یا برتر ہستی کے وجود کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ ارتقا علمی اعتبار سے بجائے خود ثابت نہیں ہے۔ مگر مادہ پرست اس نظریہ سے دست بردار ہونے کے لئے کسی بھی طرح تیار نہیں ہیں۔ کیونکہ بصورت دیگر انھیں ایک خلّاق ہستی (CREATOR) کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ مگر چونکہ انھیں خدا کے نام ہی سے ایک قسم کی چڑ سی ہو گئی ہے لہٰذا وہ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اس پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔ لہٰذا ایک مادہ پرست کا اس نظریہ کو اپنانا اور اس سے چمٹے رہنا تو سمجھ میں آتا ہے مگر ایک عالم دین کا اس سے اس حد تک متاثر ہو جانا گویا کہ وہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، بالکل نا قابل فہم ہے۔ اور پھر ایسی صورت میں جب کہ اس سے خالق ارض و سما کی ربوبیت و خلّاقیت پر حرف بھی آتا ہو۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور نظریۂ ارتقا

اب رہا معاملہ علامہ سید سلیمان ندوی کا، تو مجھے ندوی برادری کا ایک فرد ہونے اور بیک واسطہ علامہ موصوف کا شاگرد ہونے بلکہ آپ کی متعدد تصنیفات سے تلمیذانہ طور پر مستفید ہونے کے باوجود اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی تامل نہیں ہے کہ موصوف سے بھی اس مسئلے میں کچھ لغزش اور بے احتیاطی ہو گئی ہے۔ چنانچہ موصوف کا ایک مضمون "مسئلہ ارتقا اور قرآن مجید" کے عنوان سے "الندوہ" کے جنوری ۱۹۰۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا، جس میں موصوف نے بعض قرآنی آیات کو "مطابق ارتقا" دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس سلسلے میں دیگر علماء کی طرح موصوف کے بیانات میں ادّعائیت نہیں ہے،

بلکہ اس کو ایک ممکنہ تاویل قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ اپنے مضمون کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

"علمار کی خدمت میں گزارش ہے کہ ہم نے مذکورہ بالا آیتوں کے جو معنی قرار دئے ہیں، ان کا مقصد صرف فلسفیانہ مذاق والوں کو خاموش کردینا ہے، گو مفسرین ان آیتوں کے اور معنی سمجھتے ہیں، اور مجھے ان کی بھی صحت سے انکار نہیں لیکن عقل ونقل کی تطبیق کی غرض سے ہم نے جو معنی لئے ہیں وہ بھی غلط نہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ دونوں معانی کے متحمل ہیں"[1]

اصل میں سید صاحب بھی ارتقائیوں کے پروپگنڈے سے متاثر نظر آتے ہیں اور تاویل کے سلسلے میں انھوں نے بھی تقریباً مصری علمار کا موقف اختیار کیا ہے۔

نظریہ ارتقا کے سلسلے میں یہ ساری غلط فہمی اس بنیاد پر ہے کہ یورپ کے تمام سائنس دانوں نے اس مسئلے کو گویا کہ اجماعی طور پر تسلیم کرلیا ہے۔ جیسا کہ علامہ شبلی نعمانی نے سید صاحب کے مذکورہ بالا مضمون سے سات ماہ پہلے "الندوہ" ہی کے جون ۱۹۰۷ء کے شمارے میں "مسئلہ ارتقا اور ڈاروِن" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، اس میں اس کی طرف اشارہ اس طرح کیا تھا:

"لیکن ایسا مسئلہ جس کو قریباً یورپ کے تمام حکمار تسلیم کرتے جاتے ہیں، اس قابل نہیں کہ اس کو ہنسی میں اڑا دیا جائے"[2]

واضح رہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے یہ مضمون محض فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تحریر کرتے

---

[1] مقالات سلیمان: ۳/۱۷۴، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی، ۱۹۷۱ء

[2] مقالات شبلی: ۷/۶۲، ۱۹۵۳ء

ہوئے اس سلسلے میں بعض حکمائے اسلام کے نظریات بیان کئے ہیں۔ مگر اس میں قرآن مجید سے نفیاً یا اثباتاً کوئی استدلال نہیں کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ ایک تاریخی نوعیت کا مضمون ہے۔

غرض خود سید صاحب نے بھی اپنی حسب ذیل عبارت کے ذریعہ کچھ اس قسم کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا یہ مسئلہ اجماعی طور پر طے شدہ ہے:

"مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو مسئلہ ارتقا کو نہ صرف صحیح سمجھتا ہے بلکہ اس مسئلہ کی صحت کا اس کو اس درجہ اعتقاد ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جب قرآن مجید مسئلہ ارتقا کا منکر ہے تو کون مانے گا کہ قرآن پاک جدید فلسفے کے بالکل مطابق ہے؟ یورپ کے کل علمائے طبیعیات بھی اس گروہ کے ہم زبان ہیں۔" [1]

یہ ہے وہ پس منظر جس میں یہ مضامین اضطراری طور پر سپرد قلم کئے گئے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ یورپ کے تمام حکماء اور کل علمائے طبیعیات اس نظریہ کو صحیح سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ محض ایک پروپیگنڈہ ہے اور علمائے اسلام کی ایک خاص تعداد مغرب کے اس پروپیگنڈے سے متاثر نظر آتی ہے جب کہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ماہرین حیاتیات (BIOLOGISTS) کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو اس کو محض ایک مفروضہ (HYPOTHESIS) سمجھتی ہے حتی کہ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اس نظریہ کے حامی ہیں، جب کہ متعدد سائنس داں اور ماہرین معقول دلائل کی بنا پر اس کو غلط بھی قرار دیتے ہیں لہذا یہ کوئی اجماعی یا طے شدہ مسئلہ نہیں ہے۔

---

[1] مقالات سلیمان: ۳/۱۶۴

بہر حال سید سلیمان ندوی کے مضمون پر اگر علمی دیانت داری کے ساتھ تبصرہ کی
جائے تو کہنا پڑے گا کہ موصوف اس سلسلے میں مصری علماء ہی کی طرح تذبذب کا شکار نظر
آتے ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ ارتقا بجائے خود ثابت نہیں ہے
کیونکہ اس سلسلے میں جو دلائل بیان کئے جاتے ہیں ان سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا
مگر پھر فوراً ہی یہ کہتے ہوئے کہ "اگر مسئلہ ارتقا صحیح بھی ہو تو قرآن اس کا منکر نہیں"
بعض قرآنی آیات کی تشریح اس انداز سے کرتے ہیں گویا کہ قرآن ارتقا کی تائید
کر رہا ہے۔ اور اس سلسلے امام راغب اصفہانی کی ایک مجمل عبارت کا حوالہ بھی دیا۔
اور میں سمجھتا ہوں کہ سید صاحب جیسے صائب اور راسخ العقیدہ صاحب علم کی نگارشات
میں یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تحریر ہے جو ذرا "ڈھیلے ڈھالے" قسم کی ہے۔ مگر جیسا
مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے "مقالات سلیمان" کے دیباچے میں تصریح کی۔
کہ یہ مضمون سید صاحب کے ابتدائی دور کا ہے، جو بعد کے ذوق سے مختلف

ارتقا کا جادو چل نہیں سکتا

واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے بعض
علمی حلقوں ـــــ خصوصاً مصری علماء کے نزدیک ـــــ یہ ایک چلا ہوا فقرہ بلکہ
فیشن سا بن گیا تھا کہ "نظریۂ ارتقا اول تو ثابت نہیں ہے، اور اگر ثابت ہے
تو قرآن اس کا منکر نہیں ہے۔" مگر سوال یہ ہے کہ جب ارتقا بجائے خود
ثابت نہیں ہے تو پھر اس کو صحیح ثابت کرنے کا بیڑا ہی کیوں اٹھایا جائے
اس کو مستقبل کے مفسّر کے حوالے کیوں نہ کر دیا جائے؟ ظاہر ہے کہ جو چیز

---

[1] و [2] مقالات سلیمان، ص ۱۶۷ ـ ۱۶۹

بائے خود ثابت نہیں ہے اس کو ثابت کرنے کے آخر ہم خود مکلّف کیوں ہوں؟
ر وہ بھی قرآن عظیم جیسی کتاب میں تاویل کر کے! فرض کیجئے زمانہ مستقبل میں
تمام سائنس داں اس نظریہ سے اپنی دست برداری کا اعلان کر بیٹھیں، تو کیا
س غلط تاویل کا برا اثر نہیں پڑے گا؟ اور اس کی وجہ سے گمراہ فرقوں اور طبقوں کو
ی من مانی تاویلات کے لئے بڑھاوا نہیں ملے گا؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک کمزور موقف
ے جس کی وجہ سے قرآن حکیم بجائے خود مشکوک ہو جائے گا اور اس کی قطعیت متاثر
وجائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید ایک "لاریب فیہ" صحیفہ ہے جس میں اس قسم
چناں وچنیں کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

قرآن سے کوئی بات ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بغیر کسی تاویل یا انحراف
ے صرف اس کے ثابت شدہ نصوص یا واضح بیانات (جو اصول فقہ کی زبان میں عبارۃ النص
ر اشارۃ النص وغیرہ کہلاتے ہیں) سے استدلال کیا جائے۔ اور مجمل ومبہم آیات (متشابہات)
مفصل یا غیر مبہم آیات (محکمات) کی روشنی میں سمجھا جائے۔ ان اصولوں کی رو
ے بغیر کسی تاویل کے جو مفہوم ثابت ہوگا وہ قابل استدلال ہوگا اور اس کو قرآن کا
یح مفہوم ومنشا قرار دیا جائے گا۔ تمام علمائے حق کا طریقۂ کار یہی رہا ہے اور اسی میں
سلامتی ہے۔

غرض خدا کی شان دیکھئے جس نظریہ کے متعلق ایک "متفق علیہ" مسئلہ
نے کا دعویٰ کیا جا رہا تھا وہ لگ بھگ ایک صدی گزر جانے کے باوجود اب تک
صرف ایک مفروضے سے آگے بڑھ نہیں سکا ہے، بلکہ اب تو محققین اور
ل بصیرت اس مفروضے سے اپنی بیزارگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ کیونکہ
علمی حیثیت سے ثابت نہیں ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے جتنے
بھی طریقے اپنائے جا رہے ہیں، ان سب میں مسلسل ناکامی ہو رہی ہے۔

اور اس بے بنیاد نظریہ کو محض مادہ پرست ہی، مذہب کی ضد میں، اب تک
سے لگائے ہوئے ہیں۔ ورنہ اس میں اب کوئی جان باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اور
سلسلے میں محققین کے اعتراضات کا ایک دفتر سامنے آچکا ہے۔ انشاء اللہ اس
موضوع پر تفصیلی بحث اپنی زیر تکمیل کتاب "قرآن حکیم اور نظریہ ارتقا" میں
پیش کی جائے گی۔

مطبوعات ندوۃ المصنفین

قصص القرآن

قصص القرآن کا شمار ادارے کی نہایت ہی اہم اور مقبول کتابوں میں ہوتا ہے انبیاء (علیہم السلام) کے حالات اور ان کے دعوت حق اور پیغام کی تفصیلات قرآن کریم کی روشنی میں بیان کی گئی ہیں اس درجہ کی کوئی کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی کتاب کی چار ضخیم جلدیں ہیں۔

جلد اول میں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علی نبینا علیہما السلام کے مکمل حالات آگئے ہیں۔ صفحات ۵۴۴

جلد دوم۔ حضرت یوشع علیہ السلام سے لیکر حضرت یحیٰ علیہ السلام تک ان تمام پیغمبروں کے حالات سوانح حیات اور دعوتِ حق کا بیان ہے۔ صفحات ۲۸۰

جلد سوم۔ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی اور تاریخی واقعات کا عبرت آموز بیان ہے۔ صفحات ۴۱۲

جلد چہارم۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پاک کی اور دعوت کا مفصل حال اور محققانہ بیان مع دیگر ضروری حالات و واقعات اور مباحثِ مہمہ۔ صفحات ۵۲۰ متوسط تقطیع ۲۰×۲۶/۸

قیمت جلد اول طبع آفسیٹ	قیمت ۴۵/-	مجلد	۵۵/=
〃 جلد دوم	〃 ۳۵/=	〃	۴۵/=
〃 جلد سوم	〃 ۴۵/=	〃	۵۵/=
〃 جلد چہارم	〃 ۵۰/=	〃	۶۰/=
کامل چار جلدیں	۱۷۵/=	〃	۲۱۵/=

(پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۱۷۸۴ مجموعی قیمت ۱۷۵/=) ۲۱۵/=

مکمل لغات القرآن

یہ ہماری زبان میں لغت قرآن کے موضوع پر جامع، مکمل اور معتبر و مستند کتا
ہے جو قرآن مجید کے معنی اور مطالب کے سمجھنے اور حل کرنے میں ہر حیثیت سے مدد دے
اردو میں کوئی ایسی لغت آج تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ اس جلیل القدر ا
عظیم الشان کتاب میں الفاظ قرآن کی مکمل اور دل پذیر تشریح کے ساتھ تمام متعلقہ نحو
کی تفصیل بھی ہے۔ اہل علم و تحقیق، اساتذہ درس کے لیے اس کے علمی مباحث لائق
مطالعہ ہیں۔ "لغات قرآن" کے ساتھ الفاظ قرآن کی مکمل اور آسان فہرست
دی گئی ہے جس سے ایک لفظ کو دیکھ کر تمام لفظوں کے حوالے آیات قرآنی میں بڑی سہولت
سے نکالے جاسکتے ہیں۔

جلد	ابواب	صفحات	غیر مجلد	مجلد
جلد اول	باب الالف	صفحات ۴۳۲	غیر مجلد ۲۵/	مجلد ۵/
〃 دوم	باب الباتا باب الخاء	〃 ۳۲۰	غیر مجلد ۲۵/	〃 ۵/
〃 سوم	باب الدال المہملہ تا باب الشین المعجمہ	〃 ۳۰۸	〃 ۴۰/	〃 ۵۰/
〃 چہارم	باب الصاد المہملہ تا باب العین المہملہ	〃 ۳۸۶	〃 ۳۲/	〃 ۲/
〃 پنجم	باب الغین المعجمہ تا باب المیم	〃 ۵۰۰	〃 ۳۵/	〃 ۲۵/
〃 ششم	باب النون تا باب الیاء التحتانیہ	〃 ۳۲۶	〃 ۲۳/	〃 ۳/

پوری کتاب کے مجموعی صفحات ۲۱۸۴ متوسط تقطیع ۲۰×۲۶

مجموعی قیمت غیر مجلد ۱۸۰/

قیمت مجلد ۲۴۰/

پتہ:- ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

ابوحیان توحیدی

حیات وخدمات کا ایک تحقیقی جائزہ

(۴)

جناب محمد سمیع اختر فلاحی ایم، اے شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی
علی گڈھ

علمی کارنامے۔

علم نحو: "کان اماماً فی النحو واللغۃ والتصوف، فقیھامورخاً"
"وہ علم نحو، لغت اور تصوف کا امام تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ فقیہہ اور مورخ بھی تھا"

اس نے علم کے ہر میدان میں اپنا ایک منفرد اور مستقل مقام پیدا کیا۔ اور ہر میدان میں اپنی اعلیٰ صلاحیت، قابلیت اور قدرت کا لوہا تسلیم کر والیا۔ مختلف و قیع علوم میں اپنے فنی کمالات کے جوہر دکھائے۔

علم نحو ایک ایسا علم ہے جس کے بنیادی اصولوں اور فروعی اقسام سے پوری طرح واقف ہوئے بغیر کوئی شخص عربی زبان وادب میں پوری مہارت حاصل نہیں کرسکتا اور نہ ہی ایک صاحب طرز ادیب اور ناقد بن سکتا ہے۔ لہذا ایک ادیب کے لیے سب سے پہلے نحوی اصول وضوابط اور صرفی قواعد واصطلاحات سے مکمل آگہی ناگزیر ہے۔ امام سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں ابوحیان توحیدی کو علم نحو کے اہم ستونوں میں سے ایک ستون قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ

توحیدی نے ابوسعید سیرافی جیسے یکتائے روزگار نحوی سے علم نحو کا درس لیا جو ا
وقت کے امام نحو تھے۔ توحیدی نے ان کی تین ہزار صفحات پر مشتمل " الکتاب " کی
کا مطالعہ کیا۔ اس کے ساتھ یونس کی " کتاب اللغات " کا مطالعہ بھی کیا۔ علی بن
الرمانی النحوی سے بھی مختلف نحوی مسائل پر بحث و مباحثہ کرتے۔ ابوحیان
تصنیفات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے سارے نحویو
واقف تھا اور نحو کے نہایت باریک اور دقیق مسائل پر بھی اس کی نظر تھی جو کس
نحوی کے لیے وجہ امتیاز ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے مخالف و موافق دونو
ہی مکاتیب فکر کے نظریات سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے ابتدائی دور کی تصنیف
خاص طور سے " البصائر والذخائر " " الامتاع والمواضعة میں بہت سا
نحوی مسائل پر تفصیلی گفتگو موجود ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ نحو اور منطق کے درمیا
فرق صرف اتنا ہے کہ نحو کا تعلق فطرت و طبیعت سے ہے جب کہ منطق کا عقل
خرد سے ہے " المقالمسات " میں تین فصلوں کے اندر زمان و مکان کے اعتبار سے
نحو و منطق کی ترقیات اور اس میں رونما ہونے والے تغیرات اور اسی طرح کے د
نحوی مسائل پر فلسفیانہ انداز میں مدلل گفتگو کی ہے۔ اور اس نے تفصیل سے بتا
ہے کہ حرکتوں کی تبدیلی سے معانی کیونکر تبدیل ہو جایا کرتے ہیں اور نحوی اصول و
قواعد سے عدم واقفیت کی صورت میں انسان کس طرح معانی و مفہوم کو سمجھنے
غلطیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس نے وقت کے بڑے ادیبوں پر نحو و صرف
کمزوری کا الزام لگایا ہے۔ اس نے ابو اسحاق صابی، ابن عباد اور ابن عمید پر
نحو سے بخوبی واقف نہ ہونے پر لعن طعن کیا ہے۔ چنانچہ ابوحیان توحیدی کا شما
اس دور کے نحو و لغت کے علماء میں ہوتا تھا۔ اس نے الگ سے نحو پر کوئی کتاب
نہیں تصنیف کی بلکہ زیادہ تر نحوی مسائل کا تذکرہ علم و فلسفہ اور کلام کے ضمن

ملتا ہے۔ اگر ان متفرق چیزوں کو ایک جگہ یکجا کر دیا جائے تو نحو کی ایک ضخیم کتاب ن سکتی ہے۔ اس بصائر میں، فعل، اقسام فعل، علامت رفع، نصاب ز، اقسام اسم اور صفت وغیرہ سے بحث کی ہے۔[۴۲]

علم کلام و فلسفہ: یاقوت حموی، السبکی، ابن حجر العسقلانی اور دیگر مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ابوحیان توحیدی اپنے وقت ا ماہر متکلم و فلسفی تھا۔ اس کی تصنیفات میں نہ صرف یہ کہ علم کلام و فلسفہ کے باحث کی تفصیل ملتی ہے بلکہ اس نے اپنے عہد کے بڑے متکلمین پر تنقید بھی کی ہے اور ان کا مذاق بھی اڑایا ہے جس سے علم فلسفہ و کلام میں اس کی بصارت بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ علم کلام کے اندر لیاقت و مہارت کا پیدا ونا فطری بات ہے کیونکہ اس نے ابوسلیمان المنطقی، ابواسحاق الصضیبی جیسے وقت ے بلند پایہ فلاسفہ کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ ابوحیان کا خیال تھا کہ ہر یز کی اصل حقیقت و ماہیت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلے پر فلسفیانہ منطقیانہ انداز میں گفتگو کی جائے۔ مگر اس کے ساتھ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ دینی مذہبی مسائل میں فلسفے کی بنیاد پر غور و فکر کا نتیجہ شک و شبہ میں مزید اضافہ، اور ختلاف و انتشار کو ہوا دینے کے بجائے اور کچھ نہیں نکلتا۔[۴۳] اس نے اشعری، معتزلی، امامی اور دیگر متکلمین کے گمراہ کن فلسفیانہ تاویلات کی تردید کی وہ ایسے گوں کا سخت مخالف تھا جو دین کے بنیادی اصول و کلیات کو علم کلام کی کسوٹی پر کھنا چاہتے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ علم کلام و فلسفہ کے مباحث الگ ہیں اور دینی اصول و کلیات اور مذہبی عقائد و تعلیمات علیحدہ۔ دین و شریعت کو فلسفے موضوع نہیں بنایا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تحریک اخوان الصفا کا بھی مخالف تھا کیونکہ یہ لوگ فلسفہ و شریعت کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بتاتے تھے۔[۴۴]

اس فلسفہ وعلم کلام کے درمیان فرق کیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ فلسفہ کا شریعت سے اور شریعت کا فلسفہ سے کوئی تعلق نہیں دونوں کے مباحث و معانی اور موضوعات و مضامین جداگانہ ہیں۔ چنانچہ وہ کہتا تھا کہ اگر علم کلام کی بنیادوں پر شریعت کی توضیح و تشریح کی گئی تو شریعت کا ایک تہائی حصہ ساقط ہو جائے گا۔ کیونکہ شریعت کی بنیاد تو حسن ظن، اخلاص و یقین اور غیب پر ایمان میں ہے۔ اور جس کسی نے شرعی امور کو عقل کی کسوٹی پر کسنا شروع کیا اور قیاس و رائے کو اصل بنیاد بنا لیا تو اس نے پریشانیوں اور مصیبتوں کو اپنے سر مول لے لیا۔ اس نے شرعی موضوعات کو چھوڑتے ہوئے علم کلام سے متعلق مسائل پر اظہار خیال کیا۔ اپنے زمانے کے مشہور متکلمین سے مناظرے بھی کیے لیکن اس نے علم کلام کو کبھی صحیح راستہ اور ہدایت کی دلیل تصور نہیں کیا۔ ماہر متکلمین و فلاسفہ سے علمی مناظرے علم کلام میں اس کی مکمل دسترس کی دلیل ہیں۔

تصوف و طریقت: ابوحیان توحیدی کی سیرت اور ان کی ادبی خدمات کا مطالعہ کرنے والا شخص تصوف و طریقت کے میدان میں اس کی نمایاں سرگرمیوں سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔ اس کی زندگی کے بیشتر حصوں پر تصوف کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اسی طرح اس کی ادبی خدمات، تحقیقی تصنیفات و علمی تالیفات میں بھی تصوف کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ بیشتر ترجمہ نگاروں نے اس کے وصف کو سب سے زیادہ نمایاں طور پر پیش کیا ہے اور بعض سوانح نگاروں نے تو اس کے مختلف صفات میں سے صرف اسی ایک صفت کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔ یاقوت حموی نے "معجم الادباء" اور السبکی نے "طبقات الشافعیہ" میں اس کو شیخ طریقت اور امام صوفیاء کے نام سے پکارا ہے۔ "شیراز نامہ" اور "شد الازار" میں تو ابوحیان کو شیراز کے چند سرکردہ صوفیوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس کے رفقاء کی اکثریت فقراء و

مساکین اور دنیوی لذات و تعیشات سے کنارہ کش رہنے والے افراد کی تھی۔
ابن سمعون، جعفر بن حنظلہ، ابن السراج، ابن الجلاء، ابوزید المروزی وغیرہ کا تعلق
طریقت و تصوف کے میدان سے تھا۔ اور یہ سب کے سب اُس کے قریبی دوستوں
میں تھے۔ اس کے اساتذہ میں سے ابوسعید السیرافی، ابوسلیمان المنطقی اور یحییٰ
بن عدی وغیرہ کا شمار بھی کبھار صوفیاء میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی زندگی
کے زیادہ حصے پر تصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ اگر ابوحیان توحیدی نے زندگی کے
چند لمحات وزراء و حکام کے آستانوں پر دستک دیتے، ان کے درباروں کا چکر
کاٹنے میں نہ گزارا ہوتا، عوام و خواص کو اپنی نقد و تنقید کا نشانہ نہ بنایا ہوتا۔
ان کی ہجو اور برائیاں بیان کرنے سے باز رہا ہوتا اور اپنی تالیفات و کتابوں
میں بعض فحش اور سوقیانہ چیزوں کو داخل نہ کیا ہوتا تو لوگ اسے بالاتفاق صوفیاء
کا امام تصور کرتے۔ یہی وہ چند چیزیں ہیں جو اس کے نفس کی صفائی، اخلاق کی
بلندی، طلب آخرت کے سلسلے میں اخلاص کو مشتبہ بناتی ہیں۔ تصوف کے
سلسلے میں اس کا کوئی خاص مکتبۂ فکر نہ تھا اور نہ ہی اس نے کسی جدید مکتبۂ فکر
کو ایجاد کیا۔ بلکہ اس نے تمام ہی طریقوں کا مطالعہ کیا اور ان میں بہتر طریقے کو
سراہا اور اس کی اتباع کی۔ ابوحیان نے تصوف کے مختلف موضوعات پر کتابیں
لکھیں اور زندگی کے آخری ایام تک فلسفیانہ اندازیوں کی تصنیفات کی جمع
و ترتیب میں مشغول رہا۔

ادبی مقام: کوئی بھی بہترین ادب دو طرح کے جذبات سے خالی نہیں
ہوسکتا یا تو اس کے اندر الفت و محبت کے جذبات ہوں
گے یا پھر نفرت و حسد کے احساسات کی آمیزش ہوگی۔ عربی زبان و ادب کی تاریخ
کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ کوئی ایک شاعر، خطیب، مصنف یا

انشاء پرداز ایسا نہیں گذرا جس کے افکار و خیالات اور تصنیفات و تخلیق
میں دوستی و الفت اور عشق و محبت کی گرمی یا کینہ و حسد اور بغض و نفرت کے
موجود نہ رہے ہوں. کسی فنکار کے اندر اس طرح کے مثبت یا منفی جذبات
یا تخریبی خیالات کے رونما ہونے میں گرد و پیش کے ماحول اور خود اس کے ذاتی
و کوائف کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے. اگر فنکار ذہنی اعتبار سے مطمئن و پرسکون
اعتبار سے خوشحال و فارغ البال اور کسی طرح کے رنج و الم، فکر و غم یا
و بے چینی کا شکار نہیں ہے تو ظاہر ہے اس کی تخلیقات میں تعمیری رجحان او
و مسرت کے جذبات کا اظہار ہوگا. لیکن اگر اس کے برخلاف اگر وہ ذہنی طور
مضطرب و پریشان اور معاشی طور پر بدحال ہے تو اس ذہنی کرب اور معاشی
کی جھلک کا اس کی تخلیقات میں ظاہر ہونا ایک فطری امر ہے۔

ابو حیان توحیدی کا تعلق ادبا و انشاء پردازوں کے اس دوسرے
سے ہے کہ وہ سراپا فقر و فاقہ اور کلفت و مصیبت کی پیداوار تھا۔ اصحاب
اور اہل ثروت و دولت کی طرف سے مسلسل بے اعتنائیوں نے اس کے اندر
ذہنیت پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ادبی تخلیقات کے اندر امراء و
کے خلاف غیظ و غضب اور بغض و نفرت کا ایک سیلاب نظر آتا ہے۔ اس کی تحریر
میں فقر و غنا، امارت و غربت اور نعمت و نقمت کی صحیح عکاسی ملتی ہے۔ ابو
توحیدی کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت دنیا و اہل دنیا کے خلاف بغض و
کا اظہار ہے۔ عہد شباب میں ابن عمید اور صاحب بن عباد وغیرہ کی سخاوتوں
حکایات سن کر دنیوی عیش و آرام اور مزید مال و دولت کے حصول کی امید
ان کے آستانے پر قسمت آزمائی کی۔ لیکن یہاں اس کے ارزوں کی تسکین اور تم
کی تکمیل کے بجائے اس کے جذبات کو شدید ٹھیس پہنچی، اس کی انا و خودداری

ح مجروح ہوئی۔ اسی طرح بعد کی زندگی میں بھی مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا
ں نے اس کے خیالات کو مضمحل اور افکار کو پیچیدہ بنا دیا تھا۔ ڈاکٹر ذکی مبارک
یال ہے کہ ابوحیان توحیدی نے ادب کو حصول رزق کے مختلف ذرائع میں سے
ذریعہ تصور کر لیا تھا[۴۶] اس نے پوری زندگی حصول رزق کے تگ و دو میں
ری یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کی قدر افزائی کی اور اسے مال و دولت
نوازا۔ اس نے بھی اس احسان کے بدلے میں اُن کی خوب خوب تعریف کی،
ی شان میں مدحیہ قصائد تحریر کیے۔ اور جن لوگوں نے اس کی عدم توقیری کی
اسے انعام واکرام سے نہیں نوازا تو پھر ان کے خلاف اپنے دل میں بغض و نفرت
بھڑکتے ہوئے شعلوں کو باہر نکلنے سے نہ روک سکا۔

وہ آرام زندگی سے کافی پریشان نظر آتا ہے تصنیفات میں زمانے کی
ظریفیوں کا شکوہ کرتا ہے اور رسائل و خطوط میں اپنی محرومیوں کا رونا روتا ہے
ی تمام ہی تحریروں میں یاس و قنوطیت اور شکوۂ زمانہ کا پہلو غالب ہے۔
کے مصائب و پریشانیوں کی داستان اس قدر طویل ہے کہ یہ اندازہ لگانا مشکل
کوئی زمانہ ایسا بھی رہا ہوگا جب کہ وہ فارغ البال اور خوشحالی رہا ہوگا
ستوں کی رفاقت ملی ہو اور اعزہ و اقربا کے خلوص و محبت سے لطف اندوز
ہو۔ اسی طرح "کتاب المحاضرات" کے اندر ابوحیان نے ایک واقعہ نقل
ہے کہ "میں اور نصیبی دونوں نے مل کر ایک صاحب ثروت سے ملاقات کا
صلہ کیا جس کے جود و سخاوت کا شہرہ تھا کہ اُس نے آج تک کسی سائل کو اپنے
سے خالی ہاتھ واپس نہیں کیا۔ اور صاحب علم و فن حضرات کا قدردان اور ان پر
زیادہ ہی مہربان ہے۔ ابوحیان کا کہنا ہے کہ مسلسل پندرہ مرتبہ گھر کا چکر لگانے
بعد کہیں جا کر اس سے ملاقات کا نمبر آیا۔ لیکن نصیبی نے تھک کر میرا ساتھ

دینے سے انکار کر دیا۔

یہ تو اس کی ادبی سرگرمیوں کی معمولی جھلک تھی جس سے کسی حد تک اس کے بلند و عالی اور مخصوص ادبی مقام کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ ابوحیان توحیدی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے علم و ادب کے مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں تصنیف کیں اور ان سب میں زبان و بیان کے فنی محاسن اور ادب کی اعلیٰ ترین خوبیوں کو بہت حد تک پوری کامیابی کے ساتھ برتا۔ مثال کے طور پر ابوحیان کی یہ عبارت میں نے شاعر الخوارزمی کو کہتے ہوئے سنا

اللھم انفق مسوق الوخاء، فقد کسدت واصلح قلوب الناس فقد فسدت، ولا تمتنی حتی قبور الجھل کما بار العقل، ویموت النقص کما مات العلم، تو میں نے کہا " اللھم اسمع واستجب، فقد برح الخفا وغلب الجفاء، وطال الانتظار، ودقع الیاس ومرض الامل، واستفی الوجاء"۔ [۴۹]

علم و ادب کے میدان میں اس کے بلندیٔ مقام کو ثابت کرنے کے لیے اس امر کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ اس کا تعلق، اخوان الصفا سے بھی تھا جو چوتھی صدی ہجری کی سب سے بڑی علمی و ادبی تحریک تھی۔ لیکن چونکہ یہ تحریک امراء وسلاطین کی نظر میں نہایت معیوب و ناپسندیدہ تھی اس لیے اس کے تمام امور صیغۂ راز میں رکھے جاتے، وہ اور اسی طرح اس تحریک کے مبلغین و دعاۃ بھی عوام و خواص کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔ رسائل اخوان الصفا کی علمی و ادبی حیثیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ رسائل عربی ادب و ثقافت، فلسفہ و کلام، تصوف و طریقت، طب و سائنس اور سیاست و حکومت کے مختلف موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان رسائل کے مصنفین اور مؤلفین کے بارے میں

...وئی قطعی تاریخی ثبوت نہیں ملتا، لیکن مؤرخین کا خیال ہے کہ ابوحیان کا تعلق ...صنفین کے اس زمرے سے تھا۔

...وتھی صدی ہجری کی نثری خصوصیات:

چوتھی صدی ہجری میں عربی نثر اپنے ابتدائی ...رتقائی مراحل طے کرنے کے بعد نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی۔ اس کے اندر وہ ...مام اوصاف اور خوبیاں ابھر کر سامنے آگئی تھیں جو کسی نثر کے فنی نمونے کے لیے ...زیر رہا کرتی ہیں۔ چوتھی صدی ہجری میں عربی نثر نگاری کے اندر کچھ ایسی نمایاں ...بیاں پیدا ہوئیں جن کے بنا پر یہ عہد گذشتہ زمانوں سے ممتاز اور منفرد ہو جاتا ہے ...، تمام نثری خصائص اور فنی محاسن جن کی پہلی، دوسری، تیسری ہجری میں ایک ...لک ملتی ہے اس صدی میں پہنچتے پہنچتے کمالی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ ابن عمید، ...ارزمی، بدیع الزماں جیسے بلند پایہ صاحب طرز انشاء پرداز اسی دور کی ...یدا وار ہیں۔

اس دور کی نثر نگاری میں پہلی چیز جو نظر آتی ہے وہ یہ کہ صنائع و بدائع کی ...ف بہت زیادہ توجہ دی گئی۔ ان کے استعمال میں سابقہ حدود دیا بندیوں کی ...ایت نہ کرتے ہوئے اسراف اور مبالغے کی سرحدوں سے بھی آگے نکلنے کی کوشش ...گئی۔ بلاغت کے مختلف اصولوں توریہ، موازنہ، مطابقہ اور جناس وغیرہ کا ...ظ کیا گیا۔ محسنات لفظیہ اور محسنات معنویہ کے اصول وضع کیے گئے۔ ہر طرح کے ...ائل اور تصنیفات میں مسجع بندی کے اصولوں کا پورا لحاظ کیا گیا۔ یہاں تک کہ مناظرے ...ر دینی مسائل کے افہام و تفہیم کی غرض سے لکھے جانے والے خطوط کی عبارت بھی ...جع ہوتی۔ اس دور کے انشاء پرداز ہر قسم کے موضوعات میں مسجع کے اصولوں کی ...ل پابندی کی گئی۔ چنانچہ بدیع الزماں ہمدانی، ابوبکر خوارزمی اور شریف رضی کی

طرح ابوحیان توحیدی کی تحریروں میں بھی یہ خصوصیت پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اس دور میں دوسری اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ رسائل کی ابتداء عمدہ اشعار اور پسندیدہ امثال سے ہونے لگی، جس طرح کہ شروع کے ادوار میں لوگ رسائل کی ابتداء حمد و سلام سے کرتے تھے اور اختتام بھی "السلام علیکم" پر کرتے تھے۔ لیکن اس دور میں بہترین اشعار نے اس کی جگہ لے لی۔ ابتداء اور انتہا دونوں ہی اشعار کے ذریعہ ہونے لگی۔ اشعار کے انتخاب میں اس بات کی رعایت رکھی جاتی کہ وہ خط کے اندر مذکورہ موضوع اور مفہوم سے متعلق ہوں۔

تیسری اہم تبدیلی یہ ابھر کر سامنے آئی کہ اس دور کے انشاء پردازوں نے شاعری کے اصناف سخن غزل، مدح، ہجو، فخر اور وصف نگاری کو نثری موضوعات میں تبدیل کر دیا۔ اور پھر اس طرح نثر کے اندر شاعری کی تمام تر خصوصیات استعارہ، کنایہ، تشبیہ اور خیال آفرینی کے عناصر داخل ہوتے گئے۔ اس دور کے فنی ادب میں صرف نثر و شاعری کے موضوعات ہی نہیں بلکہ تمام ہی عقلی علوم فلسفہ، منطق، علم کلام، فقہ، مذہبی علوم اور تصوف وغیرہ کے موضوعات بھی نثری ادب کا حصہ بننے لگے۔ اس دور کے منطقیوں اور فلاسفہ نے منطق و فلسفہ کے وقیع مسائل اور تصوف اور طریقت کے گنجلک اصولوں کو ادبی پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

ابوحیان کی نثر نگاری: ابوحیان توحیدی کے نثری نمونوں میں ان تمام تغیرات اور تبدیلیوں کا اثر نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس نے مختلف عقلی و نقلی علوم کو خالص ادبی انداز میں پیش کیا۔ ابوحیان کو زبان و بیان پر قدرت کا ملہ حاصل تھی۔ اس کے پاس موقع و محل کے اعتبار سے مؤثر الفاظ اور دلنشیں ترکیبوں کا اتھاہ ذخیرہ تھا۔ اُس کے دل میں جو کوئی خیال بھی

پیدا ہوتا، وہ اپنے اظہار بیان میں سہل، مؤثر اور ترقی یافتہ اسلوب کو اختیار کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ کلام کے فنی حسن و جمال پر بھی گہری نظر ہوتی۔ وہ محبت و دوستی کے خیالات کو نہایت ہی جامع، مؤثر اور ادبی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"وما من احد الاوله فی العدالعد حصة، لانه لا یخلو احداً من جار او معامل او حمیم، او صاحب، او رفیق او سکن او صدیق او الیف او ولی او خلیط کمالا یخلوا لیضا من عدا و او کاشح، او مداج او مکاشف، او حاسد، او شامت او منافق، او منافذ، او معاند، او معزل او فصل، او فعل"[٥٨]

اس ادبی شہ پارے سے ابوحیان توحیدی کے زبان اور بیان پر غیر معمولی قدرت اور مترادفات کے استعمال میں کامل مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ وجدانی قوت اور فطری صلاحیت ہے جس سے اکثر انشاء پرداز محروم رہتے ہیں۔ اسی طرح اس نے دوستی وعشق اور دوستی ورشتہ داری کے درمیان موجود لطیف فرق کو نہایت ہی ادبی انداز میں بیان کیا ہے:

"مناغاة الصدیق اعبث بالروح واندی علی الفواد من مغازلة المعشوق، وانك تفزع بحدیث المعشوق الی الصدیق ولا تفزع بحدیث الصدیق الی المعشوق"[٥٩]

زبان وادب کے طالب علم کو اس طرح کے فصیح وبلیغ عبارتوں، دل کش و حسین انداز بیان اور سہل و مؤثر اسلوب سے بہت کم واسطہ پڑتا ہے۔ ابوحیان ہی ہے جو علم کے ہر موضوع میں عربی نثر نگاری کے فنی محاسن، تعبیرات کی جدت آفرینی اور مترادفات کی بوقلمونی کی سیر کراتا ہے۔ وہ الفاظ و معانی کے باہم حسن امتزاج سے کلام کے اندر ایسا جادو جگاتا ہے کہ قاری اس کی سحر انگیزی اور اثر آفرینی میں کھو

کھو جاتا ہے۔ اس کی تحریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان کے
الفاظ و معانی کا ایک امنڈتا ہوا طوفان موجود ہو۔ اس نے فلسفہ، علم کلام
تصوف اور منطق جیسے خشک و دقیق موضوعات کو ایسے شیریں الفاظ
سہل اسلوب میں بیان کر دیا ہے کہ قاری کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ
فلسفہ و تصوف کا مطالعہ کر رہا ہے یا کسی ادبی شہ پارے سے لطف اند
ہو رہا ہے۔

شعر و شاعری: چوتھی صدی ہجری کے انشا پردازوں کی ایک نمایا
خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ان کی اکثریت نثر نگار
کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری سے بھی واقف ہوتی تھی اور فنکار موقعہ و م
کے اعتبار سے جو چیز زیادہ موثر ہوتی اسی فن میں اپنے خیالات و تاثرات
اظہار کرتا۔ شاعری و نثر نگاری باہم ایک دوسرے سے اس حد تک مل
تھے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعر اس دور میں کسی حد تک نثر ہی کا ایک جز بن چکا
اس دور کے دیگر ادباء کی طرح ابو حیان کے اشعار بھی ملتے ہیں[۵۵] لیکن ا
حیثیت نہیں کے برابر ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے اندر بیک وقت
نظم و نثر کا یکساں ملکہ ہو، بلکہ فطری طور پر آدمی ایک میدان میں آگے بڑھ
ہوا ہوگا۔ اسی طرح ابو حیان توحیدی اصلاً ادیب تھا اور یہ بات بھی تقر
معروف و مشہور ہے کہ اس کے اساتذہ میں کوئی اچھا اور بلند پایہ شاعر نہ تھا
اس کے اساتذہ میں سے یحییٰ ابن عدی اور ابو سلیمان المنطقی کبھی کبھار ایک دو
اشعار کہہ لیا کرتے تھے جن کا فنی و ادبی اعتبار سے کوئی مقام یا رتبہ نہ تھا
اسی طرح معتبر تاریخی سیر و توں میں اس بات کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ شا
تھا۔ یہ "الامتاع" میں مذکور ہے کہ ابن العارض نے ان سے ایک یا دو شعر

کی درخواست کی تو اس نے یہ کہتے ہوئے سنانے سے انکار کر دیا:

" لست کن الشعر و الشعر ادطی مستیٔ و اکرہ ان اخطو علی وحف وا حتی غیر محض "

الصدقۃ والصدیق میں کچھ ایسے اشعار کا ذکر ہے جن کا سیاق کلام اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ اشعار اسی کے ہیں:

أن کنت تطلب فضلا اذ ذکرت و مجدا
فکن بعدك خِلاً وکن لخلیلك عبدا [۵۲]

اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر اس نے اپنے کسی دوست کو نصیحت کرتے ہوئے چند اشعار کہا ہے:

لا تجعلن بعد داری مخستا نصیبی
مغرب متخص یعید امی النوا و تحریب
درب شخص تربت ما الیك غیر حبیب
ما البعد والترب الا ما کان بین القلوب [۵۳]

ڈاکٹر کرد علی نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ابو حیان موسیقی و غنائیہ اشعار میں بھی دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اور اس کی طرف چند غزلیہ اشعار کو بھی منسوب کیا ہے:

یا صاحبی دعا الملام واقصرا

ترك الرھوی یا صاحبتی حنشارۃ

کم لمت قلبی کی یفیق فقال لی

لجت یمین ما لھا کفارۃ

الا افیق ولا افتر لحظۃ

أن أفت لم تعشق فانت حجارۃ

الحب اول ما یکون بنظرۃ

وکن الحقائق بعد ذہ بشہادۃ[۵۵]

لیکن یہ اشعار اس قدر سوقیانہ اور عوامی ہیں کہ ابوحیان جیسے بلندپایہ صاحب طرز ادیب کی طرف ان کا انتساب محل نظر ہے۔ چنانچہ عبدالرزاق محی الدین نے مختلف تاریخی شواہد کی روشنی میں ابوحیان کی طرف ان کے انتساب سے انکار کیا ہے۔

تصنیفات: ابوحیان توحیدی کا شمار ان مصنفین میں ہوتا ہے جنھوں نے مختلف علمی و تحقیقی موضوعات پر قلم اٹھایا اور اس موضوع کا حق ادا کر دیا۔ ابوحیان توحیدی کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے جن میں بیشتر دستبرد زمانہ کے نذر ہو گئیں۔ اُن کی تصانیف میں سے بہت کم کا پتہ چل سکا ہے اور ان میں سے بھی اب تک صرف چند کتابیں ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو سکی ہیں۔ ذیل میں ان کی چند کتابوں کا تعارف پیش خدمت ہے۔

الامتاع والموانسہ: یہ ایک ضخیم ادبی تصنیف ہے۔ سب سے پہلے اس کتاب کے قلمی نسخے کو مرحوم احمد ذکی پاشا نے مکتبہ "طوب قبوسائی" میں دیکھا۔ اور اس کی فوٹو کاپی لے کر قاہرہ آئے۔ اسے اپنے خاص لائبریری میں محفوظ رکھا، اس کے فہرست کو درست کیا، اسماء اعلام کو ترتیب دیا۔ شاید وہ اس کو ایڈیٹ کر کے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن یہ نسخہ ان کی لائبریری ہی میں تھا کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ سید احمد یسٰی جلال نے اسے خرید کر دار الکتب مصریہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۴ء میں الجنۃ التالیف الترجمۃ والنشر، کے تحت ڈاکٹر احمد امین اور مرحوم احمد الزین کی نگرانی میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل

اور شروع دور کی تصنیف ہے جب کہ اس کے اوپر یاس وقنوطیت کا غلبہ زیادہ نہ تھا۔

اس کتاب کا شمار ابوحیان توحیدی کی چند معرکۃ الآرا ادبی تصانیف میں ہوتا ہے۔ یہ ایسی تصنیف ہے جس پر وہ جتنا بھی فخر کرے کرسکتا ہے۔ اس کے اندر جدید معلومات اور غیر معمولی قوت یادداشت کی جھلک ملتی ہے۔ یہ ابن عارض کے ساتھ ہونے والے علمی وادبی سوالات وجوابات کا مجموعہ ہے۔

وجہ تالیف: اس کتاب کی تالیف کا سبب اس کا محاسن اور دوست ابوالوفا مہندس تھا۔ در در کی ٹھوکریں کھانے اور مسلسل ناکامیوں کا سامنا کرنے کے بعد ابوالوفا ہی کے ذریعہ مشہور بویہی وزیر ابن سعد ان کی قربت ملی۔ وزیر نے اسے اپنے مصاحبوں میں شامل کرلیا۔ ابن سعدروزانہ ابوحیان کے ساتھ شبینہ محفل منعقد کیا کرتا تھا۔ ابن سعدان مختلف موضوعات پر سوالات کرتا اور ابوحیان ان کا علمی وتحقیقی جواب دیتا۔ پھر ابوالوفا کی خواہش پر اس نے ان تمام سوالات وجوابات کو ایک جگہ یکجا کردیا۔

موضوع اور مضمون: "الامتاع والموانسۃ" بھی الف لیلیٰ کے طرز پر لکھی گئی ایک کتاب ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ الف لیلہ ایک ہزار راتوں پر مشتمل ہے اور "الامتاع" صرف چالیس راتوں پر الف لیلہ میں زیادہ تر افسانوی واقعات اور عشق ومحبت کی داستانیں ہیں جبکہ الامتاع کے مباحث سیاسی، عقلی، فکری اور واقعاتی ہیں۔ ابن سعدان، ابوحیان سے علم وادب، فلسفہ ومذہب، تصوف وطریقت، سیاست وحکومت اور مختلف مشہور تاریخی وعلمی شخصیات کے متعلق سوالات کرتا ہے توحیدی ان سوالات پر غور کرکے اپنے خیالات کو پیش کرتا ہے۔ ابوحیان کے

یہ جوابات انتہائی عالمانہ اور بڑے ہی سنجیدہ ہیں جس سے ابن سعدان اور ابو حیان توحیدی دونوں ہی کی ذہانت اور عبقریت کا پتہ چلتا ہے۔ بالعموم گفتگو کی ابتداء ابن سعدان کی طرف سے ہوتی ہے اور گفتگو کے خاتمے پر وہ ابو حیان سے کوئی اچھا سا شعر یا اس گفتگو کے حسب حال کوئی لطیفہ سنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ اس کے زیادہ تر مباحث بغداد اور وہاں کی شخصیات سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کے ذریعہ عہد بوہی کے ثقافت و کلچر، اس زمانے کی عقلی و علمی سرگرمیوں، فلسفہ و علم کے میدان میں ہونے والی ترقیوں کا علم ہوتا ہے اس کتاب میں اس دور میں ہونے والے علمی مناظروں کی بھی ایک جھلک ہے۔ اخوان الصفا کے بارے میں کچھ اہم انکشافات ہیں۔ اس کتاب میں مختلف موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد توحیدی کے علم و فضل اور ادب و انشاء کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

ترجمہ نگاروں کے درمیان یہ امر مختلف فیہ ہے کہ "امتاع" کس کی فرمائش پر لکھی گئی، عام رجحان یہی ہے کہ یہ کتاب ابوالوفا کی فرمائش پر لکھی گئی۔ اور یہ خیال بہت حد تک درست ہے۔ لیکن ڈاکٹر کرد علی اور صاحب "اخبار العلماء باخبار الحکماء" نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ کتاب "ابوالوفا" کے لیے نہیں بلکہ ابو سلیمان منطقی کے لیے لکھی گئی۔ ان کا خیال ہے کہ:

"ابو سلیمان ایک چشمہ تھے، ان کے جسم پر سفید داغ تھے، وہ زیادہ تر سوسائٹی سے الگ تھلگ اپنے گھر میں گوشہ گیر رہتے۔ اس کے پاس صرف وہی لوگ آتے جو اس چشمہ علم و عرفاں سے سیراب ہونا چاہتے۔ ابو سلیمان کو حکومت کے حالات و حوادث سے دلچسپی تھی اور وہ ان سے باخبر رہنا چاہتے تھے اور ابو حیان

توحیدی ان کے خاص شاگردوں میں تھا۔ اور وہ امراء کی محفلوں میں جاتا رہتا۔ اس لیے اسے ہر قسم کے حالات سے واقفیت ہوتی رہتی اور جب کوئی نئی خبر معلوم ہوتی اپنے استاد تک پہنچا دیتا اور اس مقصد کے تحت اس نے "الامتاع والموانسۃ" لکھی۔

لیکن مندرجہ ذیل دلائل کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب ابوالوفا ہی کے لیے لکھی گئی۔

۱۔ الامتاع والموانسۃ میں ابوسلیمان پر چند سخت تنقیدیں موجود ہیں۔ اگر سلیمان کے لیے لکھی گئی ہوتی تو اس میں یہ تنقیدیں نہ ہوتیں یا ان کا لب ولہجہ نرم ہوتا۔

۲۔ الامتاع میں کثرت سے ابوسلیمان کے اقوال درج کیے گئے ہیں۔ اگر وہ خود اس کے لیے تحریر کی گئی ہوتی تو خود سلیمان کو اس کے اقوال سنانے کی کیا ضرورت۔

۳۔ الامتاع میں ابوحیان اس شخص سے صلہ کا بھی طالب ہے جس کے لیے اس نے کتاب لکھی جب کہ ابوسلیمان کے افلاس کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے مکان کا کرایہ بھی بمشکل ادا کر پاتے تھے۔ ایسے شخص سے اسے کسی صلہ کی کیا امید ہو سکتی تھی۔ اس کے بالمقابل ابوالوفا نہایت بلند پایہ شخص تھا، وزیر اعظم سے بہت قریب تھا بڑے بڑے امراء سے اس کے تعلقات تھے۔ اس طرح ابوالوفا اس پوزیشن میں تھا کہ اس سے صلہ کی امید کی جا سکتی تھی۔

الصداقۃ والصدیق: جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے یہ کتاب دوستی اور دوست کے موضوع پر ہے۔ دوست اور دوستی کے مختلف اقسام وانواع پر جس قدر مواد فراہم ہو سکتا ہے اس میں

موجود ہے۔ اخوانیات اور الفت و محبت کے موضوع پر اس سے بہتر اور کو
کتاب نہیں ہے۔ دوستی کے مختلف معیار و نظریات کے سلسلے میں احادیث رسول
اقوال صحابہؓ اور قدیم علمی و تاریخی شخصیتوں کے زریں اقوال سے مدد لی گئی ہے
اس کتاب میں توحیدی نے حقیقی دوستی اور مطلب پرست دوستی پر کھل کر بحث
ہے۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۳۰۱ھ میں قسطنطنیہ سے شائع ہوئی ہے۔ جہاں یہ کتا
بہت ساری خوبیوں کی حامل ہے وہاں ایک نقص بھی ہے۔ وہ یہ کہ یہ کتاب
نظم و ترتیب سے محروم ہے۔ اس کتاب میں ان اسباب و علل کی طرف تفصی
سے اشارہ کیا گیا ہے جن سے مودت و اخوت کی جڑیں کٹتی ہیں اس طرح ا
اسباب کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن سے محبت و دوستی کا پودا پروان چڑھتا

اس کتاب کا مخطوطہ "آستانہ" کے مکتبہ "یا صوفیا" میں غیر ضروری
کتابوں کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ ایک طویل عرصے تک کسی مستشرق نے اس کی
کوئی توجہ نہ دی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر محمد بن تاویت الطنجی جامعہ عربیہ کی جان
سے "آستانہ" کچھ قیمتی کتابوں کی تصویریں لینے گئے۔ وہاں انھوں نے
کتاب دیکھی اور اس کی تصویر لے لی۔ پھر قاہرہ واپس آنے کے بعد اس کتاب
مطالعہ کیا۔ پھر اس کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ اس کتاب سے ابوح
توحیدی اور مسکویہ کی زندگیوں کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی تھی۔ چنانچہ پہلی
بار یہ کتاب ڈاکٹر احمد امین اور احمد الصقر کے حواشی و تعلیقات کے ساتھ ۱۹۵
میں قاہرہ سے شائع ہوئی۔

الہوامل والشوامل: یہ کتاب دراصل دو جلیل القدر مؤلفوں کی
معرکۃ الآراء تصنیف ہے۔ ابوحیان توحیدی
سوالات ہیں جن کو "الہوامل" کا نام دیا گیا ہے۔ ابن مسکویہ کے جوابات ہی

...ن کو "الشوامل" کیا گیا ہے۔ "الھوامل" اس نوجوان اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا
...مالک اسے ہر طرح کے بندھن سے آزاد کر کے چرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔
..."الشوامل" ان جانوروں کو کہتے ہیں جو ان آزاد نوجوان اونٹنیوں کو ایک جگہ اکٹھا
...رنے کا کام انجام دیتے ہیں۔ چونکہ ابو حیان کے سوالات کسی خاص موضوع یا
...سئلے سے متعلق نہ تھے بلکہ بالکل آزاد تھے اس لیے اس نے ان سوالوں کو "الھوامل"
...سے کنایہ کیا ہے اور مسکویہ نے چونکہ ان سوالات کے جواب دیے ہیں اور ان جوابوں
... "الشوامل" سے کنایہ کیا ہے۔

اس کتاب سے ابو حیان توحیدی کی فلسفیانہ شخصیت ابھر کر سامنے آتی
ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس کے اعلیٰ ادبی مقام پر بھی روشنی پڑتی ہے اس نے
...بی و ادبی، طبعی و ماورائی، اجتماعی و معاشرتی، اقتصادی و معاشرتی، فکری و
...اسی، فطری و نفسیاتی اور علم کلام، فلسفہ، منطق و تصوف سے متعلق بیشتر سوالات
...ٹھائے ہیں۔ اس نے اپنے سوالات کے ذریعہ ہر بڑے سے بڑا اور معمولی سے معمولی مسئلے
...احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان سوالات کی تعداد کئی سو ہیں۔ اس کے بعد مسکویہ
...، نہایت شرح و بسط کے ساتھ اس کے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے
...ن کے سوالات کا اسلوب مسکویہ کے مقابلہ میں زیادہ ادبی، فنی اور انشائی ہے مسکویہ
... عبارتوں میں فلسفیانہ غموض، ابہام اور اخفا ہے جب کہ ابو حیان کے سوالات
... وضاحت، ادبیت اور سلاست کا عنصر غالب ہے۔ اس نے ان سوالات میں
...ی محرومیوں اور ناکامیوں اور دنیا و اہلِ دنیا سے متعلق اپنی شکایتوں کا تذکرہ بھی
ہے۔ ان سوالات سے ابو حیان توحیدی کی ہمہ گیر شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ
...سفیوں کے ساتھ عظیم فلسفی، متکلمین کے ساتھ ماہر متکلم، لغویوں کے ساتھ بلند پایہ
...ہر لسانیات اور صوفیا کے ساتھ شیخ طریقت نظر آتا ہے۔

البصائر والذخائر: یہ کتاب ابوحیان توحیدی کی زندگی کا حاصل مطا[illegible] اور اس کی طویل محنت ومشقت کا نتیجہ ہے۔ یاقو[illegible] حموی کے بقول "البصائر والذخائر" دس جلدوں پر مشتمل تھی[58] ہر جلد کا مقدم[illegible] وخاتمہ الگ الگ تھا۔ یہ ابوحیان توحیدی کے پندرہ سالہ محنت ومشقت کا نت[illegible] ہے ۳۵۰ھ میں اس نے یہ کتاب لکھنا شروع کیا اور ۳۶۵ء میں مکمل ہوئی۔ اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ابوحیان توحیدی کے ان الفاظ سے لگایا جا[illegible] ہے: "ثمرة العمر وزبد الایام وودیعة التجارب۔

بدقسمتی سے اب تک اس کتاب کے صرف دو ہی نسخے زیورطباعت سے آراس[illegible] ہو سکے ہیں جن کو ڈاکٹر ابراہیم گیلانی نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ اس سے قبل ڈاکٹر احمد امین اور احمد السقر ۱۹۵۳ء میں اس کی پہلی جلد قاہرہ سے شائع کر[illegible] تھے۔ اس کی بقیہ جلدوں کے مخطوطات قسطنطنیہ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے کت[illegible] خانوں میں موجود ہیں[59]

اس کتاب میں ابوحیان توحیدی نے ادبی شہ پاروں، شاعری وضرب الامث[illegible] لطائف وبذلہ سنجیاں، احادیث رسول، صوفیاء، سخاۃ اور ماہرین لسانیا[illegible] کے اقوال، قرآنی آیات کی تفسیر، اخلاقی پندونصائح، تاریخی واقعات و[illegible] حکایات وغیرہ کو جاحظ کے انداز پر جمع کر دیا ہے۔ کوئی بھی سنجیدہ بحث زیاد[illegible] طویل نہیں ہونے پاتی کہ درمیان میں کوئی مذاق کی بات یا لطیفہ پیش کر دیتا ہے تاکہ قاری اوبنے نہ پائے اور کسی طرح کی تکان محسوس نہ کرے۔

(باقی)

۱۹۵۴ء — حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ العلم والعلماء۔ اسلام کا نظام عفت و عصمت۔
تاریخ صقلیہ۔ تاریخ ملت جلد نہم

۱۹۵۵ء — اسلام کا زرعی نظام، تاریخ ادبیات ایران، تاریخ علم فقہ، تاریخ ملت حصہ دہم سلاطین ہند مغل
تذکرہ علامہ محمد بن طاہر محدث پٹنی

۱۹۵۶ء — ترجمان السنۃ جلد ثالث۔ اسلام کا نظام حکومت (طبع جدید دلپذیر ترتیب) جدید بین الاقوامی
سیاسی معلومات جلد دوم۔ خلفائے راشدین اور اہل بیت کرام کے باہمی تعلقات

۱۹۵۷ء — لغات القرآن جلد پنجم، صدیق اکبرؓ، تاریخ ملت حصہ یازدہم سلاطین ہند دوم، انقلاب روس، اور روس انقلاب کے بعد

۱۹۵۸ء — لغات القرآن جلد ششم، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، تاریخ گجرات، جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات جلد سوم

۱۹۵۹ء — حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط، ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، مصائب [illegible]

۱۹۶۰ء — تفسیر مظہری اردو پارہ ۲۹-۳۰۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے سرکاری خطوط
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب و اخلاق۔ عروج و زوال کا الٰہی نظام۔

۱۹۶۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد اول، مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، اسلامی کتب خانے [illegible]
تاریخ ہند پر نئی روشنی

۱۹۶۲ء — تفسیر مظہری اردو جلد دوم۔ اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں۔ معارف الآثار۔
نیل سے فرات تک۔

۱۹۶۳ء — تفسیر مظہری اردو جلد سوم۔ تاریخ ردہ۔ سرگزشت ضلع بجنور۔ علماء ہند کا شاندار ماضی اول

۱۹۶۴ء — تفسیر مظہری اردو جلد چہارم، حضرت عثمانؓ کے سرکاری خطوط، عرب و ہند عہد رسالت میں
ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں۔

۱۹۶۵ء — ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اول۔ تاریخی مقالات
لادینی دور کا تاریخی پس منظر۔ ایشیا میں آخری نوآبادیات

۱۹۶۶ء — تفسیر مظہری اردو جلد پنجم۔ [illegible]۔ خواجہ بندہ نواز کا تصوف و سلوک۔
ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں۔

۱۹۶۷ء — ترجمان السنۃ جلد چہارم، تفسیر مظہری اردو جلد ششم، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کی فقہ

۱۹۶۸ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہفتم، تین تذکرے۔ شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی مکتوبات
اسلامی ہند کی عظمت رفتہ۔

۱۹۶۹ء — تفسیر مظہری اردو جلد ہشتم، تاریخ الفخری، حیات ذاکر حسین۔ دین الٰہی اور اس کا پس منظر

۱۹۷۰ء — حیات عبدالحی، تفسیر مظہری اردو جلد نہم، مآثر و معارف، احکام شرعیہ میں حالات زمانہ کی رعایت

۱۹۷۱ء — تفسیر مظہری اردو جلد دہم، بیماری اور اس کا روحانی علاج، خلافت راشدہ اور ہندوستان

۱۹۷۲ء — فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، انتخاب الترغیب والترہیب۔ اخبار التنزیل
عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان

. No. (DN) 74 Phone : 262815 JUNE 1988
o. 965—57 Subs. 45/- Per Copy Rs. 4-00
BURHAN (Monthly)
4136 Urdu Bazar, Jama Masjid, Delhi-110006